ممتاز محقق، مفکر اور داعیٔ اسلام ڈاکٹر محمد حمید اللہ ؒ کی معروف کتاب

INTRODUCTION TO ISLAM

کا اردو ترجمہ

اسلام کیا ہے؟

مترجم: سیّد خالد جاوید مشہدی



ممتاز محقق، مفکر اور داعئ اسلام ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کی معروف کتاب

INTRODUCTION TO ISLAM

کا اردو ترجمہ

اسلام کیا ہے؟

مترجم: سیّد خالد جاوید مشہدی



بیکن بکس

• غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور فون: 042-37320030

• گلگشت کالونی، ملتان فون: 061-6520790-6520791

E-mail:info@beaconbooks.com.pk

Web: www.beaconbooks.com.pk

297.0792 محمد حمید اللہؒ، ڈاکٹر
INTRODUCTION TO ISLAM / ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ
ترجمہ: اسلام کیا ہے؟ / مترجم: سیّد خالد جاوید مشہدی
ملتان، لاہور -: بیکن بکس، 2013 ۔
ص 384
1. اسلام - تحقیق ۔

اشاعت : 2013ء

عبدالجبار نے
حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹنگ پریس لاہور
سے چھپوا کر بیکن بکس ملتان - لاہور
سے شائع کی۔

قیمت : 550/- روپے

ISBN : 978 - 969 - 534 - 204 - 6

فہرست

باب نمبر 1

پیغمبر اسلام

باب نمبر 2

اسلام کی حقیقی تعلیمات کا تحفظ

باب نمبر 3

اسلام کا نظریۂ زندگی

باب نمبر 4

عقیدہ اور ایمان

باب نمبر 5

اسلامی زندگی اور عبادات

باب نمبر 6

اسلام اور روحانیت

باب نمبر 7

اسلام کا نظامِ اخلاقیات

باب نمبر 8

اسلام کا سیاسی نظام

باب نمبر 9

اسلام کا عدالتی نظام

باب نمبر 10

اسلام کا معاشی نظام

باب نمبر 11

مسلمان عورت

باب نمبر 12

اسلام میں غیر مسلموں کی حیثیت

باب نمبر 13

علوم وفنون کی ترقی کیلئے مسلمانوں کی خدمات

باب 14

اسلام کی عمومی تاریخ

باب نمبر 15

مسلمان کی روزمرہ زندگی

مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کا موضوع ''اسلام کا بین الاقوامی قانون'' رہا اور ان کی دعوت کا دائرہ غیر مسلموں کے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کو محیط تھا۔ ان کی جدوجہد کے میدان کی اسی وسعت وہمہ گیریت نے ان کی تحریر وتقریر کو کئی ساری ذیلی وفروعی بندشوں سے آزاد بنادیا تھا۔

جب بات کرتے تو ان کا مطمع نظر کسی حنفی، شافعی، مالکی یا حنبلی کے نقطۂ نظر کی تائید وتردید نہ ہوتا بلکہ ان کا ہدف اسلام کے منکر ومخالف افراد کو دینِ حق کی طرف راغب کرنا ہوتا۔ ان کی ہر تقریر کو ہمارے ملک کے کسی محلے وقصبہ کی مسجد کے خطیب یا خاص طبقہ کے راہنما کی گفتگو کے ترازو میں نہیں تولا جاسکتا کیونکہ مقامی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر کام کرنے والے لیڈروں میں سے ہر ایک کے الفاظ کی جامعیت کی وسعتیں اور تقاضے مختلف ہوا کرتے ہیں۔

قرآن کریم پوری انسانیت کی کتاب ہے۔ اس کی دعوت ہر رنگ ونسل کے ہر فرد کو ہے اس لئے اس کی وسعت سب وسعتوں کو محیط اور سب جامعیتوں کی جامع ہے۔ کوئی تنگی وتنگ نظری اس کتابِ انسانیت سے میل نہیں کھاسکتی۔

چنانچہ امتِ محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مجدّدین اور داعیانِ اسلام کا اسلوب یہی رہا ہے۔ آپ ان صوفیائے کرام کے کردار کو دیکھیں جنہوں نے غیر مسلم معاشروں میں اسلام کی اشاعت کا کام کیا، ان مفکرین کا لٹریچر پڑھیں جنہوں نے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی راہیں بتائیں، اور اس دور کے ان نمائندگانِ اسلام کو سنیں جو کسی بھی بین الاقوامی مقام پر اسلام کو متعارف کرواسکتے ہیں۔ یہ لوگ دین کی شاہراہِ مستقیم اور فارانِ پرشکوہ کی بلندی سے آواز دیا کرتے ہیں، فرقہ بندیوں کی آلائشوں اور فروعی مسائل کی پگڈنڈیوں کے داعی نہیں ہوتے۔

حضرت الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابیں پڑھیں، مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کا مطالعہ کریں، ڈاکٹر ذاکر نائیک کی گفتگو سنیں تو آپ اپنے اعتقاد وافکار کو پھلتا پھولتا اور وسعتوں کو سمیٹتا ہوا پائیں گے۔ یہی معاملہ ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے۔

آپ اس کتاب میں کئی باتیں ایسی پائیں گے جو کسی فروعی مسئلہ میں آپ کے نقطۂ نظر سے مختلف یا کسی خاص گروہ کی ترجیحات سے متصادم یا لوگوں کی عمومی معلومات ومذعومات کے برعکس ہوں گی لیکن کسی تحقیق پسند مسلمان کو اس صورتِ حال سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ یہ سب کچھ اس دعوتِ عامہ اور تحقیقِ حق کا تقاضا ہے جس کو ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ دینِ اسلام میں بڑی وسعت ولچک ہے۔ اس وسیع المشربی سے کسی کے دین واعتقاد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

اگر کسی جزوی مسئلہ کے بارے میں کوئی الجھن پیش آئے تو کسی صاحبِ علم سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

اس کتاب کی اشاعت کا مقصد اس حکمت وموعظتِ حسنہ کا شعور اجاگر کرنا ہے جو ہر مومن کی گم کردہ متاع ہے۔ پڑھیے اور اپنے ایمان واعتقاد کو جلا بخشیے۔

والسلام
زاہد محمود قاسمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف

یہ امر انتہائی حوصلہ افزا ہے کہ اسلامک کلچرل سنٹر پیرس کی اس عاجزانہ کاوش کو غیر معمولی پذیرائی مل رہی ہے، نہ صرف یہ کہ ہم نے اب تک جو تین انگریزی ایڈیشن شائع کئے تھے ہاتھوں ہاتھ خرید لئے گئے بلکہ تین مختلف ممالک میں کثیر تعداد میں شائع ہونے والے چار سے پانچ ایڈیشن بھی بک گئے ہیں۔ مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اور متعدد زبانوں میں اس کی اشاعت منظر عام پر آ چکی ہے اور بعض مالی وسائل کی کم یابی کی بناء پر تشنۂ اشاعت ہیں جبکہ بعض تکمیل کے آخری مراحل میں ہیں۔ الحمدللہ۔

یہ بات ہمارے لئے ایک اعزاز سے کم نہیں کہ بعض ممالک میں اس کتاب کو نصاب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ نئے ایڈیشن میں متن پر کچھ نظر ثانی کے ساتھ ساتھ کچھ اضافے کئے گئے ہیں اور کچھ اغلاط کی اصلاح بھی کر دی گئی ہے اور ہم اس کو مزید بہتر بنانے کے لئے تجاویز اور تنقید کا خیر مقدم کریں گے جو قارئین اس کا باریک بینی سے مطالعہ کر کے ہمیں مفید مشوروں سے نوازیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اجر انہیں ضرور ملے گا۔

محمد حمید اللہ

برائے ایڈیٹوریل بورڈ

اسلامک کلچرل سنٹر

پیرس۔ فرانس

باب نمبر 1

پیغمبر اسلام

سیرتِ طیبہ:

(1) انسانی تاریخ میں ایسی شخصیات کی کمی نہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں اپنی قوموں کی سماجی اور مذہبی اصلاح کے لئے وقف کر دیں۔ ایسے افراد ہر دور اور ہر ملک میں موجود رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں ویدوں کے تخلیق کار تھے وہاں عظیم گوتم بدھ بھی تھا۔ چین میں اس شخصیت کا نام کنفیوشس جب کہ ایران میں اویستا تھا۔ سرزمین بابل کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو جنم دیا جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین مصلحین میں ہوتا ہے(آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کے پیغمبر اور مصلح ادریس اور نوح علیہم السلام کا تو ذکر ہی کیا جن کے بارے میں ہماری معلومات بہت محدود ہیں) اہل یہود اپنے پیغمبروں اور مصلحوں کی ایک طویل لڑی پر بجا طور پر نازاں ہیں ان میں موسیٰ، سیموئل، داؤد، سلیمان اور عیسیٰ علیہم السلام کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

(2) دو نکات قابلِ غور ہیں: پہلا یہ کہ ان مصلحین نے عام طور پر خود یہ دعویٰ کیا کہ وہ پیغام الٰہی لے کر آئے ہیں اور انہوں نے اپنی قوموں کی رہنمائی کے لئے مقدس کتابیں بھی چھوڑیں اور یہ کہ ان مصلحین کے بعد ان کی قوموں میں جنگ وجدل کا بازار گرم ہو گیا اور نسل کشی کی انتہا تک پہنچ جانے والی لڑائیوں کے ایک طویل سلسلے کے دوران اللہ تعالیٰ کے پیغام پر مبنی یہ کتابیں اور صحائف مکمل طور پر ضائع ہو گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کو لے لیں اب ہم ان کو صرف نام کی حد تک جانتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام پر اترنے والی تورات کے بارے میں بھی تاریخ کی کہانی یہی ہے کہ اس کا بیشتر حصہ تباہ اور مسخ ہو گیا جب کہ یہ صرف جزوی طور پر محفوظ رہ سکی۔

تصور خدا:

(3) بنی نوع انسان کے قدیم رسوم و روایات کا اگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ انسان ہمیشہ سے ایک عظیم ترین ہستی کے وجود سے آگاہ رہا ہے، جس کے متعلق وہ قائل تھا کہ وہ ہستی اس کائنات کی ہر چیز کی مالک اور خالق ہے۔ تاریخ نے ایسے شواہد چھوڑے ہیں کہ چاہے طریقے اور اعمال مختلف ہوں مگر ہر زمانے کے لوگوں نے قادر مطلق خدا کی اطاعت کا راستہ بہرحال اختیار کیا۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ ہر جگہ موجود مگر نادیدہ خدا سے رابطہ نیک اور سعید روحوں کے حامل چند برگزیدہ بندوں کے توسط سے ہی ممکن ہے۔ چاہے اس رابطہ نے الوہیت (خدا کے دیوتاؤں کی صورت میں ظہور کا ہندو تصور یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے کا مسیحی عقیدہ) کی صورت اختیار کی یا (الہام یا وحی کے ذریعے) خدا کے پیغام کی وصولی کا وسیلہ بنا۔ اس کا مقصد بنی نوع انسان کی رہنمائی تھی۔ ہاں یہ فطری بات ہے کہ اس میں بعض نظام زورِ بیان میں دوسروں سے زیادہ مؤثر اور مرعوب کن ثابت ہوئے۔

مذہب:

(3۔ الف) مابعد الطبیعاتی فکر پر مبنی ہر نظام (مذہب) اپنی الگ اصطلاحات وضع کر لیتا ہے اور وقت کے ساتھ یہ اصطلاحات پختگی اور اہمیت اختیار کر جاتی ہیں جبکہ اصطلاح پر مبنی لفظ کے (ظاہری) معانی اس کی اصل ماہیت کو ظاہر کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور ان کے تراجم ان الفاظ کی روح کے مطابق حقائق بیان نہیں کر پاتے جبکہ ایک مکتب فکر کے خیالات دوسرے تک پہنچانے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں۔ غیر مسلم قارئین سے التماس ہے کہ وہ مطالعہ کے دوران اس ناگزیر مجبوری کو پیش نظر رکھیں۔

(4) چھٹی صدی عیسوی کے اواخر تک انسان نے زندگی کے مختلف شعبوں میں زبردست پیش رفت کر لی تھی اور اس وقت بعض مذاہب اعلانیہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وہ بعض نسلوں اور انسانوں کے کچھ خاص طبقات کے لئے مخصوص ہیں، ان کے پاس تمام بنی نوع انسان کے مسائل کا کوئی علاج نہ تھا۔ عالمگیریت کے دعویدار جو چند مذہب تھے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ انسان کی نجات ترک دنیا میں مضمر ہے۔ یہ مذاہب اشرافیہ کے لئے مخصوص تھے اور ان کا دائرہ عمل انتہائی کم لوگوں

تک محدود تھا جب کہ ایسے خطوں کا تو ذکر ہی کیا، جہاں سرے سے کسی مذہب کا وجود ہی نہ تھا، جہاں شرک والحاد اور مادیت پرستی کو ہی سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل تھی۔ جہاں ہر شخص مرضی کا مالک تھا جسے دوسرے کے حق کی پرواہ تھی نہ اس کی پامالی پر کوئی پچھتاوا۔

سرزمین عرب:

(5) زمینی نصف کُرے کے بڑے حصے (خشکی اور سمندر کے تناسب کے حوالے سے) کے نقشے کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جزیرہ نما عرب تین عظیم براعظموں ایشیاء، افریقہ اور یورپ کے نقطہ اتصال پر واقع ہے اور جس دور کا ہم ذکر کرنے جا رہے ہیں اس میں برصغیر عرب کا وسیع علاقہ صحرائی خطوں پر مشتمل تھا جہاں انسانی آبادیاں شہروں کی شکل میں بھی تھیں اور خانہ بدوش بھی اس کی وسعتوں میں مہم جوئیاں کرتے پھرتے تھے۔ اکثر یہ بھی تھا کہ ایک ہی قبیلے کے لوگ شہری آبادیوں اور خانہ بدوش بستیوں میں تقسیم تھے اور مختلف رہن سہن کے باوجود ان کے مابین تعلق قائم رہتا تھا۔ عرب میں وسائل رزق بہت محدود تھے۔ صحرائی زندگی میں تجارتی قافلوں کو زراعت یا صنعت وحرفت پر بہرحال برتری حاصل تھی۔ سفر اور مسافتیں ان لوگوں کی زندگی کا حصہ تھیں اور عربوں کے تجارتی کارواں صحرا کی وسعتوں کو پھلانگتے ہوئے شام، مصر، حبشہ، عراق، سندھ، ہندوستان اور دوسرے علاقوں تک آتے جاتے تھے۔

(6) ہمیں وسطی عرب کے لہیانیوں Lihyanites کے بارے میں تو زیادہ معلومات نہیں تاہم عظیم سرزمین یمن جو کبھی سبا اور مائن کی پھل پھولتی تہذیبوں کا گہوارہ تھی جب ابھی شہر روم کی بنیادیں بھی نہیں رکھی گئی تھیں اور جنہوں نے بازنطینیوں اور ایرانیوں سے ان کے کئی علاقے چھین لئے تھے، اب بہرحال دورِ زوال سے گزرتے ہوئے ان گنت چھوٹی بڑی خودمختار سرداریوں میں بٹ چلی تھی بلکہ اس کے بعض علاقے غیر ملکی آوروں کے قبضے میں بھی تھے۔ ایران کے ساسانیوں نے جو کہ یمن کے اندر تک گھس چکے تھے مشرقی عرب پر قبضہ کرلیا تھا اور دارالحکومت مدائن سیاسی اور سماجی انتشار کی زد میں تھا اور اس صورت حال کے اثرات اس کے تمام علاقوں میں پڑ رہے تھے۔ شمالی عرب بازنطینی اثرات کے سامنے سرنگوں تھا اور دیگر اندرونی مسائل بھی درپیش تھے۔ صرف وسطی عرب ایک ایسا خطہ تھا جو بیرونی قبضہ کے اثرات سے محفوظ تھا۔

(7) وسطی عرب کے اس محدود خطہ میں مکہ، طائف، مدینہ کی ''تکون'' کا وجود ایک خدائی انتظام معلوم ہوتا ہے۔ مکہ ایک بے آب و گیاہ وادی ہے۔ (وادی غیر ذی زرع) جو افریقہ اور صحارا کے جہنم زار کا منظر پیش کرتا ہے اور اس سے بمشکل 50 میل دور طائف یورپ کے حسین قدرتی مناظر کو شرماتا ہے، جبکہ شمال میں واقع مدینہ زمین کی زرخیزی میں شام جیسے ملکوں کے ہم پلہ شمار ہوتا ہے۔ اگر آب و ہوا کے انسانی کردار پر اثرات مرتب ہوتے ہیں تو بڑے نصف کُرے کے وسط میں واقع اس تکون کو پوری دنیا کا ''نقش اصغر'' یا ''چھوٹا نمونہ'' کہا جا سکتا ہے اور یہ صورت دنیا کے کسی اور خطے میں موجود نہیں۔ اور یہی خطہ ہے جہاں بابل کے باشندے ابراہیم (علیہ السلام) اور مصر کی ہاجرہ (علیہا السلام) کی نسل سے ایک بچے نے جنم لیا جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تھا جسے بعد ازاں رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہونے کا اعزاز بخشا جانے والا تھا، جس کا پیدائشی تعلق تو مکہ سے تھا تاہم طائف اور مدینہ بھی اس کی زندگی کے جزو لاینفک ہیں۔

مذہب کی صورتحال:

(8) مذہبی نقطہ نظر سے سرزمین عرب میں بت پرستی کا دور دورہ تھا چند ہی تھے جو مسیحیت یا مجوسیت (آتش پرستی) جیسے مذاہب پر عمل پیرا تھے۔ اہل مکہ خدائے واحد کے تصور پر یقین رکھتے تھے مگر ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ بت اللہ کے ہاں ان کی سفارش اور شفاعت کی قدرت رکھتے ہیں مگر حیرت انگیز طور پر وہ حیات بعد الموت اور آخرت پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ حج بیت اللہ کی حیثیت محض ایک رسم کی رہ گئی تھی، تاہم ان کا ایمان تھا کہ اسے ابراہیم (علیہ السلام) نے اللہ کے حکم پر رائج کیا تھا مگر دو ہزار سال کے طویل عرصہ میں حج کی حقیقی روح مسخ ہو چکی تھی اور یہ ایک تجارتی میلے اور بے روح بت پرستی کا مظہر بن کر رہ گیا تھا اور بجائے اس کے کہ یہ عظیم تہوار اچھائی کا موجب ہو یہ ان کے سماجی اور روحانی رویے کی بربادی کا باعث بن رہا تھا۔

معاشرہ:

(9) قدرتی وسائل کے فقدان کے باوجود مکہ اس تکون کے دوسرے حصوں یعنی مدینہ اور طائف میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ان میں سے صرف مکہ میں ایک شہری ریاست قائم تھی

جس کا انتظام پشت در پشت سے رائج قبائل کے سرداروں پر مشتمل ایک کونسل کے سپرد تھا جن کے اختیارات کی تقسیم بالکل واضح تھی۔[1]

اہل مکہ کو تجارتی قافلوں کی قیادت کا بھی اعزاز حاصل تھا اور انہوں نے ہمسایہ ریاستوں یعنی ایران، شام اور حبشہ سے خصوصی تجارتی مراعات حاصل کر رکھی تھیں اور تجارتی قافلوں کے راستے میں آباد قبائل سے بھی ان کے معاہدے تھے جن کے باعث ان کے تجارتی قافلے بے خطر دوسرے ممالک میں آتے جاتے اور درآمد برآمد کا ایک باضابطہ سلسلہ قائم تھا۔ وہ دوسرے ممالک سے آنے والوں کو اپنے اور حلیف عرب قبائل کے علاقوں سے بحفاظت گزارنے کے لئے ہراول دستے بھی فراہم کرتے۔ (مہبر۔ ابن حبیب) تحریری ریکارڈ رکھنے یا اپنے خیالات کو محفوظ رکھنے میں چنداں دلچسپی نہ ہونے کے باوجود اہل عرب فنون لطیفہ مثلاً شاعری، علمی بحث مباحثوں اور داستان گوئی کے بہت رسیا تھے۔ عورتوں کو عمومی طور پر احترام کا درجہ حاصل تھا اور وہ نہ صرف جائیداد رکھنے کا حق رکھتی تھیں بلکہ شادی کے لئے ان کی رضامندی بھی ضروری سمجھی جاتی تھی اور انہیں یہ بھی اختیار تھا کہ اگر وہ چاہیں تو شادی کی شرائط میں شوہر سے طلاق حاصل کرنے کی شق بھی شامل کرا سکتی تھیں۔ بیوگی، طلاق کی صورت میں دوسری شادی کر سکتی تھیں۔ بچیوں کو زندہ دفن کرنے کی رسم موجود تو تھی مگر عام نہیں تھی۔

پیغمبر خدا کی ولادت:

(10) اس ماحول اور حالات میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے 569ء میں جنم لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ماجد عبداللہ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سے چند ہفتے

---

[1] خارجہ تعلقات یعنی سفارت کی ذمہ داری بنوعدی کے سپرد تھی۔ بیت اللہ کی پاسبانی یعنی حجابت کا اعزاز بنو ہاشم کو حاصل تھا۔ ایسار یعنی فال گیری اور قسمت دریافت کرنے کے لئے بتوں کے پاس جو تیر رکھے جاتے تھے ان کی تولیت بنوجمح کا اختیار تھا۔ بتوں کے نذرانوں اور قربانیوں کا نظم بنوسہم کے پاس تھا۔ اشناق یعنی دیت اور جرمانوں کے نظم ونسق پر بنوتیم فائز تھے۔ عقاب یعنی قومی پرچم کی علمبرداری بنوامیہ کے سپرد تھی اور قبہ یعنی فوجی ذمہ داریاں اور شہ سواروں کی قیادت بنومخزوم کے حصے میں آئی تھی۔ اس کے علاوہ دارالندوہ تھا جسے قریش کی پارلیمینٹ کا درجہ حاصل تھا اور اس کے ذریعے تمام فیصلے صادر کئے جاتے اور ان پر عملدرآمد کیا جاتا تھا۔

قبل انتقال ہوگیا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دودھ پلانے کے لئے مکہ کے دیہی علاقے کی ایک خاتون کے سپرد کیا گیا جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کئی سال گزارے۔ تمام سیرت نگاروں کا اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچے کی حیثیت سے اپنی رضاعی والدہ کی صرف ایک چھاتی سے دودھ پیتے جبکہ دوسری اپنے رضاعی بھائی کے لئے چھوڑ دیتے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دودھ کی مدت پوری ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر واپس آ گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ماموؤں سے ملوانے اور والد کی قبر پر حاضری دینے کے لئے مدینہ لے گئیں۔ واپسی کے سفر میں حضرت آمنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا اچانک انتقال ہوگیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم والدہ کی شفقت بھری گود سے محروم ہو گئے جبکہ واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شفیق دادا کے انتقال کی صورت میں ایک اور عظیم صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ آٹھ سال کی عمر تک ان پے درپے صدمات کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چچا ابو طالب نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ ابو طالب کا دل بہت بڑا تھا مگر آپ عسرت اور تنگ دستی کی زندگی گزار رہے تھے۔

(11) ان حالات کے باعث محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو چھوٹی عمر میں ہی تلاش معاش کے لئے نکلنا پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کم سنی میں ہی ہمسایوں کے ریوڑ چرانے کے لئے جایا کرتے تھے جب کہ صرف دس برس کی عمر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچا کے ہمراہ شام کا سفر کیا جو ایک تجارتی قافلہ لے کر وہاں جا رہے تھے۔ ابو طالب کے کسی اور سفر کا تذکرہ نہیں ملتا تاہم مکہ میں ایک دکان کھولنے کے حوالے سے کچھ شواہد ملتے ہیں۔ (معارف: از ابن قتیبہ) ممکن ہے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دکان چلانے میں چچا کی مدد کرتے ہوں۔

(12) پچیس سال کی عمر تک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہر میں اپنی دیانت داری، راست گوئی اور حسن کردار کے باعث پوری طرح معروف ہو چکے تھے۔ شہر کی ایک امیر بیوہ خدیجہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) نے اپنا مال شام لے جانے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمات مناسب معاوضے پر حاصل کر لیں۔ جس میں خدیجہ کو معمول سے کئی گنا زیادہ منافع حاصل ہوا۔ اس دوران

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیگر شخصی خصوصیات سے متاثر ہو کر خدیجہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شادی کی پیشکش کی۔ اس وقت ان کی عمر 40 اور بعض دیگر روایات کے مطابق 28 برس تھی۔ (طبی حوالے سے 28 سال کی عمر زیادہ قرین قیاس نظر آتی ہے کیونکہ اس کے بعد آپ نے پانچ بچوں کو جنم دیا۔)

یہ رشتہ بہت خوشگوار ثابت ہوا۔ بعد کے کچھ برسوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حباشہ (یمن) کے میلے میں بھی شرکت کی اور احمد حنبلؒ کی روایت کے مطابق کم از کم ایک بار عبدالقیس کے ملک (بحرین، اومان) کا سفر بھی کیا اور اس امر کے پختہ شواہد موجود ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سفر دابا (اومان) کے مشہور میلے کے لئے تھا جہاں ابن الکلبی کے مطابق (بحوالہ مہبر از ابن حبیب) چین، ہند اور سندھ (ہندوستان، پاکستان) ایران، بلاد مشرق اور مغرب کے تاجر خشکی اور بحری سفر کر کے ہر سال آیا کرتے تھے۔ مکہ میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ایک کاروباری شریک کار کا بھی ذکر آتا ہے۔ اس شخص کا نام صائب تھا۔ اس کا بیان ہے: "ہم باری باری سے کام کرتے تھے، اگر وہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قافلہ لے کر جاتے تو واپسی پر اس وقت تک اپنے گھر میں داخل نہیں ہوتے تھے جب تک میرے ساتھ حساب کتاب مکمل نہ کر لیں اور اگر میں قافلہ لے کر جاتا تو واپسی پر آپ میری خیریت دریافت فرماتے اور مجھے سونپے گئے سامان تجارت کے بارے میں کبھی استفسار نہ فرماتے۔

حلف الفضول، مظلوموں کی مدد کا معاہدہ:

(13) غیر ملکی تاجر اکثر سامان لے کر مکہ آتے جاتے تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک یمنی تاجر (جس کا تعلق قبیلہ زبید سے تھا) مکہ کے کچھ لوگوں کے خلاف شعروں میں فریاد کرتا پایا گیا جنہوں نے اس کے مال کی طے شدہ قیمت دینے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ شاکی تھا کہ نہ صرف اس کا مال لوٹا گیا بلکہ کسی نے اس کی مدد بھی نہیں کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا اور قبیلہ کے سردار زبیر کو یہ فریاد سن کر سخت صدمہ پہنچا۔ انہوں نے مکہ کے اکابرین کا ایک اجلاس بلایا اور حلف الفضول کے نام سے مظلوموں کی مدد کا ایک معاہدہ کیا۔ اس معاہدہ کی ایک شق یہ تھی کہ مظلوموں کی مدد کی جائے گی چاہے ان کا تعلق مکہ سے ہو یا بیرون مکہ سے۔ نوجوان محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

اس نظام کے ایک سرگرم رکن بن گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعد میں بھی فرمایا کرتے تھے: "میں اس معاہدہ میں شامل رہا ہوں اور میں اونٹوں کے ایک گلّہ کے عوض بھی اپنا یہ عہد ترک کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ آج بھی اگر کسی نے مجھے اس وعدے کے حوالے سے پکارا تو میں اس کی مدد کے لئے لپک پڑوں گا۔"

مذہبی شعور کا آغاز:

(14) 35 برس کی عمر تک محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عبادت کے حوالے سے کیا معمولات تھے اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں سوائے اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی بتوں کی پوجا کا گناہ سرزد نہیں ہوا۔ اس بارے میں تمام سیرت نگاروں کا اتفاق ہے۔ مکہ کے کچھ اور لوگ بھی تھے جو اس بے روح مشرکانہ روایت کے کھلم کھلا خلاف تھے تاہم ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کردہ اللہ کے گھر یعنی کعبہ سے ان کی عقیدت مسلّمہ تھی۔

(15) 605ء کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ بیت اللہ کے پردوں کو آگ لگ گئی جس سے عمارت کو شدید نقصان پہنچا۔ رہی سہی کسر بعد میں ہونے والی موسلا دھار بارش نے نکال دی اور یہ عمارت منہدم ہوگئی۔ چنانچہ اس کی تعمیر نو کا فیصلہ کیا گیا۔ ہر شہری نے اپنی استطاعت کے مطابق حصہ ڈالا۔ اس میں طے یہ کیا گیا کہ بیت اللہ کی تعمیر میں صرف حلال ذریعے سے کمایا گیا مال خرچ کیا جائے گا۔ مکہ کے ہر شخص نے تعمیر میں حصہ لیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی مکہ کے دوسرے نوجوانوں کی طرح مزدوری کر رہے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھے پتھر ڈھونے سے زخمی ہوگئے۔

بیت اللہ کی دیوار میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور سے ایک مقدس پتھر "حجر اسود" مخصوص بلندی پر نصب تھا۔ اس پتھر کی سیدھ سے طواف کا آغاز کیا جاتا تھا (آج بھی حجر اسود کی سیدھ سے ہی طواف کا آغاز ہوتا ہے، مترجم) جب حجر اسود کی تنصیب کا وقت آیا تو ہر قبیلے کی خواہش تھی کہ یہ اعزاز اسے حاصل ہو جس پر اختلاف پیدا ہوگیا۔ تنازعہ شدید ہوا تو تلواریں نکل آئیں اور قریب تھا کہ بیت اللہ میں خون کی ندیاں بہہ جاتیں کہ کچھ امن پسند لوگوں نے معاملہ سلجھا دیا۔ طے یہ ہوا کہ معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جائے اور اب جو پہلا شخص بیت اللہ میں داخل ہو اس کو

ثالث تسلیم کر کے اس کا فیصلہ سب قبائل قبول کر لیں۔ حسن اتفاق سے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معمول کے مطابق تعمیر کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لئے بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عموماً الامین کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہی سب کے چہرے کھل اٹھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثالثی پر سب نے اتفاق کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک چادر زمین پر بچھائی اور حجر اسود کو اس پر رکھ دیا اور پھر قبائل کے سرداروں سے کہا کہ وہ چاروں طرف سے چادر پکڑ کر مطلوبہ بلندی تک لے جائیں، جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے پتھر اٹھا کر اس مقررہ جگہ پر نصب کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس فراست پر تمام سردار عش عش کر اُٹھے۔

(16) یہی وہ لمحہ تھا جس کے بعد محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) روحانی غور و فکر میں غرق پائے جانے لگے۔ اپنے دادا کی سنت پر عمل کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ماہ رمضان جبل نور میں واقع غار میں گزارا کرتے تھے۔ یہ غار حرا تھا جس کا مطلب ہے ''سوچ بچار کا غار'' اس جگہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عبادت کرتے۔ تنہائی میں غور و فکر کرتے اور اپنی قلیل خوراک میں وہاں سے گزرنے والے مسافروں کو بھی شریک کرتے۔

(17) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر 40 برس ہو چکی تھی اور غارِ حرا کے سالانہ اعتکاف کا یہ مسلسل پانچواں برس تھا جب رمضان المبارک کے آخری ایام میں ایک رات ایک فرشتہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے نمودار ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے نبی کے طور پر چن لیا ہے۔ فرشتہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وضو کرنے اور نماز کی ادائیگی کا طریقہ سکھایا۔ (امکان غالب یہ ہے کہ یہ مرحلہ کافی بعد میں آیا تھا۔ مترجم) اس موقع پر فرشتہ نے اللہ کا پہلا پیغام اس کے نبی تک پہنچایا:

''شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔''

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا تو پڑھتا رہ تیرا رب بڑے کرم والا ہے، جس نے قلم کے ذریعے (علم) سکھایا جس نے انسان کو وہ سکھایا جسے وہ نہیں جانتا تھا۔'' (96:1-5)

(18) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس اچانک واقعہ اور نئے تجربے سے گھبرائے ہوئے گھر پہنچے اور اپنی اہلیہ محترمہ کو پورے واقعہ کی تفصیل بتائی اور اس خدشے کا اظہار کیا کہ شائد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کسی نے جادو ٹونہ کر دیا ہے یا بھوت پریت کا سایہ ہو گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہلیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی اور کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غریبوں، یتیموں کی مدد کرتے ہیں۔ بیواؤں اور محتاجوں کی دستگیری کرتے ہیں اس لئے خدا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہر برائی سے حفاظت فرمائے گا۔

(19) اس کے بعد وحی میں ایک طویل تعطل آ گیا، جو کم وبیش تین سال پر محیط تھا۔ ابتداء میں یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے صدمہ پہنچا ہو گا، پھر مایوسی، صبر اور انتظار کے بعد وحی کی آمد کے سلسلے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر شدید خواہش پیدا ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی اور طویل وقفہ کی خبر اہل شہر تک پہنچ چکی تھی اور شر پسند آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذاق اڑاتے، حتیٰ کہ بعض تو یہاں تک کہنے لگے کہ اس کے خدا نے اسے چھوڑ دیا ہے۔

(20) انتظار کے ان برسوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپ کو عبادات اور روحانی غور وفکر کے لئے وقف کر دیا تھا۔ اور پھر آخر کار وحی کا سلسلہ بھی بحال ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یقین دلایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنہا نہیں چھوڑا گیا بلکہ خدا کی ذات ہی ہے جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچ کا راستہ دکھایا ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یتیموں اور محتاجوں کی خبر گیری کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے جو فضل کیا ہے اس کا اظہار کریں۔ (11-3:93)

یہ دراصل تبلیغ کا حکم تھا۔ ایک اور آیت نازل ہوئی جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت کی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کو برے اعمال کے خلاف خبردار کر دیں اور انہیں خدائے واحد کو معبود بنانے کی تلقین کریں اور کہیں کہ ہر وہ چیز ترک کر دیں جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا موجب ہو۔ (7-2:74)

اسی دوران ایک اور آیت اتری جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی خبردار کر دیں۔ (بداعمالیوں کے خلاف) (214:26) اللہ نے فرمایا:

''پس آپ اس حکم کو جو آپ کو کہا جا رہا ہے کھول کر سنا دیجئے اور مشرکوں سے منہ پھیر لیجئے۔''

''آپ سے جو لوگ مسخرا پن کرتے ہیں ان کی سزا کے لئے ہم کافی ہیں۔'' (95-91:15)

ابن اسحاق کی ایک روایت ہے کہ آپ پر پہلی وحی نیند کے عالم میں آئی تھی تاکہ اس کی شدت کو کم کیا جا سکے تاہم بعد میں آپ کی مکمل بیداری کے دوران وحی آتی رہی۔

کام کا آغاز:

(21) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کام کا آغاز خفیہ طور پر کیا اور سب سے پہلے اپنے قریبی دوستوں، رشتہ داروں کو تبلیغ کی اور بعد میں پھر شہر کے اندر اور مضافات میں عام لوگوں کو بھی اللہ کا پیغام پہنچانا شروع کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں سے ایک خدا، روز قیامت اور آخرت پر ایمان لانے کا مطالبہ فرماتے اور لوگوں کو غریبوں اور محتاجوں کی مدد کی تلقین کرتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی کے ذریعے نازل ہونے والے قرآن کو نہ صرف تحریری شکل میں محفوظ کرنے کا اہتمام کیا بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو اسے حفظ کرنے کا بھی حکم دیا اور یہ سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری حیات طیبہ میں جاری رہا کیونکہ قرآن کا نزول ایک ہی بار نہیں ہوا بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے 23 برس تک نازل ہوتا رہا۔

(22) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والوں کی تعداد بتدریج بڑھتی چلی گئی لیکن جوں جوں مشرکانہ عقائد کے خلاف کامیابی کا دائرہ وسیع ہوتا گیا، ان لوگوں کی طرف سے اہل اسلام کی مخالفت بھی اسی شدت سے بڑھتی گئی جو اپنے باپ دادا کے دین کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے۔ حتیٰ کہ کفار مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں کو جسمانی تکالیف پہنچانے سے بھی باز نہ آتے۔ مظالم کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ماننے والوں کو شدید گرمی میں ننگے بدن تپتی ریت پر لٹایا جاتا۔ ان کے جسم گرم لوہے سے داغے جاتے اور ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ کر ڈال دیا جاتا۔ بعض سختیوں کی تاب نہ لا کر موت سے ہمکنار ہو گئے مگر انہوں نے اللہ کے دین کو نہ چھوڑا۔ جب ظلم اور زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے پیروکاروں کو مکہ چھوڑ کر حبشہ (ابے سینیا۔

آج کا اریٹیریا) ہجرت کر جانے کی ہدایت کی کہ ''وہ ایسا ملک ہے جہاں ایک عادل شخص حکمران ہے اور جس کی سلطنت میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔'' (ابن ہشام) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کئی درجن مرد اور عورتیں حبشہ چلے گئے۔ ان لوگوں کے بچ نکلنے پر کفار کا غیض وغضب عروج پر پہنچ گیا اور پیچھے رہ جانے والوں پر تعزیر و تعذیب کا سلسلہ مزید دراز ہو گیا۔

(23) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دین کا نام اسلام رکھا جس کا مطلب ہے اپنے آپ کو اللہ کی رضا کے سامنے جھکا دینا۔ اس کی دو نمایاں خصوصیات ہیں:

(i) دین اور دنیا (روحانی اور جسمانی معاملات) میں توازن۔ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں سے مکمل حظ اٹھانے کی اجازت (قرآن 32:7) اور اس کے ساتھ ساتھ ہر فرد پر اللہ کی طرف سے جو فرائض عائد کئے گئے ہیں ان کی مکمل ادائیگی مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور دوسرے ارکان اسلام۔ اسلام کو تمام لوگوں کا دین قرار دیا گیا نہ کہ خاص افراد کا۔

(ii) اسلام میں کسی قسم کی اونچ نیچ نہیں۔ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں اور تمام برابر ہیں۔ نسل، طبقہ یا زبان کی بناء پر کسی کو کوئی برتری حاصل ہے نہ امتیاز۔ برتری صرف اس بنیاد پر ہے کہ کون زیادہ پرہیزگار یعنی کون زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہے۔ (قرآن 13:49)

سماجی مقاطعہ:

(24) جب بڑی تعداد میں مسلمان حبشہ (ایبے سینیا) ہجرت کر گئے تو مشرکین مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبیلے سے مطالبہ کیا کہ وہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنا تعلق ختم کر دیں اور انہیں باغی قرار دے کر ان کے حوالے کر دیں تا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سزا دے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام تمام کر دیں۔ تاہم بنو ہاشم قبیلہ کے تمام افراد نے چاہے وہ مسلمان تھے یا غیر مسلم مشرکین کا یہ مطالبہ مسترد کر دیا۔ (ابن ہشام) جس پر کفار مکہ نے بنو ہاشم کے مکمل سماجی مقاطعہ کا فیصلہ کیا۔ جس کے تحت اہل شہر کو پابند کر دیا گیا کہ وہ بنو ہاشم سے کلام کریں گے نہ ہی کسی قسم کا کوئی لین دین کریں گے۔ ہر قسم کے رشتے ناطے کرنے کی بھی ممانعت کر دی گئی اس بائیکاٹ میں مکہ کے مضافات میں آباد قریش مکہ کے حلیف قبائل بھی جو احابیش کہلاتے تھے

شامل ہوگئے۔ بائیکاٹ کے متاثرین میں بچے، عورتیں، ناتواں بوڑھے، بیمار سب ہی شامل تھے۔ سختیوں کی تاب نہ لاکر بعض نے جان دے دی تاہم کوئی بھی شخص محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کافروں کے حوالے کرنے پر تیار نہ ہوا، صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا ابولہب نے خاندان سے بغاوت کی اور بائیکاٹ کرنے والوں کا ساتھ دیا۔

بائیکاٹ اور مظالم کے اس سلسلے کو جب تین سال گزر گئے، جس کے دوران محصورین کو درختوں کے پتے اور چمڑا بھی اُبال کر کھانا پڑا، اہل مکہ میں سے کچھ نسبتاً نرم دل لوگوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی اور غیر منصفانہ پابندیاں ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اسی دوران ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی کہ بائیکاٹ کے لئے مشرکین نے جو معاہدہ تحریر کیا تھا اور جو بیت اللہ میں لٹکایا گیا تھا اسے دیمک نے کھا لیا ہے۔ جب دیکھا گیا تو یہ بات درست نکلی۔ معاہدہ پر اللہ اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بابرکت ناموں کے سوا سب کچھ دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ اس پر بائیکاٹ کے حامی تنہا رہ گئے اور مقاطعہ کی پابندیاں ختم کرنا پڑیں اور بنو ہاشم تین سال کی محصوری سے آزاد ہو گئے، تاہم سختیوں کی طوالت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غمگسار اہلیہ حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور آپ کے چچا ابوطالب کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا اور وہ اس کے بعد جلد ہی یکے بعد دیگرے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو داغِ مفارقت دے گئے جس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشرک چچا ابولہب قبیلے کا سردار بننے میں کامیاب ہو گیا۔ (سیرت، ابن ہشام)

معراج:

(25) یہی ایام تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج کا اعزاز عطا ہوا۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم بالا میں اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے ہم مجلس ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آسمانوں پر بہت سے عجائبات اور اسرار کا مشاہدہ کرایا گیا۔ واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی امت کے لئے نماز کا تحفہ لے کر آئے جو بندے اور خدا کے درمیان یک گونہ براہ راست رابطے کا ایک وسیلہ ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلمان جب نماز ادا کرتے ہیں تو اس کے آخری حصے میں (التحیات کے دوران) جو کلمات ادا کئے جاتے ہیں وہ وہی ہیں جو ہم کلامی کے وقت اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین ادا کئے

گئے تھے اور یہ ان کلمات سے علامتی طور پر مسلمانوں کی اللہ کے سامنے حضوری کا اظہار ہوتا ہے۔ کلمات یہ ہیں:

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوٰاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصّٰلِحِیْنَ

''تمام قولی عبادتیں اور تمام فعلی عبادتیں اور تمام مالی عبادتیں اللہ کے لئے ہی ہیں۔ سلام ہو تم پر اے نبی اور اللہ کی رحمتیں اور اس کی برکتیں ہوں، سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔''

کمیونین (Communion) کی مسیحی اصطلاح خدائی میں شرکت کے معانی دیتی ہے اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آسمانوں پر تشریف آوری اور اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی کے شرف کے اظہار کے لئے مسلمان معراج کا لفظ استعمال کرتے ہیں جس میں خدائے بزرگ و برتر کی ذات جلالت مآب اپنی جگہ برقرار رہتی ہے اور انسان اپنی حیثیت پر قائم رہتا ہے اور دونوں کے باہمی تعلق میں کوئی الجھن پیدا نہیں ہوتی۔

(26) عالم بالا کی اس ملاقات کی خبر نے مشرکین مکہ کے مظالم میں اضافہ کر دیا۔ مجبوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا آبائی شہر چھوڑ کر کسی دوسری جگہ پناہ لینے کی کوشش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف تشریف لے گئے جہاں آپ کے ماموں مقیم تھے مگر وہاں کے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بدسلوکی کی اور بدقماش لڑکوں کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے لگا دیا جنھوں نے پتھر مار مار کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زخمی کر دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واپس مکہ آنا پڑا۔

ہجرتِ مدینہ:

حج بیت اللہ کے لئے ہر سال پورے عرب سے لوگ مکہ آیا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوشش کی کہ کوئی قبیلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پناہ دے دے (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تحفظ کی ذمہ داری قبول کر لے) تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کا پیغام

پھیلانے کا کام جاری رکھ سکیں۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کوشش کے دوران پندرہ قبائل کے وفود سے رابطہ کیا مگر سب نے سختی سے انکار کر دیا۔اسی دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ملاقات مدینہ کے چھ افراد سے ہوئی۔جو یہودیوں اور مسیحیوں کے ہمسایہ ہونے کی وجہ سے اللہ کے رسولوں اور کتابوں کے بارے میں علم رکھتے تھے۔اور انہوں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ اہل کتاب ایک ''پیغمبر موعود'' آخری فارقلیط مسیحا کی آمد کے منتظر بھی ہیں اس لئے ان چھ نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ نیک کام میں سبقت حاصل کی جائے چنانچہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور وعدہ کیا کہ اگلے سال وہ مزید لوگوں کو ساتھ لائیں گے اور ہر قسم کی مدد بھی بہم پہنچائیں گے۔اگلے سال مدینہ کے بارہ کے لگ بھگ مزید خوش نصیب دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استدعا کی کہ ان کے ساتھ ایک معلم کو بھیجا جائے جو انہیں نیا دین سکھائے اور تبلیغ کرے وہ معلم مصعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے ان کی کوششیں توقع سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئیں اور وہ حج کے موقع پر مدینہ کے 73 مرد اور عورتوں کو لے کر مکہ آئے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفاداری کا عہد کیا۔ان مدنی مسلمانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعوت دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مکی ساتھیوں کے ہمراہ مدینہ تشریف لے آئیں جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہ صرف مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا بلکہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کو اپنے بھائی اور بہنیں تصور کریں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آزادی کے ساتھ اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچائیں۔چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد خفیہ طور پر چھوٹے چھوٹے گروپوں میں مدینہ ہجرت کر گئی۔اس پر کفار مکہ طیش میں آ گئے۔انہوں نے نہ صرف مہاجرین کی املاک ضبط کر لیں بلکہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان لینے کا منصوبہ بنا لیا۔چنانچہ اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گھر پر ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک طرف مشرکین مکہ کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دشمنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی مگر دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیانت پر اس قدر اعتماد تھا کہ اپنی تمام امانتیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس رکھواتے تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ تمام امانتیں اپنے چچازاد بھائی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کر دیں کہ ان کے

مالکوں کو لوٹا دیں اور خود اپنے وفادار دوست ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہمراہ خفیہ طور پر گھر سے روانہ ہو گئے اور خطرات سے بچتے ایک طویل سفر طے کر کے بالآخر بحفاظت مدینہ پہنچ گئے۔ یہ 622ء کا واقعہ ہے جو اسلامی ہجری کیلنڈر کے آغاز کا سال ہے۔

اُمہ کی تنظیم نو:

(28) اجڑ کر آنے والے مہاجرین کی بہتر آبادکاری اور بحالی کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوشحال انصار (مدنی مسلمان) اور مہاجرین کے درمیان رشتۂ مواخات یا بھائی چارہ قائم کر دیا۔ مواخات کے رشتے میں منسلک ہر دو خاندان مل جل کر روزی کماتے اور کاروبار زندگی میں ایک دوسرے کے ساتھ امداد کرتے تھے۔

(29) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیال میں انسانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ہے کہ مذہب اور سیاست میں اشتراک ہو جائے۔ اس مقصد کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے مسلمان اور غیر مسلم نمائندوں کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں مقامی عرب، یہودی، مسیحی اور دیگر تمام شامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجویز پیش کی کہ مدینہ میں ایک باقاعدہ ریاست کی داغ بیل ڈالی جائے۔ شرکاء کی رضامندی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نئی مجوزہ ریاست کا تحریری آئین تیار کرایا۔ جو تاریخ عالم میں اپنی نوعیت کی پہلی ایسی دستاویز ہے جس میں شہریوں اور سربراہ ریاست کے حقوق اور فرائض کا واضح طور پر تعین کر دیا گیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متفقہ طور پر اس ریاست کا سربراہ قرار دیا گیا جس کے بعد اپنے طور پر انصاف حاصل کرنے کا پرانا رواج ختم کر دیا گیا اور انصاف کی فراہمی اُمہ کے شہریوں کی مرکزی تنظیم یا حکومت کی ذمہ داری قرار پائی۔ آئین کی اس دستاویز میں دفاع اور خارجہ پالیسی کے اصول بھی وضع کئے گئے۔ اس میں سماجی تحفظ کے نظام کی تشکیل بھی کی گئی جس کو ''معاقل'' کا نام دیا گیا۔ اس میں یہ طے کیا گیا کہ اختلافات کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ حرف آخر ہوگا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قانون سازی کے بھی لامحدود اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس میں خصوصاً اہل یہود کے لئے مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی اور انہیں زندگی کے تمام شعبوں میں مسلمانوں کے برابر شہری حقوق کا حقدار قرار دیا گیا۔ (تفصیلی تذکرہ پیراگراف 303 پر)

(30) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر و بیشتر مدینہ کے مضافات میں آباد قبائل اور بستیوں میں جاتے تاکہ ان سے عہد وفاداری حاصل کرنے اور ایک دوسرے کی امداد پر مبنی معاہدہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قبائل کی مدد سے مشرکین مکہ پر معاشی دباؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا جنہوں نے ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی املاک پر قبضہ کرلیا تھا اور اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کو کافی زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ اس فیصلے کے تحت مکہ کے تجارتی قافلوں کے راستوں پر آباد مدنی قبائل کی مدد سے متعدد قافلے مسلمانوں نے لوٹ لئے یا انہیں راستہ بدلنے پر مجبور کردیا جس سے قریش مکہ میں شدید اشتعال پھیل گیا اور ایک خونریز جنگ ناگزیر نظر آنے لگی۔

(31) اپنی قوم کے مادی مفادات کی فکر میں روحانی پہلو کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نظر انداز نہ ہونے پائے۔ ہجرت مدینہ کو بمشکل ایک سال گزرا تھا جب روحانی نظم کا سخت ترین جزو یعنی ماہ رمضان المبارک کے روزے ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض کردیئے گئے۔

عناد اور کفر کے خلاف جدوجہد:

(32) اپنے ہم وطن مسلمانوں کو نکال کر بھی کفار مکہ کو صبر نہ آیا اور انہوں نے اہل مدینہ کو الٹی میٹم بھیجا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں کو ہمارے حوالے کیا جائے یا کم از کم انہیں مدینہ سے نکال دیا جائے لیکن یہ تمام گیدڑ بھبکیاں بے سود ثابت ہوئیں۔ اس کے چند ماہ بعد 2 ہجری میں کفار مکہ ایک بڑا لشکر لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چڑھ دوڑے جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑھ کر بدر کے مقام پر روک لیا۔ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تین گنا زیادہ تھی مگر انہیں شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔

ایک سال کی بھرپور تیاریوں کے بعد کفار مکہ ایک بار پھر مدینہ پر حملہ آور ہوئے تاکہ بدر کی شکست کا بدلہ لے سکیں۔ اس مرتبہ ان کی فوج کی تعداد مسلمانوں سے چار گنا زیادہ تھی۔ احد کے مقام پر ایک خونریز لڑائی کے بعد دشمن پیچھے ہٹ گیا اور یہ مہم بڑی حد تک بے نتیجہ رہی۔ مکی فوج میں شامل کرائے کے جنگجو اپنی زندگی کو مزید خطرے میں ڈالنے پر تیار نہ تھے۔

(33) اسی اثناء میں مدینہ کے یہودیوں نے فتنہ انگیزی شروع کردی۔ بدر کی فتح کے موقع پر یہودی سردار کعب بن الاشرف کافروں سے اظہار یکجہتی کے لئے مکہ گیا اور اس نے اہل مکہ کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑکانے کی پوری کوشش کی۔ جنگ اُحد کے بعد اس کے قبیلے نے آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان لینے کی سازش کی اور منصوبہ بنایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آبادی میں بلوا کر کسی اونچی جگہ سے چکی کا پاٹ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گرا دیا جائے۔ ان سازشوں کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدنی یہودیوں سے صرف یہ مطالبہ کیا کہ وہ علاقہ چھوڑ کر چلے جائیں اور انہیں اپنا مال ساتھ لے جانے، اپنی غیر منقولہ املاک فروخت کرنے اور مسلمانوں سے اپنے قرضے وصول کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان مہربانیوں کا الٹا اثر ہوا۔ مدینہ بدر کئے گئے یہودیوں نے نہ صرف کفار مکہ بلکہ مدینہ کے شمال جنوب اور مشرق میں آباد قبائل سے رابطے کئے انہیں جنگی امداد بہم پہنچائی اور خیبر سے مدینہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا اور اُحد سے چار گنا بڑی فوج لا اتاری۔ مسلمان مدینہ کے گرد خندق کھود کر شہر کے دفاع پر کمر بستہ ہو گئے۔ یہ اب تک کی آزمائشوں میں سب سے بڑی تھی۔ اگرچہ مدینہ میں باقی رہ جانے والے یہودیوں کی مسلمانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کی سازش ناکام ہو گئی تاہم اپنی فراست پر مبنی حکمت عملی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمنوں کی صفوں میں پھوٹ ڈلوانے میں کامیاب ہو گئے اور کافروں کے تمام حلیف ایک ایک کر کے ان سے علیحدہ ہو کر واپس چلے گئے۔

(34) انہی ایام میں مسلمانوں کے لئے شراب نوشی، جوابازی اور پانسہ پھینک کر قسمت معلوم کرنے جیسے کاموں کی ممانعت کر دی گئی۔

(35) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مصالحت کی ایک اور کوشش کے لئے مکہ کا سفر اختیار کیا۔ مکہ کے شمال کی جانب جانے والے تجارتی قافلے (مسلمانوں کے حملوں کے باعث) رک جانے کی وجہ سے ان کی معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے تجارتی قافلوں کے لئے بحفاظت راہداری کا وعدہ کیا اور یہ بھی کہ جو کافر بھاگ کر مدینہ جائیں گے ان کو واپس کر دیا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی ہر شرط تسلیم کر لی حتیٰ کہ عمرہ کئے بغیر مدینہ واپس جانے کا مطالبہ بھی مان لیا۔ مکہ میں حدیبیہ کے مقام پر ہونے والے اس معاہدے میں نہ صرف فریقین نے خود جنگ نہ کرنے کا عہد کیا بلکہ کسی ایک فریق کی تیسرے کے ساتھ لڑائی میں بھی غیر جانبدار رہنے کا سمجھوتہ کر لیا۔

(36) کفار مکہ کے ساتھ امن کا معاہدہ ہو جانے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبلیغ اسلام کے لئے ایک وسیع تر پروگرام کا آغاز کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روم (شام)

ایران، حبشہ (ایبے سینیا) اور دوسری ریاستوں کے حکمرانوں کو خطوط لکھے جن میں انہیں قبول اسلام کی دعوت دی۔ بازنطینی (رومی) لاٹ پادری نے اسلام قبول کر لیا مگر اس کے مسیحی پیروکاروں نے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صوبہ معان (فلسطین) کے گورنر (فروہ بن عمرو جذامی، مترجم) کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا اور شہنشاہ کے حکم پر اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ شام (فلسطین) کے علاقے میں مسلمان سفیر کو قتل کر دیا گیا اور بجائے مجرموں کو سزا دینے کے رومی شہنشاہ ہرقل ان کی مدد کے لئے فوج لے کر آ دھمکا تا کہ ان کے خلاف جو فوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روانہ فرمائی تھی اس کا مقابلہ کیا جائے۔ (جنگ موتہ)

فتح مکہ:

(37) کفار مکہ نے ایک مرحلے پر مسلمانوں کو مشکلات میں گھرا دیکھ کر معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود (10) ہزار کا ایک مضبوط لشکر لے کر بغیر کسی کو منزل کا پتہ دیئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے اور اچانک انہیں آ لیا۔ مکہ پر قبضہ خون کا قطرہ بہائے بغیر مکمل ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاتح ہونے کے باوجود پیکر رحمت تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل مکہ کو جمع ہونے کا حکم دیا اور انہیں ان کی 20 برس کی زیادتیاں یاد دلائیں کہ کس طرح انہوں نے اللہ کا نام لینے پر مسلمانوں پر جبر و تعذیب کے کوڑے برسائے۔ مہاجرین کی املاک پر غاصبانہ قبضہ کیا۔ مدینہ میں ان پر حملہ آور ہوئے اور مسلسل مخاصمانہ رویہ اپنائے رکھا۔ سب سر جھکائے شرمندہ کھڑے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: اب آپ مجھ سے کس سلوک کی توقع رکھتے ہو۔"

"آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کریم بھائی ہیں اور کریم بھائی کے بیٹے ہیں۔" مجمع میں سے آوازیں ابھریں۔

"آج تم پر کوئی سرزنش نہیں جاؤ تم آزاد ہو۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان عام فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی طرف سے اپنی چھوڑی ہوئی املاک کی واپسی کے دعوے بھی باطل قرار دے دیئے۔ اس اعلان سے تو گویا دلوں کی کایا پلٹ گئی۔ یہ اعلان سننے کے بعد مکہ کا ایک سردار (عتاب بن اسید، مترجم) قبول اسلام کا ارادہ لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بڑھ رہا تھا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دیکھ کر فرمایا "میں تم کو

مکہ کا حاکم مقرر کرتا ہوں۔'' مفتوحہ مکہ میں ایک بھی مسلمان سپاہی متعین کئے بغیر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ لوٹ گئے۔ مکہ کو مسلمان کرنے کا عمل چند گھنٹوں میں مکمل ہو گیا۔

(38) فتح مکہ کے فوراً بعد شہر طائف کے مکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گئے۔ کچھ مشکلات کے بعد دشمن کو وادی حنین میں شکست دے کر منتشر کر دیا گیا مگر مسلمانوں نے طائف کا محاصرہ اٹھا کر پرامن ذرائع سے اس علاقے کی مزاحمت ختم کرنے کا فیصلہ کیا چنانچہ ایک سال سے بھی کم عرصے میں طائف کا وفد مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اطاعت قبول کرنے کی پیش کش کی، تاہم انہوں نے استدعا کی کہ انہیں نماز، زکوٰۃ و عشر، فوجی خدمات سے مستثنیٰ رکھا جائے جب کہ زنا اور شراب نوشی کی آزادی برقرار رکھنے کی بھی اجازت ہو نیز یہ بھی کہ طائف میں ان کے بت لات کا معبد بھی منہدم نہ کیا جائے۔ مگر اسلام کوئی مادیت پسند، غیر اخلاقی تحریک نہیں کہ من مانیوں کی اجازت ہو۔ فوراً ہی اہل طائف کو اپنے مطالبات کے مضحکہ خیز ہونے کا یقین ہو گیا اور وہ اپنے رویہ پر شرمسار ہوئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں (وقتی طور پر) زکوٰۃ و عشر کی ادائیگی اور فوجی خدمات سے مستثنیٰ کر دیا اور بت کے انہدام کے بارے میں فرمایا کہ تمہیں اسے اپنے ہاتھوں منہدم کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہاں سے کچھ لوگوں کو بھیج دیں گے جو یہ کام کر دیں گے اور اگر تمہیں اندیشہ ہے کہ بت کے انہدام سے کوئی نقصان پہنچے گا تو آپ لوگ بے فکر رہیں اس کا نشانہ وہ لوگ ہوں گے جو اسے ڈھائیں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس نرم روی سے اندازہ ہوتا ہے کہ نو مسلموں کو کچھ رعایات دی جا سکتی ہیں۔

اہل طائف کا قبول اسلام اس قدر مکمل تھا کہ جلد ہی وہ خود ہی ان رعایتوں سے دستبردار ہو گئے جو ان کے طلب کرنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دی تھیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے علاقے میں عشر و زکوٰۃ کی وصولی کے لئے عملہ مقرر کرنا پڑا۔

(39) دس سال پر محیط اس عرصے میں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں ہونے والی لڑائیوں سے مرنے والے کفار کی تعداد صرف 250 کے قریب ہے جبکہ مسلمان اس سے بھی کم تعداد میں شہید ہوئے۔ اس ہلکی سی نشتر زنی سے 10 لاکھ مربع میل سے زیادہ رقبہ پر مشتمل جزیرہ نما عرب ہر قسم کے انتشار اور غیر اخلاقی قباحتوں سے پاک ہو گیا۔ اس دوران نہ صرف تمام عرب بلکہ عراق کے جنوبی علاقے اور فلسطین رضاکارانہ طور پر دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے جب کہ کچھ مسیحی، یہودی

اور آتش پرست اپنے مذاہب پر قائم رہے جنہیں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی مکمل آزادی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں اپنے فیصلے اپنے دین کے مطابق کرنے کا بھی اختیار حاصل تھا۔

(40) 10 ہجری میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حج کے لئے مکہ روانہ ہوئے (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں ایک ہی حج کیا جو حج الوداع بھی کہلاتا ہے، مترجم) تو ایک لاکھ 40 ہزار فرزندان توحید عرب کے کونے کونے سے جمع تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی تعلیمات کا نچوڑ پیش کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> "خدائے واحد پر ایمان رکھو، کسی کو اس کے ساتھ شریک نہ کرو۔ تمام مسلمان برابر ہیں کسی کو نسل یا قوم کی بنا پر دوسرے پر امتیاز حاصل نہیں۔ برتری کی بنیاد صرف پرہیزگاری ہے۔ تم پر ایک دوسرے کی جان، مال اور عزت اسی طرح حرام ہے جس طرح اس شہر، دن اور مہینے کی حرمت ہے۔ جاہلیت کے تمام خون معاف ہیں اور جاہلیت کا سود بھی ختم کر دیا گیا۔ عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، تم پر ورثہ کی مقررہ حصہ کے مطابق تمام حقداروں مردوں اور عورتوں سمیت میں تقسیم واجب ہے۔ دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے روکنا۔ قرآن اور میری سنت کو اپنی زندگی میں جاری وساری رکھنا۔"

وصال:

(41) مدینہ واپسی پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علیل ہو گئے اور چند ہفتوں بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے داعی اجل کو لبیک کہا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکمل طور پر مطمئن تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کیا تھا یعنی اس کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانا اس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکمل کر دیا تھا۔

(42) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آنے والی نسلوں کے لئے ایک ایسا دین چھوڑا جو مکمل توحید پر مبنی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسے خطے میں انتہائی منظم ریاست قائم کی جو

صدیوں سے بدامنی اور لاقانونیت کا گہوارہ تھا اور وہاں امن قائم کر دیا جہاں ہر شخص دوسرے کے خلاف آمادہ پیکار تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاملات دین اور دنیا نیز مذہب اور سیاست میں ہم آہنگی اور توازن قائم کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ایسا نظام قانون چھوڑا جس نے غیر جانبدارانہ انصاف کی فراہمی یقینی بنائی جس کی نظر میں سربراہ مملکت اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نہ تھا۔ جس میں مذہبی رواداری کا یہ عالم تھا کہ مسلمان ممالک کے غیر مسلم شہری قانونی، عدالتی اور سماجی رسوم ورواج کے معاملات میں مکمل آزاد تھے۔

ریاست کے محاصل کے معاملات میں قرآن نے آمدنی اور اخراجات کی حدیں مقرر کردی ہیں جس میں معاشرے کے نادار طبقوں کی طرف خصوصی نظر رکھی گئی ہے۔ سرکاری محاصل کے بارے میں واضح کر دیا گیا کہ یہ سربراہ مملکت کی ذاتی املاک میں شمار نہیں ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اعلیٰ ترین مثال قائم کی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دوسروں کو تلقین کرتے خود بھی اس پر عمل پیرا ہوتے۔[1]

---

[1] معجزات یا غیر معمولی واقعات ایک حقیقت ہیں۔ مسلمانوں کو ان پر ایمان رکھنا چاہئے کیونکہ قرآن نے بھی ان کا تذکرہ کیا ہے لیکن اگر ہمیں وہ غیر معمولی نظر آتے ہیں تو دراصل خالق کائنات نے تو پہلے سے ہی ان کے وقوع کا انتظام کر رکھا ہوتا ہے لیکن یہ ایسے مواقع پر وقوع پذیر ہوتے ہیں جب ہم اس کی توقع نہیں کر رہے ہوتے۔

اگر یہ واقعات پیغمبر کی دعا کے نتیجے میں رونما ہوں تو یہ معجزہ کہلاتے ہیں (ایسے کام جن کی اہلیت دوسرے لوگ نہیں رکھتے) اگر اولیاء کے ہاتھوں غیر معمولی باتیں سامنے آئیں تو انہیں کرامات کہیں گے، تاہم اگر کوئی شیطان صفت شخص ایسے کاموں پر قدرت کا مظاہرہ کرے تو وہ "استدراج" کہلائیں گے۔ مگر ایک عام آدمی کے لئے ان میں امتیاز کرنا آسان نہیں، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کو ہمارے لئے اسوہ حسنہ قرار دیا ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسوہ حسنہ کی پیروی کریں۔

فطری بات یہ ہے کہ ایک عام مسلمان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ مرضی سے معجزات دکھا سکے، کچھ قابل فہم وجوہ کی بناء پر ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کا یہاں تذکرہ نہیں کیا حالانکہ وہ دوسرے تمام

پیغمبروں سے زیادہ ہیں بلکہ اگر تمام پیغمبروں کے معجزات جمع بھی کر لیں تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پکارنے پر دو مردے زندہ ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارے پر چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ تھوڑی سی مقدار میں خوراک اور پانی ایک بڑی جماعت کے لئے کافی ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انگلیوں کے نیچے سے پانی کا چشمہ ابل پڑا۔ (غالباً یہ غزوہ تبوک کے سفر کے دوران رونما ہونے والے واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ مترجم)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چیلنج دیا کہ قرآن مجید کی تین آیات پر مشتمل سورت جیسی ایک سورت بنا کر لے آؤ اور تمام جنوں اور انسانوں کو بلا کر اس کام پر مامور کر دو (اور اس چیلنج کا جواب 14 سو سال سے کوئی نہیں دے سکا) تاہم قرآن نے جو حکم ہمیں دیا ہے اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات اور سنت پر عمل کرنے کی ہدایت کی ہے۔ معجزات کی نہیں۔ (القرآن 29:50-51)۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے پختہ ایمان والے کو معجزات دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی اور ابوجہل اور ابولہب جیسے گمراہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیم معجزے دیکھنے کے باوجود مسلمان نہ ہوئے۔ معجزات کا مقصد کم تر ذہنی سطح کے لوگوں کو قائل کرنا ہوتا ہے۔

باب نمبر 2

اسلام کی حقیقی تعلیمات کا تحفظ

سچ اور جھوٹ کے مابین کوئی چیز مشترک نہیں اور نہ ہی دنیا میں کوئی دو چیزیں ایک دوسرے سے اس طرح متضاد ہو سکتی ہیں جس طرح یہ ہیں:

ہماری روزمرہ زندگی میں دنیا داری کے معاملات میں جھوٹ اور فریب کاری کی لعنتیں عام ہیں اور ہر ایک کے علم میں ہیں مگر جہاں تک ابدی نجات یعنی عقائد اور کسی مذہب کی حقیقی تعلیمات کا تعلق ہے ان میں جھوٹ یا فریب کاری سب سے بڑی لعنت اور برائی ہے۔

(44) ایک دیانت دار اور معقول فکر کے حامل شخص کو کسی نصیحت یا تعلیم کے درست اور قابل قبول ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ مگر جہاں معاملہ مذہب اور عقائد کا ہو تو عام طور پر بات سے پہلے یہ پرکھا جاتا ہے کہ کہنے والے کی ساکھ کیا ہے۔ اگر بات کرنے والا قابل اعتماد ہے تو اگر کچھ باتیں اس کی سمجھ میں نہیں بھی آرہیں تو سننے والا اسے اپنی فہم کی کمزوری تصور کرتا ہے اور اس بناء پر اس کے فرامین کو مسترد نہیں کرتا۔ ایسی صورتحال میں الفاظ اور تعلیمات کی صداقت کو جانچنا خصوصاً جب کہ کہنے والا دنیا سے رخصت ہو چکا ہو اور بھی اہم ہو جاتا ہے۔

(45) دنیا کے تمام اہم مذاہب کی بنیاد مخصوص مقدس کتابیں ہوتی ہیں اور اکثر ان کا ماخذ اللہ کی طرف سے آنے والی وحی قرار دیا جاتا ہے، تاہم اگر بدقسمتی سے مقدس کتاب کا اصل مسودہ کسی طرح ضائع ہو جائے تو اس کا جو متبادل تیار کیا جائے گا وہ کبھی بھی مکمل طور پر اصل کے مطابق نہیں ہو سکتا۔ شائد ہندو، بدھ، یہودی، پارسی اور مسیحی اپنے اپنے مذاہب کی بنیادی تعلیمات کو محفوظ رکھنے کے طریقے کا مسلمانوں کے طریقے سے موازنہ کرنا چاہیں مگر سوال یہ ہے کہ ان کی کتابیں کس نے تحریر کیں؟ ان کو نسل در نسل کس نے منتقل کیا؟ جو مسودے اگلی نسل کو منتقل ہوئے، اصل

تھے یا محض ان کے تراجم تھے؟ کیا ایک ہی مذہب کے مختلف فرقوں کے مابین جنگ و جدل نے مسودوں کی نقول کو نقصان نہیں پہنچایا؟ کیا مختلف مذاہب میں اندرونی تضادات اور خلا نہیں پائے جاتے جن کا حوالہ کسی دوسری جگہ سے مل جاتا ہے؟ یہ وہ چند سولات ہیں جن کا سامنا سچائی کے حقیقی متلاشی کو کرنا پڑتا ہے اور جو اطمینان بخش جوابات کے متقاضی ہیں۔

محفوظ بنانے کے ذرائع:

(46) جس وقت بڑے مذاہب کا ظہور ہوا اس وقت لوگ نہ صرف اپنے حافظے پر انحصار کرتے تھے بلکہ اپنے خیالات کو محفوظ بنانے کے لئے تحریر کا فن بھی ایجاد ہو چکا تھا۔ ان میں تحریری شکل میں مخطوطات کو محفوظ بنانا حافظے سے زیادہ دیرپا تھا کیونکہ انسانی عمر کی طوالت بہرحال محدود ہوتی ہے۔

(47) لیکن اگر دونوں ذریعوں کا الگ الگ جائزہ لیا جائے تو یہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں ہیں۔ یہ روزمرہ کے تجربہ کی بات ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی تحریر لکھتا ہے اور پھر اس پر نظر ثانی کرتا ہے تو اس میں کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور موجود ہوتی ہیں، کہیں کوئی حرف اور بعض اوقات لفظ لکھنے سے رہ گیا، کوئی جملہ دوبار لکھا گیا یا وہ لفظ نہ لکھا گیا جو ارادہ میں تھا۔

گرامر کی غلطیاں بھی نکل آتی ہیں، حتیٰ کہ لکھنے والے کی بعض اوقات رائے مکمل تبدیل ہو جاتی ہے اور وہ نظر ثانی کرتے وقت اپنے طرز تحریر خیالات اور دلائل کی اصلاح کر لیتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ پورا مسودہ ہی از سر نو تحریر کرنے لگتا ہے۔

یہی صورتحال حافظے کے ساتھ بھی ہے، وہ لوگ جو کوئی سبق زبانی یاد کرتے ہیں اور پھر اسے بعد میں دہراتے ہیں وہ جانتے ہیں خصوصاً اس صورت میں کہ یاد کیا ہوا سبق طویل ہے کہ دہراتے وقت بعض اوقات کوئی نکتہ ان کے حافظے کی گرفت سے نکل جاتا ہے اور پھر انہیں وہ لفظ چھوڑ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے یا بعض اوقات وہ لفظوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں اور بعض اوقات سلسلہ سرے سے ہی بھول جاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ درست الفاظ تحت الشعور میں محفوظ ہوتے ہیں اور اسی لمحے دوبارہ یاد آ جاتے ہیں یا کوئی دوسرا لقمہ دے کر یاد دلا دیتا ہے اور یا پھر وہ دوبارہ تحریری شکل میں محفوظ مسودے سے دیکھ کر اسے درست کر لیتے ہیں۔

(48) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قوی حافظہ کے مالک تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کو محفوظ رکھنے کے لئے بیک وقت دونوں طریقے استعمال کرتے تھے تاکہ یہ

ایک دوسرے کے لئے طاقت کا باعث ہوں اور متن کی صحت کو یقینی بنا کر غلطیوں کے امکان کو کم سے کم رکھا جا سکے۔

اسلامی تعلیمات:

(49) اسلام کی تعلیمات کا ماٰخذ بنیادی طور پر قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے کاتبین کو بعض اسباق لکھواتے تھے جنہیں ہم قرآن کہتے ہیں اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جمع کئے وہ احادیث کہلاتی ہیں۔

(50) قرآن کے لفظی معانی ہیں پڑھنا یا تلاوت کرنا۔ اسے اپنے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو لکھواتے (اور ان کے سامنے تلاوت کرتے) ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو بتاتے تھے کہ یہ اللہ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام کا تمام کلام اللہ مسلسل نہیں لکھوایا کیونکہ اللہ کی طرف سے وحی وقفوں وقفوں سے آتی تھی اور جونہی کلام پاک کا کوئی حصہ نازل ہوتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو سناتے اور انہیں ہدایت کرتے کہ اسے نہ صرف زبانی یاد کرلیں تاکہ نمازوں میں پڑھا جاسکے بلکہ اسے تحریر میں بھی لے آئیں اور نقول بھی تیار کرلیں۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو یہ بھی فرماتے کہ پہلے سے نازل شدہ قرآن میں نئے حصے کو کس جگہ رکھنا ہے۔

(51) یہ بات قابل فہم معلوم ہوتی ہے کہ سب سے پہلا جو کلام نازل ہوا اسے فوری طور پر احاطہ تحریر میں نہیں لایا گیا کیونکہ اس وقت ابھی کوئی مسلمان ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ قرآن کی نازل ہونے والی یہ آیات چھوٹی چھوٹی اور تعداد میں بہت تھوڑی تھیں اور ایسا کوئی خدشہ نہیں تھا کہ خدانخواستہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حافظے سے یہ محو ہو جائیں گی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اکثر و بیشتر اپنی عبادت اور گفتگو میں انہیں دہراتے رہتے تھے۔

(52) کچھ تاریخی حقائق صورتحال کی تصویر ہمیں دکھاتے ہیں۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے والے وہ 40 ویں شخص تھے۔ یہ واقعہ نبوت کے پانچویں سال (یعنی ہجرت سے 8 سال پہلے) کا ہے اور اسلام کے ان ابتدائی برسوں میں بھی

قرآن تحریری شکل میں موجود تھا کیونکہ ابن ہشام کی روایت کے مطابق عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ (اپنی بہن کے گھر میں) قرآن کی کچھ آیات کو تحریری شکل میں پڑھ کر ہی متاثر ہوئے اور پھر مسلمان ہو گئے۔ یہ تو پورے یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ قرآن کو تحریری شکل میں محفوظ کرنے کا کام دراصل کس وقت شروع ہوا لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے باقی 18 برس کے دوران جیسے جیسے مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ قرآن کی تحریری نقول کی تعداد بھی بڑھتی چلی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوا اور یہ فطری بات ہے کہ اس میں اس وقت درپیش مسائل کے حوالے موجود ہوتے تھے۔ مثلاً کسی صحابی کا انتقال ہو گیا تو اس موقع پر آنے والی وحی وراثت کے قانون پر مبنی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ اس موقع پر چوری، قتل یا شراب نوشی کی سزاؤں کا قانون اتار دیا جائے۔ وحی کا سلسلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کے بعد پورے تیئس سال جاری رہا۔ جن میں مکہ کے تیرہ اور مدینہ کے دس سال شامل تھے۔ بعض اوقات ایک وحی کے دوران پوری سورۃ نازل ہو جاتی اور کبھی محض چند آیات اتاری جاتیں۔

(53) نازل شدہ کلام کی نوعیت متقاضی ہوتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے بار بار صحابہ کے سامنے دہراتے اور وقفوں وقفوں سے وہ ترتیب بھی بتاتے جس کے تحت اس کلام کو متعلقہ سورۃ کے ساتھ شامل کرنا ہوتا تھا۔ یہ مصدقہ روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر رمضان المبارک میں حضرت جبریل علیہ السلام کی موجودگی میں قرآن کی تلاوت کا ایک دور مکمل کیا کرتے تھے یعنی جتنا قرآن اس وقت تک نازل ہو چکا تھا اور جس سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے جبریل علیہ السلام نے مکمل قرآن کا آپ سے دو مرتبہ دور کرایا اور اسی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اندازہ ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ کا بلاوا آنے والا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے فرشتہ کی یہ مدد روحانی حوالے سے جو بھی مقصد رکھتی ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ''دور'' میں شامل ہوتے تھے اور اپنی اپنی نقول کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاوت کے مطابق درست کر لیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان میں آیات کو دہراتے رہتے اور انہیں اللہ کی ہدایت کے مطابق متعلقہ سورتوں کے ساتھ شامل بھی کرتے رہتے۔ کیونکہ وحی کا سلسلہ ساتھ ساتھ جاری رہتا تھا۔ بعض اوقات پوری سورۃ ایک ہی دفعہ نازل ہو جاتی اور بعض اوقات ایک ہی سورۃ

تھوڑی تھوڑی کر کے مکمل ہوتی لیکن اس سے کوئی مسئلہ پیش نہیں آتا تھا، ہاں اگر ایسی صورت ہوتی کہ کئی سورتیں بیک وقت نازل ہونا شروع ہو جاتیں اور سب کے حصے تھوڑے تھوڑے کر کے نازل ہو رہے ہوتے تو پھر اسے ضابطہ تحریر میں لانا ضروری ہو جاتا اور انہیں عارضی طور پر مویشیوں کی ہڈیوں، کھجور کے پتوں، چپٹے پتھروں اور کھال وغیرہ پر تحریر کر لیا جاتا اور جونہی سورۃ مکمل ہوتی تو کاتبین وحی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی نگرانی میں اس کی ترتیب درست کر لیتے اور صفائی کے ساتھ ان کی نقول تیار کر لی جاتیں (ترمذی، ابن حنبل، ابن کثیر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی معمول تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رمضان المبارک کے دوران ہر رات اضافی نفلی عبادت بھی کرتے کبھی باجماعت بھی جس میں اس وقت تک نازل شدہ مکمل قرآن کی قرأت فرماتے اور یہ عمل ایک ماہ میں مکمل ہو جاتا۔ یہ نماز تراویح پورے خشوع وخضوع سے آج بھی ادا کی جاتی ہے۔

(54) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں بغاوتیں اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کو فرو کرنے میں جو جنگ وجدل برپا ہوا اس میں بہت سے حفاظ کرام شہید ہو گئے جس کے باعث خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن مجید کی فوری تدوین کی ضرورت محسوس کی اور یہ کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے چند ماہ کے اندر مکمل ہو گیا۔

(55) حیات طیبہ کے آخری برسوں میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کاتب وحی ہونے کا اعزاز حاصل رہا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خلیفہ بننے کے بعد ان کو قرآن مجید کی ایک مصدقہ نقل تیار کرنے کی ذمہ داری سونپ دی۔ مدینہ میں اس وقت حفاظ کرام کی بڑی تعداد موجود رہتی اور حضرت زید بھی حافظ قرآن تھے اور وہ اس ''دور'' میں بھی شریک ہوئے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری دفعہ حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ مکمل کیا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں ہدایت کی کہ قرآن کے ان مخطوطوں کی دو دو نقل حاصل کریں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی گئی تلاوت کے مطابق تیار کئے گئے تھے اور اس کے بعد اس کے مطابق مکمل قرآن کو ایک جگہ جمع کریں چنانچہ لوگوں نے اپنے اپنے مخطوطے حضرت زید کے پاس جمع کرا دیئے۔ انتہائی مصدقہ روایات کے مطابق صرف دو آیات ایسی تھیں جن کی شہادت کے لئے ایک دستاویز دستیاب ہوئی ورنہ باقی تمام قرآن مجید کی تصدیق ان گنت مصدقہ مخطوطوں سے ہو گئی۔

(56) اس طرح جو مصدقہ نقل تیار ہوئی اسے "مصحف" کہا گیا یہ نسخہ خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تحویل میں رہتا اور آپ کے بعد آپ کے جانشین حضرت عمرؓ کی تحویل میں چلا گیا۔ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ کے ساتھ قرآن پڑھنے والوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی اور قرآن کے نسخوں کی مانگ میں بھی اسی نسبت سے اضافہ ہونے لگا چنانچہ اس ضرورت کو دیکھتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کافی تعداد میں قرآن مجید کی مصدقہ نقول تیار کروا کر صوبائی دارالحکومتوں میں بھجوا دیں تاکہ مفسدوں کو تحاریف کا موقع نہ مل سکے۔ تاہم قرآن مجید کے مصدقہ نسخوں کی وسیع پیمانے پر تقسیم کا اعزاز حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل ہوا۔ آپ کے دور کی اسلامی سلطنت میں آرمینیا کا دور دراز خطہ بھی شامل تھا اور آپ کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ وہاں قرآن مجید کے ایسے نسخے دیکھے گئے ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف تھے اور بعض اوقات قرآن پڑھانے والوں کے مابین اس بارے میں جھگڑے بھی ہو چکے ہیں کہ ہر کوئی اپنے پاس موجود قرآن کو درست سمجھتا ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ اطلاع ملتے ہی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں کاتبین کی ایک جماعت بٹھا دی اور فوری طور پر ان سے "مصحف صدیقی" کے مطابق قرآن مجید کے سات مصدقہ نسخے تیار کروائے اور انہیں یہ اختیار بھی دیا کہ جہاں ضرورت سمجھیں پرانے رسم الخط کو تبدیل کر دیں۔[1] ان نقول کو مدینہ منورہ میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اجتماع میں جن میں حفاظ کرام بھی موجود تھے۔ تلاوت کر کے ان کی مزید تصدیق کی گئی اور پھر یہ نسخے اس ہدایت کے ساتھ صوبائی صدر مقامات پر بھجوائے گئے کہ آئندہ تمام نقول ان مصدقہ نسخوں کے مطابق تیار کرائی جائیں اور باقی موجود تمام نسخے تلف کر دیئے جائیں۔

---

[1] دراصل عرب کے مختلف قبائل اور علاقوں کا عربی کا لب ولہجہ ایک دوسرے سے مختلف تھا چنانچہ جس مفتوحہ علاقے میں جو معلم قرآن گیا اس نے اپنے لہجے میں قرآن پڑھایا اس وقت ابھی قرآن مجید پر اعراب نہیں لگے تھے اس لئے ہر پڑھنے والا اپنے لہجہ کے مطابق پڑھنے میں آزاد تھا۔ مثلاً عراق میں عبداللہ بن مسعود معلم قرآن تھے۔ ان سے قرآن پڑھنے والے اسی لہجے کو درست سمجھتے جبکہ شامی مقداد بن اسود کے لہجے کو درست سمجھتے۔ اس نزاع کو ختم کرنے کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے "مصحف صدیقی" کی نقول کو مصدقہ قرار دے کر دیگر تمام نسخے جمع کر کے جلوا دیئے تاکہ مستقبل میں کوئی فتنہ پیدا نہ ہو سکے اور یہ آپ کی حکمت کا اعجاز ہے کہ آج دنیا کے ایک حصے میں موجود قرآن دوسرے حصے کے قرآن سے ذرا سا بھی مختلف نہیں۔ مترجم

(57) یہ بات قابل فہم ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی عظیم فتوحات کو دیکھتے ہوئے بعض دنیا طلب منافق بھی بظاہر مسلمان ہو گئے مگر ان کا مقصد مادی منافع کا حصول تھا اور ان کی موجودگی سے مسلمانوں کو نقصان بھی پہنچا۔ ایسے افراد سے خدشہ تھا کہ وہ موقع ملنے پر قرآن مجید میں تحاریف کر دیتے۔ ایسے ہی لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس حکم پر مگر مچھ کے آنسو بہانا شروع کر دیئے جس میں غیر مصدقہ قرآنی نسخوں کی تلفی کا حکم دیا گیا تھا۔

(58) روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض اوقات کچھ آیات منسوخ بھی کیں جو پہلے تلاوت کا حصہ تھیں۔ اور ایسا اس لئے کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی جگہ نئی آیت نازل کر دیں اور ایسا بھی ہوا کہ بعض صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے یہ منسوخ شدہ آیت حفظ کر رکھی تھی اور وہ فوت ہو جانے یا مدینہ سے دور ہونے کے باعث نئی تبدیلی سے بے خبر رہے، ہوسکتا تھا کہ ان میں سے کوئی حافظ پرانی آیات کے ساتھ (گو وہ بھی قرآنی آیات ہی تھیں مگر بعد میں منسوخ ہو گئیں) قرآن کا نسخہ اپنے پسماندگان کے لئے چھوڑ گیا۔ اس کے علاوہ بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی عادت تھی کہ وہ قرآن میں موجود بعض الفاظ کے معانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتے اور یہ تشریح اپنے قرآن کے حاشئے پر لکھ لیتے تاکہ بھول نہ جائیں۔ ان تشریح شدہ نسخوں سے تیار کی جانے والی نقول بھی بعد میں متن اور شرح کے حوالے سے الجھن پیدا کر سکتی تھیں۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے غیر مصدقہ نسخے تلف کرنے کے حکم کے باوجود تیسری اور چوتھی صدی ہجری تک ایسے نسخے بڑی تعداد میں موجود تھے، جن سے "قرآن میں تضادات" کے موضوع پر ضخیم کتابیں تیار ہوسکتی تھیں۔ ان میں سے کچھ مخطوطے ہم تک بھی پہنچے ہیں اور ان کے گہرے مطالعہ سے ثابت ہو گیا کہ یہ "تضادات" یا شرح (تفسیر) کے باعث تھے یا پرانی عربی عبارتیں پڑھنے میں دِقّت، کیونکہ ان پر آج کی طرح نہ تو اعراب تھے اور نہ ہی نقاط ہوتے تھے جس کے باعث ایک دوسرے سے ملتے جلتے بعض حروف کی پہچان مشکل تھی۔ اس کے علاوہ مختلف علاقوں میں بولی جانے والی عربی ایک دوسرے سے تھوڑی بہت مختلف ہوتی تھی (جیسا کہ آج بھی ایک ہی زبان مختلف علاقوں میں تھوڑے فرق کے ساتھ بولی جاتی ہے، مترجم) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ اپنی زبان اور لہجہ کے مطابق تلاوت کریں اور بلکہ یہ بھی کہ اگر کسی لفظ کی ادائیگی ان کی گرفت سے

باہر ہے تو وہ اس کی جگہ اس کا مترادف استعمال کر لیں جس کو وہ سہولت کے ساتھ بول لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اقدام دراصل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حد درجہ رحمت اور شفقت کا نتیجہ تھا۔ تاہم حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں محسوس کیا گیا کہ اب ابلاغِ عامہ کی صورت پہلے سے بہت بہتر ہے اس لئے (عمومی تعلیم وتدریس کی حد تک) یہ رعایت واپس لے لی جائے تاکہ خدائی کلام کو پڑھنے میں عوام الناس کو الجھن وپیچیدگی کا سامنا نہ ہو۔

(59) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو نسخے تیار کروا کر صوبائی صدر مقامات پر بھجوائے تھے وہ آہستہ آہستہ ختم ہو کر غائب ہو گئے البتہ ان میں سے ایک نسخہ استنبول (ترکی) کے توپ کاپی میوزیم میں جبکہ ایک اور نامکمل حالت میں تاشقند (ازبکستان) میں محفوظ ہے۔ روسی حکومت نے بعد ازاں اپنے پاس موجود مصحف کی عکسی نقل شائع کروادی تھی اور مشاہدہ کیا گیا کہ ترکی میں موجود مصحف اور روسی مصحف ہو بہو ایک جیسے ہیں اور ان دونوں کے متن اور مروج قرآن کے الفاظ میں مکمل یکسانیت ہے۔ یہی صورتحال اب تک موجود پرانے قرآنی مخطوطوں خواہ وہ مکمل حالت میں یا اس کے بعض حصے موجود ہیں ان کے حوالے سے ہے حالانکہ ان میں بعض پہلی صدی ہجری کے بعد سے تعلق رکھتے ہیں۔

(60) مسلمانوں میں یہ عادت رہی ہے کہ وہ کسی کتاب کی مزید اشاعت کیلئے پہلے اس کے مصنف یا پھر اس کے معتمد شاگرد کی موجودگی میں بآوازِ بلند پڑھتے اور متن کی درستگی کی مکمل تصدیق کے بعد اس کی اجازت سے اس کی اشاعت کا اہتمام کرتے تھے۔ حفاظ کرام اور قرآن کے دیگر قاریوں کا بھی یہی معمول رہا ہے اور یہ روایت آج بھی جاری وساری ہے، وہ یوں کہ جب بھی قرآن کا کوئی نسخہ شائع کیا جاتا ہے تو اشاعت سے قبل ایک ماہر حافظ اس کی سماعت کرتا ہے اور یہ تصدیق کرتا ہے کہ یہ متن اس کے عین مطابق ہے جو اس نے اپنے استاد سے حفظ کیا تھا اور یہ کہ اس کے استاد نے تصدیق کی تھی کہ یہ حفظ اس کے استاد کے مصدقہ حفظ کے عین مطابق ہے اور اس طرح یہ سلسلہ بالآخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچ جاتا ہے۔ ان سطور کے مصنف (ڈاکٹر حمید اللہ) نے قرآن مجید مدینہ منورہ میں شیخ القراء حسن الشاعر سے پڑھا تھا۔ اور جو سرٹیفکیٹ انہوں نے مجھے دیا اس میں دوسری باتوں کے علاوہ استادوں کے نسل درنسل سلسلے کا اندراج بھی تھا کہ کس نے کس سے قرآن مجید پڑھا اور اس سلسلے کا اختتام اس استاد پر ہوا جس نے قرآن بیک وقت حضرت عثمان، حضرت علی، ابن مسعود، ابی بن کعب اور زید بن ثابت رضی اللہ

عنہم سے پڑھا تھا۔ (یہ سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ تھے) اور ان سب نے ایک ہی متن اپنے شاگرد کو پڑھایا تھا۔ آج دنیا بھر میں لاکھوں حفاظ موجود ہیں اور قرآن مجید کے کروڑوں نسخے گردش میں ہیں اور جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ان تمام حفاظ کے دماغ میں محفوظ الفاظ میں کوئی فرق ہے نہ ہی کسی قرآنی نسخے میں، خواہ اسے دنیا کے کسی دور دراز گوشے سے ہی کیوں نہ حاصل کیا گیا ہو۔

(61) قرآن عربی زبان میں نازل ہوا اور آج بھی ہم اسی قرآن کی تلاوت کرتے ہیں جو لوگ عربی نہیں جانتے ان کے لئے دنیا کی بڑی زبانوں میں قرآن مجید کے تراجم کئے گئے ہیں، مگر یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ چونکہ قرآن کی اصل زبان عربی ہے اس لئے کسی دوسری زبان سے واپس عربی میں ترجمہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

(62) قرآن مجید کے اپنی اصل زبان میں برقرار رہنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی نگرانی میں اس کی ترتیب و تدوین مکمل ہونے نیز ہر نسل میں بڑی تعداد میں حفاظ کرام کے اپنے حافظے کے علاوہ تحریری صورت میں محفوظ کرنے کے دوہرے عمل کے جاری رہنے اور باصلاحیت اساتذہ کی زیر نگرانی تدریس نے اس میں تحریف کے امکانات ختم کر دیئے اور اس طرح مسلمانوں کی یہ مقدس کتاب تضادات سے پاک ہونے کی خاصیت سے بہرہ ور ہے۔

قرآن کی تعلیمات:

(63) جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اسے اسی شکل میں اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل فرمایا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داری صرف یہ تھی کہ یہ پیغام اللہ رب العزت سے وصول کر کے اس کے بندوں تک پہنچا دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اس کی تخلیق یا تالیف کی ذمہ داری نہ تھی۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی موقع پر کسی آیت کی منسوخی کا اعلان کیا یا اس کے حکم کو غیر مؤثر قرار دیا تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اللہ پاک نے خود اسے منسوخ فرما کر اس کی متبادل آیت نازل کر دی تھی۔

(64) اللہ تعالیٰ کی ذات تجسیم کے حوالے سے انسانی تصور سے ماوراء ہے اور اس کے پیغامات، اسکی رضا اور احکام ایک آسمانی ایلچی یعنی فرشتہ کے توسط سے اس کے انسانی پیغامبر تک

پہنچتے تھے جو وہ اس کے بندوں تک پہنچانے کا پابند تھا۔ اللہ تعالیٰ کی ذات زبان کی پابندیوں سے بلند و بالا ہے۔ ہم اس عمل کی وضاحت اس طرح کر سکتے ہیں کہ پیغمبروں کی حیثیت بلب اور وحی کی کرنٹ کی سی تھی جب بلب کو کرنٹ ملتا تھا تو وہ اس کے وولٹیج اور رنگ کے مطابق روشنی دیتا تھا۔ پیغمبر کی مادری زبان بلب کا رنگ شمار کیا جا سکتا تھا۔ بلب اور کرنٹ کی طاقت اور دوسری چیزوں کا تعین خود خدا کی ذات کرتی تھی اور اس میں انسانی عنصر کی موجودگی محض کرنٹ کی ترسیل کے لئے ایک درمیانی واسطہ تھی۔

(64۔الف) اسلام کے مطابق قرآن خدائی کلام ہے اور خود قرآن بار بار مسلمانوں سے کہتا ہے کہ وہ قرآن مجید کی دن اور رات میں جب بھی ہو سکے تلاوت کریں۔ صوفیائے کرام نے اس کی وضاحت بڑی خوبصورتی سے اس طرح کی ہے کہ تلاوت اللہ کے کلام کے ذریعے انسانوں کے اللہ تک پہنچنے کا سفر ہے جس میں قرآن مجید یعنی اللہ کا کلام شاہراہ ہے۔ جیسا کہ بلب کو روشن کرنے کے لئے بجلی گھر سے بلب تک الیکٹرک کرنٹ سڑک یعنی واسطہ کا کام کرتا ہے۔ یہ محض لفاظی نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ہر مسلمان کو ہفتے میں ایک بار قرآن مجید ختم کرنا چاہئے۔ اس کے لئے پورے قرآن مجید کو 7 ''منزلوں'' میں تقسیم کیا گیا ہے۔ قرآن مجید کی 114 سورتیں ہیں، جس کی بے شمار آیات ہیں۔ عربی میں منزل کا مطلب ہے ایک دن کے سفر کے بعد کا پڑاؤ جبکہ سورہ یا سورت کے معنی ہیں حجلہ یا کمرہ، آیت کا مادہ اوا جس سے مراد ہے سو جانا۔ یعنی مسافر کے سفر کے تینوں لوازمات (سفر کی تھکاوٹ کے بعد) پڑاؤ، کمرہ اور بستر اور نیند، اس میں سب آ گئے ہیں، یہ تینوں مدارج روحانی اور دنیاوی دونوں سفروں پر منطبق ہوتے ہیں۔ ایک طویل روحانی سفر کرنے والے مسافر کو بھی ایک دن کے سفر کے بعد پڑاؤ اور قیام کی ضرورت پڑتی ہے اور آگے کے سفر کے لئے تازہ دم ہونے کے لئے ایک کمرہ اور بستر بھی درکار ہوتے ہیں اور یہ سفر تو دائمی ہے اس ذات کی طرف سفر جو ابدی اور تمام حدوں سے ماورا ہے۔

(65) قرآن مجید میں تمام بنی نوع انسان کو مخاطب کیا گیا ہے، نسل، خطے اور زمانے کی تخصیص کئے بغیر، اس کے علاوہ اس میں انسانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں رہنمائی فراہم کی گئی ہے چاہے یہ روحانی ہے یا دنیاوی، انفرادی ہو یا اجتماعی۔ اس میں جہاں سربراہ ریاست کے لئے ہدایت موجود ہے وہاں عام انسان بھی فیض یاب ہو سکتا ہے۔ امیر بھی اس سے رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں، غریب بھی۔ زمانہ امن کے دوران بھی قرآن سے ہدایت ملتی ہے اور زمانہ

جنگ کے لئے بھی۔ غرض کہ روحانیت، ثقافت، تجارت اور مادی خوشحالی سمیت ہر شعبے میں رہنمائی میسر ہے۔

قرآن مجید بنیادی طور پر ہر فرد کی شخصیت کو نکھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ ہر فرد اپنے طور پر اپنے خالق کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس مقصد کے لئے قرآن مجید نہ صرف احکام دیتا ہے بلکہ قائل کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ یہ انسان کو استدلال سے متاثر کرتا ہے، واقعات، مثالوں اور استعاروں کے بیان سے بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات بیان کی گئی ہیں جو اپنی ذات میں یکتا ہے۔ کائنات اور اس کی ہر چیز کا خالق ہے۔ ہر چیز سے باخبر، ہمہ مقتدر، ہمیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور دنیا کے ہمارے اعمال کا حساب لینے پر قادر۔ سب سے بڑھ کر انصاف کرنے والا اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی شان بیان کرنے کا طریقہ بھی بتایا گیا ہے اور یہ بھی کہ بہترین دعائیں کون سی ہیں۔ بندے پر اللہ کی طرف سے کون سے فرائض عائد کئے گئے ہیں اور دیگر انسانوں اور خود اپنی ذات کے حوالے سے کون سے فرائض ہیں۔ ذات کے حوالے سے اس لئے کہ ہمارا خود سے کوئی رشتہ نہیں بلکہ ہمارا تعلق اللہ سے ہے۔ جس نے ہم کو ہمارے پاس ایک امانت کے طور پر رکھا ہے۔ قرآن مجید سماجی زندگی، تجارت، شادی بیاہ، وراثت، تعزیری قوانین، بین الاقوامی قوانین سمیت بہت کچھ بتاتا ہے۔ مگر قرآن کو عام فہم انداز میں محض کتاب نہیں سمجھنا چاہئے۔ یہ خدائی کلام کا مجموعہ ہے۔ جو وحی کی صورت میں 23 برس کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کے لئے ''بادشاہ'' (مَلِکْ) کا لفظ بھی استعمال کیا ہے اور انسانوں کو اس کے بندے اور غلام قرار دیا ہے۔ بادشاہ جب اپنے کسی غلام کو کوئی پیغام بھیجنا چاہتا ہے تو وہ اپنے ایلچی کو بھیجتا ہے اور اس کو مخصوص ہدایات کے ساتھ روانہ کرتا ہے۔ اس لئے بعض چیزیں اس پیغام میں مخصوص ہوں گی۔ بعض کو تاکید کے لئے تکرار کے ساتھ ادا کیا گیا ہوگا اور اظہار کا پیرایہ بھی مختلف ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی کبھی اپنے لئے صیغہ واحد متکلم اور واحد غائب استعمال کیا ہے۔ کبھی اپنے آپ کو ''میں'' اور کبھی ''ہم'' یا ''وہ'' کہہ کر ذکر کیا مگر کبھی ''وہ جمع'' (جمع غائب) کا صیغہ استعمال نہیں کیا۔

(66) قرآن مجید کی زبان یعنی لفظوں کا انتخاب اور بیان لاجواب اور کلام اللہ کے شایان شان ہے۔ اس کی تلاوت سے ان لوگوں کی روح بھی متزلزل ہو جاتی ہے جو سمجھے بغیر اسے محض سنتے ہیں۔

قرآن مجید نے اپنے خدائی کلام ہونے کے دعوے کے مطابق (38:10,23:2,13:11,18:17) انسانوں اور جنوں کو چیلنج دیا کہ وہ مل کر قرآن مجید جیسی چند آیات بنا کر لے آئیں اس چیلنج کا آج تک کوئی جواب نہیں دے سکا۔

حدیث نبوی:

(67) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین یا جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کیا یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی موجودگی میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے جو کہا یا کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ حدیث کہلاتا ہے۔ کیونکہ رویے یا عمل پر لوگوں کے سامنے خاموشی رضامندی کے ہی مترادف ہوتی ہے۔

(68) قرآن مجید میں درجنوں مقامات پر حدیث کی قانونی اہمیت یاد دلائی گئی ہے۔

''......اے ایمان والو! فرمانبرداری کرو اللہ تعالیٰ کی اور فرمانبرداری کرو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔......(59:4)

''......اور تمہیں جو کچھ رسول دے لے لو، اور جس سے روکے رک جاؤ ......''(7:59)

''اور نہ وہ اپنی خواہش سے کوئی بات کہتے ہیں، وہ تو صرف وحی ہے جو اتاری جاتی ہے۔''(53:3-4)

''یقیناً'' تمہارے لئے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں عمدہ نمونہ (موجود) ہے ہر اس شخص کے لئے جو اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن کی توقع رکھتا ہے اور بکثرت اللہ تعالیٰ کی یاد کرتا ہے۔''(21:33)

اس لئے جو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یا حکم دیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کی نظر میں اس میں اللہ کی رضا شامل تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ کسی خاص معاملے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی نہیں آئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خداداد فراست سے کام لے کر رائے ارشاد فرمادی۔ اگر اس رائے میں اللہ تعالیٰ کی رضا شامل نہ ہوتی تو اس کی تصحیح کے لئے وحی کا نزول ہو جاتا۔ حدیث کی ایک اور اہمیت بھی ہے۔

(69) قرآن کا انداز "مختصر اور جامع" ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن حکیم کے اطلاق کی وضاحت کرتے اور اسکی ضروری تفصیل اور تشریح فرماتے۔ مثلاً قرآن میں صرف یہ فرما دیا گیا "نماز قائم کرو" مگر نماز کا نظام کیسے قائم ہو گا اس بارے میں قرآن مجید میں کچھ نہیں کہا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی صرف الفاظ سے نماز پڑھنے کی تفصیل کافی نہیں سمجھی بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک روز فرمایا:

"مجھے دیکھو کہ میں کیسے نماز پڑھتا ہوں، اور میری تقلید کرو۔"

(70) مسلمانوں کے لئے حدیث کی اہمیت اس لئے بھی بہت زیادہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف زندگی کے تمام اہم معاملات کے بارے میں مسلمانوں کی فکری رہنمائی کی بلکہ اپنے ذاتی عمل سے بھی اس کا عملی نمونہ پیش کیا۔ منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا دورانیہ 23 سال پر محیط ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو ایک ایسے مذہب کا تحفہ دیا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود مکمل صمیم قلب کے ساتھ عمل پیرا رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ریاست بھی قائم کی جس کے حاکم اعلیٰ کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف اندرون ملک امن اور سلامتی کا ماحول پیدا کیا بلکہ بیرونی جارحیت سے اسے محفوظ رکھنے کے لئے لشکروں کی قیادت بھی فرمائی۔ اپنی "رعایا" کے باہمی تنازعات کے فیصلے بھی کئے۔ مجرموں کو سزائیں دیں اور زندگی کے ہر شعبے کے لئے قانون سازی کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شادیاں بھی کیں اور اپنی امت کے لئے عائلی زندگی کا ایک نمونہ بھی چھوڑا۔ ایک اہم بات یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنی ذات کو قانون سے بالا قرار نہیں دیا۔ جو قانون جس طرح دوسروں پر لاگو تھا اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس پر عمل کے پابند تھے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل محض ایک ذاتی طرز عمل نہیں تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی تفصیلی شرح اور اطلاق کا عملی مظاہرہ تھا۔

(71) محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک عام فرد کی حیثیت سے اپنے طرز عمل میں محتاط اور اعتدال پسند تھے۔ مگر جہاں تک اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذمہ داریوں کا تعلق ہے آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام یعنی قرآن مجید کو لوگوں تک پہنچانے اور اسے اصل حالت میں محفوظ رکھنے کے حوالے سے تمام ضروری اور ممکنہ اقدامات بروئے عمل لاتے تھے۔

اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے فرامین کے تحفظ کے لئے بھی ویسے ہی اقدامات کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بعض لوگ خود پسند کہہ سکتے تھے اس لئے حدیث کا معاملہ قرآن مجید سے بالکل مختلف ہے۔

سرکاری دستاویزات:

(72) حدیث کے بعض مندرجات ایسے ہیں کہ جن کی اہمیت اس امر کی متقاضی تھی کہ انہیں تحریری شکل میں محفوظ کرلیا جائے۔ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ''سرکاری دستاویزات'' کہلاتی ہیں۔

(73) تاریخ الطبری کی روایت ہے کہ جب کچھ مسلمان کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آ کر پناہ کے لئے حبشہ (ایبے سینیا) روانہ ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں حبشہ کے شاہ نجاشی کے نام ایک سفارشی خط دیا۔ اسی طرح کی کچھ اور دستاویزات بھی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت مدینہ سے قبل تحریر فرمائیں تاہم ہجرت کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سربراہ ریاست کی ذمہ داریاں پڑیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان خطوط کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ ہونے لگا اور ان کے مندرجات کی تفصیل بھی بڑھنے لگی۔

(74) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ تشریف آوری کے بعد جلد ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہری ریاست کے قیام میں کامیاب ہو گئے جس میں مدینہ کے تمام مسلم اور غیر مسلم شہری شامل تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ریاست کو ایک تحریری آئین دیا جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سربراہ ریاست اور شہریوں کے حقوق اور فرائض کو غیر مبہم انداز میں بیان کر دیا اور ریاست کے اداروں کے عمل کا طریق کار بھی متعین کر دیا۔ یہ دستاویز تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شہری ریاست کی حدود بھی تحریری طور پر طے کر دیں۔ دریں اثناء آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ کے مسلمانوں کی مردم شماری کا ریکارڈ مرتب کرنے کی بھی ہدایت جاری فرمائی اور بخاری کی روایت کے مطابق اس کے نتیجے میں ظاہر ہوا کہ مسلمانوں کی تعداد مدینہ میں 1500 ہے۔

(75) اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف عرب قبائل کے ساتھ امن اور دوستی کے معاہدے کیے۔ بعض مواقع پر معاہدے کی دو نقول تیار کی گئیں اور دونوں فریقوں نے

ایک ایک نقل اپنے پاس محفوظ کر لی۔ اطاعت قبول کر لینے والے بعض سرداروں کو تحفظ کی ضمانت دینے اور ان کی زیر ملکیت جائیداد اور آبی ذرائع کو ان کے پاس برقرار رکھنے کے لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحریری فرمان جاری کیے۔ اسلامی ریاست کی حدود میں توسیع کے ساتھ صوبائی گورنروں کے ساتھ خط وکتابت ایک معمول کا حصہ تھی۔ جس میں انہیں نئے قوانین اور دوسرے انتظامی فیصلوں سے آگاہ کرنا مقصود ہوتا تھا جب کہ علاقائی عُمّال کی طرف سے بعض اوقات موقع پر پیدا ہونے والے بعض مسائل پر مرکزی حکومت سے رہنمائی طلب کی جاتی ان کے جوابات بھی دیئے جاتے اور ٹیکسوں میں ردوبدل سمیت دوسری انتظامی تبدیلیوں سے بھی انہیں آگاہ رکھا جاتا۔

(76) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کو بھی خطوط بھجوائے جن میں انہیں قبول اسلام کی دعوت دی گئی مثلاً قیصر روم اور ایران کے خسرو (کسریٰ) اور حبشہ کے شاہ نجاشی۔ ان کے علاوہ چھوٹی ریاستوں اور حکومتوں کے سربراہوں کو بھی اسی نوعیت کے خطوط روانہ فرمائے۔

(77) ہر فوجی مہم کے لئے لڑائی کے خاتمے پر مال غنیمت کی بھی فہرست بنائی جاتی تاکہ مہم میں حصہ لینے والوں کو برابر اور انصاف کے مطابق حصہ مل سکے۔

(78) ایسے شواہد ہیں کہ غلاموں کی خرید وفروخت اور انہیں آزاد کرنے کا بھی باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ کم از کم ایسی تین دستاویزات جن کا اجراء خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہم تک پہنچی ہیں۔

(79) ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ اہم اعلانات فرمائے تھے جن میں سے بعض قانونی نوعیت کے تھے۔ ایک یمنی ابوشاہ کی استدعا پر ان فرامین کی ایک نقل تیار کر کے اس کے حوالے کی گئی۔

(80) قرآن مجید کے ترجمے سے متعلق ایک واقعہ کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مسلمان کے لئے نماز کی ادائیگی عربی زبان میں ہی لازمی قرار دی تھی۔ کچھ ایرانیوں نے اسلام قبول کیا لیکن وہ عربی میں قرآنی آیات حفظ ہونے تک نماز کی ادائیگی التوا میں رکھنے کے لئے آمادہ نہ تھے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جن کا تعلق ایران سے ہی تھا اور جو اب عربی بخوبی سیکھ چکے تھے اپنے نومسلم

ہم وطنوں کے لئے سورۃ فاتحہ کا فارسی زبان میں ترجمہ کر دیا اور وہ لوگ نماز سے متعلقہ آیات عربی میں حفظ ہونے تک فارسی زبان میں نماز ادا کرتے رہے۔[1]

(81) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مسعود سے متعلق ایسی دستاویزات کی ضخامت سینکڑوں صفحات پر محیط ہے۔

(82) یہ امر قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تعلیمات عامہ میں بہت دلچسپی رکھتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ تشریف آوری کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ ''خدا نے مجھے معلم بنا کر بھیجا ہے'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے فوراً بعد سب سے پہلا جو کام کیا وہ مسجد کی تعمیر تھی، جس کے ایک حصے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی ایک جماعت کے لئے تدریس کا انتظام کیا۔ یہ جگہ صفہ کے نام سے معروف ہے جو رات کے وقت اقامت گاہ بن جاتی اور دن کے وقت ایک لیکچر ہال جہاں ہر کوئی بیٹھنے اور حصول علم کے لئے آزاد تھا۔ 2 ہجری میں جب جنگ بدر میں کفار مکہ کو شکست ہوگئی اور مسلمانوں نے بڑی تعداد میں مشرکوں کو قیدی بنالیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان کیا کہ جو قیدی پڑھنا لکھنا جانتا ہو وہ (10) مسلمانوں کو خواندہ بنا دے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ (ابن حنبل، ابن سعد) قرآن پاک میں بھی حکم دیا گیا کہ تجارتی لین دین کے لئے لازمی ہے کہ اسے دو گواہوں کی موجودگی میں تحریر کرلیا جائے (282:11)۔ ایسے اقدامات کی بدولت مسلمانوں میں خواندگی کے تناسب میں تیزی سے اضافہ ہوا اور یہ امر حیرت انگیز نہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں اپنے رہبر اعلیٰ کے فرامین کو تحریر میں محفوظ کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ اس حوالے سے ایک مثال درج ذیل ہے:

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ مدینہ آنے کے بعد ان کا بھی ایک انصاری کے ساتھ رشتہ مواخات قائم ہو گیا۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے بعد مہاجرین کی بحالی اور فوری معاشی سہارے کے لئے ہر مہاجر کو ایک انصاری یعنی مدنی باشندے سے بھائی کے رشتے میں منسلک کر دیا تھا جسے مواخات کا نام دیا گیا) اور وہ دونوں کھجوروں کے ایک باغ میں باری باری کام کرتے تھے۔ جب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کام پر جاتے تو ان کے ساتھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور جو کچھ وہاں دیکھتے اور سنتے وہ شام کو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

---

1. مبسوط: از سرخسی، 1:37، نہایہ حاشیہ الہدایہ از تاج الشریعہ باب الصلوٰۃ۔

کے گوش گزار کر دیتے اسی طرح جب ان کے انصاری بھائی مصروف کار ہوتے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضری کا اعزاز عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل ہوتا۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مجلس میں جو بھی کارروائی ہوتی یعنی نئے قوانین کا نفاذ سیاسیات کے مسائل اور دفاع کے متعلق معلومات، سب دونوں کے علم میں آ جاتیں جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران احادیث جمع کرنے کا تعلق ہے تو ذیل کے واقعات خود ہی حقائق کی گواہی دیں گے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ کے دوران تدوین حدیث:

(83) ترمذی کی روایت ہے کہ ایک روز ایک انصاری (مدینہ کے مقامی شہری) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے کمزور حافظے کی شکایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین فوراً ہی بھول جاتا ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اپنے دائیں ہاتھ سے مدد لیا کرو۔'' (لکھ لیا کرو)۔

(84) بہت سے راویوں (ترمذی، ابوداؤد اور دیگر) سے روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرو بن العاص جو ایک نوجوان مہاجر تھے کا یہ معمول تھا کہ جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے وہ فوراً لکھ لیا کرتے تھے۔ ایک روز دوسرے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے ان کی سرزنش کی اور کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخر کار ایک انسان ہیں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش ہوتے ہیں اور مطمئن اور کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش اور ناراض تو ان دونوں کیفیات کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین کی نوعیت تبدیل ہو سکتی ہے اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ مبارک سے نکلی ہوئی ہر بات ضبط تحریر میں لے آنا مناسب نہیں۔

اس پر عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسے ہم تحریر کر لیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں'' اس پر عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دوبارہ عرض کیا کہ ''یا رسول اللہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش ہوں اس وقت بھی اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناخوش ہوں اس وقت بھی''؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں خدا کی قسم، میری زبان سے ادا ہونے والا کوئی لفظ جھوٹ نہیں۔''

عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو احادیث مبارکہ جمع کیں اسے ''صحیفہ صادقہ'' کا نام دیا۔ کئی نسلوں تک یہی مجموعہ احادیث پڑھایا اور آگے پھیلایا جاتا رہا اور یہ بعد کی بات ہے کہ یہ احادیث ابن حنبلؒ اور دوسرے راویان حدیث کے بڑے مجموعوں میں شامل کی گئیں۔

الدارمی اور ابن عبدالحکم سے روایت ہے: ''ایک دفعہ عبداللہ (بن عمرو بن العاص) رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے شاگردوں سے مصروف گفتگو تھے کہ کسی نے پوچھا ''کون سا شہر مسلمان پہلے فتح کریں گے، روم یا قسطنطنیہ''؟ عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک پرانا صندوق منگوایا اور اس میں سے ایک کتاب باہر نکالی اور اس کی ورق گردانی کے بعد ایک جگہ سے پڑھا: ''ایک روز ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اور جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے تھے اسے لکھتے جاتے تھے تو کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا مسلمان روم یا قسطنطنیہ میں سے پہلے کون سا شہر فتح کریں گے؟'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہرقل کے جانشینوں کا شہر۔''

اس روایت سے یہ بات بخوبی ثابت ہو جاتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمایا ہوا ایک ایک لفظ لکھا کرتے تھے۔

(85) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا معاملہ اس سے بھی اہم ہے۔ آپ مدینہ کے ان چند افراد میں شامل تھے جو کمسنی میں ہی پڑھ لکھ سکتے تھے۔ آپؓ میں یہ صلاحیت صرف 10 سال کی عمر میں موجود تھی۔ آپ کے والدین نے کمسنی میں ہی آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اور آپ ذاتی خادم اور معاون کے طور پر عمر بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رہے۔ آپؓ دن رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال و اقوال دیکھنے اور سننے کے جو مواقع حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ملے وہ دوسرے صحابہ کو نہیں ملے۔ حضرت انس ہی تھے جنہوں نے یہ حدیث روایت کی:

''علم کو لکھ کر حاصل کرو۔''

بعد کے ایام میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک شاگرد نے روایت کی:

> ''اگر ہم اصرار کرتے تو حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے کاغذات کھولتے اور کہتے: ''یہ وہ احادیث ہیں جو میں نے لکھیں اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا کر تصدیق بھی کی کہ ان میں کوئی غلطی تو نہیں۔''

اس اہم روایت سے نہ صرف اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ احادیث جمع کرنے کا کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی شروع ہو گیا تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی تصدیق بھی فرمائی اس روایت کی تصدیق کئی مصدقہ راویوں نے کی ہے مثلاً الرہمرمزی (وفات 360ھ) الحاکم (وفات 405ھ) الخطیب البغدادی (وفات 463ھ) اور ان عظیم محدثین نے پہلے کے قابل اعتماد راویوں کا حوالہ دیا۔

صحابہ کرامؓ کے دور میں جمع کی گئی احادیث:

(86) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد سیرت طیبہ کے حوالہ سے دلچسپی میں اضافہ عین فطری تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اپنی اولاد اور اعزہ واقارب کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق جو کچھ وہ جانتے تھے چھوڑ گئے۔ جو لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہو رہے تھے ان میں اپنے نئے دین کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کی بڑی تڑپ تھی۔ صحابہ کرام اپنی طبعی عمر پوری کرنے کے بعد دنیائے فانی سے رخصت ہوتے جا رہے تھے اور ایسے لوگوں کی تعداد بتدریج گھٹ رہی تھی جنہوں نے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے خود سنی تھیں۔ ان میں سے بھی کئی لوگ انتقال کر چکے تھے جنہوں نے اولین راوی سے خود حدیث سنی تھی اس لئے صورت حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے احادیث کو تحریری صورت میں محفوظ کرنے کی طرف توجہ بڑھ گئی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایت کردہ احادیث بڑی تعداد میں جمع کر لی گئیں۔ بلاشبہ یہی احادیث ''براہ راست'' کہلا سکتی ہیں یعنی وہ جو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منہ مبارک سے سنی گئی تھیں۔

(87) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرو بن حزم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یمن کا حاکم مقرر کیا تو انہیں ان کی انتظامی ذمہ داریوں کے بارے میں تحریری ہدایات دیں۔ عمرو نے وہ دستاویز محفوظ کر لی اور اس کے علاوہ قبائل جہینہ، جذم، طئی، ثقیف اور دیگر کے نام بھیجی گئی 21 دیگر

دستاویزات کی نقول بھی حاصل کرلیں۔ انہیں سرکاری دستاویزات کی حیثیت سے ایک جگہ جمع کرلیا۔ یہ دستاویزات ہمیں دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ (ابن طولون اعلام السائلین)

(88) صحیح مسلم کی روایت ہے کہ جبیر بن عبداللہ نے حج الوداع کے بارے میں ایک کتابچہ تحریر کیا تھا جس میں اس مقدس سفر کا پورا احوال قلم بند کیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ تاریخی خطبہ بھی اس میں درج کیا تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع پر ارشاد فرمایا تھا۔ کئی راویوں نے ایک صحیفہ جبیر کا بھی ذکر کیا ہے۔ جسے ان کے شاگرد زبانی یاد کیا کرتے تھے۔ شاید یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین اور افعال مبارکہ پر مشتمل تھا۔

(89) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو دیگر صحابیوں سمرہ بن جندب اور سعد بن عبادہ کے بارے میں بھی روایت ہے کہ انہوں نے بھی اپنے بچوں کے لئے اپنی یادداشتیں مرتب کی تھیں۔ ابن حجر کا کہنا ہے کہ سمرہ کی مرتب کردہ دستاویز نسبتاً ضخیم تھی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے وقت بہت چھوٹے تھے، اپنے بزرگ ساتھیوں سے بہت کچھ سیکھا اور ان کے جمع کردہ علمی مواد سے اتنا کچھ بنایا کہ مورخوں کا کہنا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کی تحریر کردہ کتابیں ایک اونٹ پر لادی جا سکتی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ابن مسعود بہت بڑے فقیہہ تھے۔ انہوں نے بھی حدیث کی ایک کتاب مرتب کی تھی اور آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے آپ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن یہ مجموعہ احادیث اپنے دوستوں کو فخر سے دکھایا کرتے تھے۔ (الحاکم، مستدرک، باب ابن مسعود)

(90) بخاری کی روایت ہے کہ عبداللہ ابن ابی اوفیٰ، ابوبکرہ اور المغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہم خط و کتابت کے ذریعے حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں جاننا چاہتا تو یہ لوگ تحریری جواب دیا کرتے تھے۔ سرکاری عمال کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نئے فیصلوں کی اطلاع دینے کے لئے خطوط بھی یہی حضرات لکھا کرتے تھے۔

(91) درج ذیل بیان جسے متعدد معتبر راویوں (مثلاً ابن عبدالبر کی جامع بیان العلم) نے روایت کیا ہے زیادہ معلومات افزا اور جامع ہے:

ایک روز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایک شاگرد نے ان سے کہا: آپ نے مجھے فلاں فلاں چیز بتائی تھی۔ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو بظاہر اب بڑھاپے میں تھے اور

حافظہ کمزور ہو چکا تھا یہ حدیث ماننے سے انکار کر دیا۔ مگر شاگرد مصر رہا کہ اس نے ان سے ہی یہ حدیث سنی تھی جس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا "اگر ایسی بات ہے تو یہ ضرور میرے مجموعہ میں تحریر ہوگی۔" اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے اپنے گھر کے اندر لے گئے اور "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث پر مشتمل" کئی کتابیں اسے دکھائیں اور شاگرد نے ان مجموعہ احادیث میں سے مذکورہ حدیث تلاش کر لی۔ اس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بولے: "میں نے تمہیں کہا تھا کہ اگر تم نے یہ حدیث مجھ سے سنی ہے تو ضرور میرے تحریری مجموعہ میں ہوگی۔"

یہ امر قابل ذکر ہے کہ شاگرد کی روایت میں "کئی کتابوں" کا ذکر ہے۔ ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال 59 ہجری میں ہوا۔ اپنے ایک شاگرد ہمام بن منبہ کو انہوں نے 138 احادیث کا ایک مجموعہ لکھوایا (یا لکھا ہوا دیا) یہ مجموعہ جس کا تعلق پہلی صدی ہجری کے نصف اول سے ہے محفوظ ہے۔ جس کے باعث ہم بعد کے مجموعہ احادیث سے اس کا موازنہ کر سکتے ہیں اور اس سے اس امر کی بھی تصدیق ہوتی ہے کہ سابقون الاولون نے آئندہ کی نسلوں کے لئے ذخیرۂ احادیث کو انتہائی احتیاط سے محفوظ رکھا تھا۔

(92) الذہبی (تذکرۃ الحفاظ) بیان کرتے ہیں:

خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی 500 احادیث مبارکہ پر مشتمل ایک مجموعہ اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے کیا۔ مگر اگلے روز اسے واپس لے کر یہ کہتے ہوئے ضائع کر دیا (جلا دیا) "میں نے جو سمجھا وہ تحریر کر دیا تھا لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے الفاظ ہو بہو وہ نہ ہوں، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائے تھے۔" جہاں تک حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس حوالے سے طرز عمل کا تعلق ہے۔ معمر بن راشد کی روایت ہے کہ انہوں نے (عمرؓ) ایک بار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تدوین کے بارے میں مشورہ کیا۔ سب نے اس کے حق میں رائے دی۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اطمینان نہ ہوا اور آپ مسلسل ایک ماہ تک اللہ سے رہنمائی اور شرح الصدر کی دعا کرتے رہے۔ آخر کار آپ نے یہ کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور کہا "پہلی قوموں نے خدائی کتابوں کو چھوڑ کر صرف پیغمبروں کی سنت کو اپنا لیا اور میں نہیں چاہتا کہ اللہ کی کتاب قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کے مابین کوئی الجھا دینے والی صورت پیدا ہوا۔"

تازہ ترین تحقیق یہ ہے کہ ایسے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعداد پچاس سے کم نہیں جن سے متعلق تصدیق موجود ہے کہ انہوں نے احادیث تحریر کر کے جمع کی تھیں مگر یہاں ان کی تفصیل دینے کی گنجائش نہیں۔

تدوین حدیث پر پابندی کا معاملہ:

(93) ابوبکر اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے متعلق مندرجہ بالا دو روایات کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے اس بات کی حقیقی صورتحال ظاہر ہو جاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے فرامین لکھنے سے منع فرما دیا تھا، اگر اس پابندی کا اعلان عام ہوتا تو یہ دونوں حضرات کبھی احادیث جمع کرنے کا سوچتے بھی نہ اور جب انہوں نے تدوین حدیث کے خلاف رائے دی تو انہیں اس کا جواز پیش کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ وہ اس کے محرکین کو خاموش کرانے کے لئے سیدھی بات کرتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کام سے منع فرمایا ہے۔

جن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے یہ روایت منسوب ہے کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کے سوا کوئی بھی چیز لکھنے سے منع فرمایا تھا (یعنی مذہبی حوالے سے) وہ ہیں ابوسعید خدریؓ، زید بن ثابتؓ اور ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم۔ تاہم اس حدیث کا سیاق وسباق معلوم ہے نہ ہی حوالہ کہ کس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا۔ یہ امر پیش نظر رہنا چاہیئے کہ ابوسعید خدریؓ اور زید بن ثابتؓ کا شمار کم عمر صحابیوں میں ہوتا تھا۔ 5 ہجری میں ان کی عمر بمشکل 15 سال کے لگ بھگ ہوگی البتہ ہوسکتا ہے وہ غیر معمولی ذہین ہوں اور یہ بھی قابل فہم ہے کہ ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے ابتدائی برسوں میں انہیں احادیث تحریر کرنے سے منع فرمایا ہو۔ جہاں تک ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تعلق ہے۔ ہم نے دیکھا کہ انہوں نے تو خود احادیث کی ''کئی کتابیں'' مرتب کیں۔ تاریخ میں ان کا ذکر ایک متقی، پرہیزگار اور اصول پرست شخص کے طور پر ہوتا ہے اور یہ بات ناقابل تصور ہے کہ ان جیسے صاحب کردار شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک واضح فرمان کی خلاف ورزی کی ہو اگر پہلی روایت درست ہے تو پھر سوائے اس کے اور کوئی دلیل نہیں کہ انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے پابندی اٹھانے کا حکم سن لیا تھا۔

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا آبائی وطن یمن تھا اور وہ 7 ہجری میں مدینہ آئے اور اسلام قبول کرنے کے بعد یہیں کے ہو رہے۔ ممکن ہے کہ ان کے قبول اسلام کے بعد کچھ عرصہ تک (کہ ابھی وہ مبتدی ہی تھے) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یہی حکم دیا ہو کہ قرآن مجید کے سوا کچھ تحریر نہ کریں پھر بعد میں جب وہ طاق ہو گئے اور قرآن مجید اور احادیث میں فرق کو سمجھنے لگے تو یہ پابندی ختم ہو گئی ہو۔ ایک اور اہم حقیقت بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی یہ بات منسوب ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حوالہ دیئے بغیر اپنی ذاتی رائے دی تھی کہ احادیث کو تحریری صورت میں جمع نہیں کیا جانا چاہیے۔ مگر جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ خود انہوں نے اتنی بڑی تعداد میں احادیث روایت کیں کہ ان تمام صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو پیچھے چھوڑ گئے جنہوں نے تحریری صورت میں احادیث مرتب کیں۔

ان افراد سے منسوب قول اور ان کے فعل میں تضاد سے جن کے تقویٰ کا پورا زمانہ معترف ہو اور جو فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعمیل کو مقصد زندگی سمجھتے ہوں ہمارے اس تاثر کی تائید ہوتی ہے کہ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تحریر کرنے کی ممانعت کسی مخصوص تناظر میں تھی جس کی تفصیل ہم تک نہیں پہنچ سکی اور اس پابندی کا دائرہ محدود تھا۔ اس لئے ہمارے لئے بہتر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بظاہر متصادم دونوں فرامین کو یکسر مسترد کرنے کی بجائے کوئی درمیان کا راستہ اختیار کریں۔

(94) تین ممکنہ صورتیں ہمارے ذہن میں آتی ہیں:

(i) اس پابندی کا اطلاق بعض ایسے افراد پر تھا جنہوں نے نیا نیا لکھنا سیکھا تھا یا انہوں نے اسلام ابھی قبول کیا تھا اور وہ ابھی قرآن اور حدیث کے مابین فرق کرنے کی صلاحیت کے اہل نہیں تھے اور یہ پابندی بعد ازاں مطلوبہ اہلیت حاصل ہو جانے پر اٹھالی گئی (مثلاً ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن سے آئے تھے اور ممکن ہے وہ مسند اور حمورائی طرز تحریر پر تو عبور رکھتے ہوں مگر مکہ (اور پھر مدینہ) میں رائج عربی رسم الخط سے ابھی نابلد ہوں)۔

(ii) یہ بھی ممکن ہے کہ پابندی محض یہ ہو کہ ان کاغذوں پر حدیث نہ لکھی جائے جن پر قرآن مجید لکھا جاتا تھا تا کہ قرآن مجید اور اس کی شرح (حدیث) خلط ملط نہ

ہو جائیں۔ ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کا اشارتاً ذکر کرتے ہیں اور ہم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک فرمان دیکھا ہے جس میں حدیث کے اس طرح لکھنے کی ممانعت کی گئی تھی۔

(iii) یہ بھی ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ممانعت اپنے کسی خاص خطبہ کو قلمبند کرنے کے حوالے سے کی ہو۔ مثلاً جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کے مستقبل اور آئندہ کی روحانی اور سیاسی فتوحات کے بارے میں پیش گوئی کی اور اس کا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ ان کامیابیوں کی پیغمبرانہ پیش گوئیوں کے ہوتے ہوئے مسلمانوں میں جدوجہد کا جذبہ سرد نہ ہو جائے۔

(95) مزید امکانات بھی تلاش کئے جاسکتے ہیں مگر سردست یہ کافی ہیں۔

بعد کی صدیوں میں:

(96) ابتداء میں حدیث کے مجموعے مختصر اور انفرادی تھے۔ ہر صحابیؓ نے اپنے اپنے مجموعے مرتب کر لئے تھے، دوسری نسل میں جب طالبان علم نے ایک سے زیادہ استادوں کے لیکچر سنے تو مختلف افراد کے پاس موجود یادداشتوں کو یکجا کر کے نسبتاً ضخیم مجموعے مرتب کرنا ممکن ہو گیا۔ چند نسلیں بعد صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے تمام مجموعے اکٹھے کر لئے گئے اور پھر موضوعات کے حوالے سے احادیث کی تبویب کی بھی کوششیں کی گئیں تاکہ عدالتی قوانین اور دوسرے علوم کے بارے میں احادیث سے استفادہ کیا جاسکے۔ دریں اثناء قرآن مجید کے انداز میں احادیث کو حفظ کرنے کا کام بھی شروع ہو گیا اور اس مقصد کے لئے حدیث کے تحریری مسودے ہی ذریعہ بنے۔ اہل اور مستند اساتذہ سے تعلیم لازمی شرط کا درجہ رکھتی تھی۔ اس طرح احادیث کو محفوظ کرنے کا یہ تہرا نظام بیشتر صورتوں میں اپنایا گیا تاہم بعض مواقع پر اس سے کچھ کم پر بھی قناعت کی گئی اور اسی بناء پر راویان حدیث کی اہمیت اور ساکھ کا تعین ہوا۔

(97) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ راویان حدیث نے ہر حدیث مبارکہ کے تذکرے کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نسل در نسل تمام راویوں کے نام دینے کا معمول اپنا لیا تھا۔ مثلاً البخاری اس طرح روایت کرتے تھے کہ میرے

استاد ابن حنبل نے کہا کہ انہوں نے اپنے استاد عبدالرزاق سے یہ حدیث سنی اور ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے یہ حدیث معمر بن راشد سے سنی جنہوں نے ہمام بن منبہ سے اور ان سے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کی جنہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ حدیث سنی۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان چند سطروں کا ہوتا مگر راویان حدیث کے ناموں کا طویل سلسلہ ہوتا۔ امام بخاریؒ کے مجموعہ حدیث ''صحیح'' (بخاری) کے انداز میں دیگر راویان حدیث کے ہاں بھی یہی معمول تھا مثلاً ابن حنبلؒ کی ''مسند''، عبدالرزاقؒ کی ''مصنف''، معمر کی جامع اور ہمام (بن منبہ) کا ''صحیفہ'' جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں لکھوایا۔ راویان حدیث کی زنجیر تمام مجموعہ ہائے حدیث میں موجود ہے، جو خوش قسمتی سے اصل الفاظ کی صورت میں ہم تک پہنچی ہیں۔ اتنے مستند راویوں کے توسط سے راویوں کی زنجیر کے وسیلے کی موجودگی میں مختلف مفروضے پیش کرنا محض بیوقوفی ہے مثلاً یہ کہنا کہ بخاریؒ نے خود حدیثیں وضع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کر دیں یا یہ کہ خود ہی وہ زنجیر بھی بنالی یا ایسے سنی سنائی باتیں اٹھا کر انہیں احادیث رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) قرار دے دیا۔ (نعوذ باللہ)

حاصل بحث:

(98) احادیث کو محفوظ کرنے کے سہ جہتی طریقے یعنی حفظ کرنے، تحریری شکل میں لانے اور مستند اساتذہ کی زیر نگرانی احادیث کا مطالعہ کرنے کے نتیجے میں ہر طریقہ دوسرے کو مضبوط کرتا ہے، اسلام تہرے، حفاظتی نظام کے ساتھ شروع سے اب تک اپنی اصل حالت میں برقرار رہا اور جیسا کہ قرآن کے بارے میں یہ سچ ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے اسی طرح یہ بھی سچ ہے کہ احادیث سے مراد ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے وہ افعال و اقوال جن کی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموش رہ کر منظوری دی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک پیغمبر کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے مثال کامیابی حاصل کی اور یہ حقیقت ہے کہ 10 ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدان عرفات میں ایک لاکھ 40 ہزار مسلمانوں کے عظیم اجتماع سے خطاب فرمایا۔ یہ

وہ لوگ تھے جو حج پر آئے تھے جب کہ وہ مسلمان ان کے علاوہ تھے جو اس سفر پر نہیں آسکے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے سوانح نگاروں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ایسے صحابہؓ کی تعداد جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے کسی ایک واقعہ کو بیان کیا، ایک لاکھ سے زیادہ ہے، یقیناً اس میں تکرار ناگزیر ہے مگر ایک واقعہ کا کئی راویان حدیث سے بیان اس کے صحیح ہونے کی تصدیق مزید ہے۔ ہمارے پاس (تکرار کو حذف کر کے) تقریباً (10) ہزار احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہیں اور اس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے تمام پہلو شامل ہو گئے ہیں۔ اس میں امت مسلمہ کے لئے دینی اور دنیاوی دونوں کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے رہنمائی اور ہدایت موجود ہے۔

باب نمبر 3

اسلام کا نظریۂ زندگی

(99) کسی معاشرے، قوم یا تہذیب کی قوت حیات یا زندہ رہنے کی اہلیت کا دارومدار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ ان کے ہاں زندگی کا نظریہ کیا ہے اور وہ کس حد تک اس نظریے پر عمل پیرا ہیں۔ فطری طور پر انسان بہت کم اپنے انفرادی فائدے کے سوا کوئی اور بات سوچتا ہے حتیٰ کہ اس کے قریبی رشتہ داروں کا نمبر بھی اس کے بعد ہی آتا ہے تاہم ہر دور میں ایسے لوگ رہے ہیں جن کا رویہ عام انسانوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جب ہم ماضی کی تہذیبوں کا احوال پڑھتے ہیں (اور شاید اب ہم ایک اور تہذیب کی صبح دیکھ رہے ہیں) تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ گو برگزیدہ لوگوں کی ایک تعداد اپنے دور کی تہذیب میں روشنی کے میناروں کا مقام رکھتی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کے ہم عصر دوسرے لوگ محض وحشیوں کی زندگی گزار رہے ہیں بلکہ وہ تہذیبوں کی درجہ بندی میں مختلف درجہ ہائے فضیلت پر فائز ہیں یعنی کچھ اگر زیادہ مہذب ہیں تو دوسرے ذرا اس سے کم، مثال کے طور پر جب فونیشیز (قدیم شامی باشندے) منظر عام پر آئے اور انہوں نے ایک شاندار تہذیب کو پروان چڑھایا تو متعدد دوسری قومیں تھیں جو ان کی طرح مہذب تھیں مگر انہیں اظہار عمل کے لئے مواقع اور میدان میسر نہ ہوئے۔ جب عرب اسلامی تہذیب اپنے عروج پر تھی تو یونانی، رومن، چینی، ہندوستانی اور دوسری قومیں بھی مہذب لوگوں کی تمام خصوصیات سے بہرہ ور تھیں۔ تاہم وہ اپنے زمانے کی ''تہذیب کے آسمان پر چمکنے والی اقوام'' کے مقام تک نہ پہنچ سکیں۔

ہم اپنے زمانے میں ہی دیکھ لیں، اگر امریکہ اور روس اپنی جوہری قوت کے ساتھ دنیا کی صفِ اول کی طاقتیں ہیں تو برطانیہ، چین، فرانس اور جرمن بھی ان سے چند ہی قدم پیچھے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ 20 ویں صدی کے دوسرے نصف میں جب کہ بعض اقوام ترقی میں بہت

آ گے جا چکی ہیں دنیا کے بعض حصے ایسے ہیں جہاں اگر حقیقی طور پر آدم خوری باقی نہیں تو کم از کم وحشیانہ پن ضرور موجود ہے۔

(100) یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ بعض کے ہاں ارتقا کا عمل تیز جب کہ کسی دوسری جگہ سست کیوں ہے۔ایک دور میں جب یونانی ایک شاندار تہذیب کے علمبردار تھے تو جنوبی یورپ میں بربریت کا دور دورہ کیوں تھا اور جب عربوں پر عظمت کا آفتاب کرنیں بکھیر رہا تھا تو روس پر وحشت کیوں چھائی ہوئی تھی یہ صورتحال کئی ادوار میں بہت سے ممالک کو درپیش رہی ہے۔کیا یہ محض حسن اتفاق اور حالات کا نتیجہ تھا یا پھر اس کی وجہ یہ تھی کہ کسی خاص مقام پر اعلیٰ ترین خصوصیات کے حامل افراد اور شخصیات نے جنم لے لیا کہ ان کے مقابل دوسرے لوگ پس منظر میں چلے گئے؟ اس صورتحال کی شاید مزید توضیحات بھی ممکن ہوں، کثیر الجہت اور کثیر الوجوہ، یا ایسے حالات پیدا ہو گئے جن کے نتیجے میں کچھ لوگوں کو کامیابیاں اور کامرانیاں ملیں اور بعض کو ناکامیاں بلکہ بعض کا وجود ہی ختم ہو گیا۔

(101) ایک اور سوال بدستور جواب طلب ہے کہ بعض اوقات ایک عارضی عظمت کے بعد لوگ کیوں نیم وحشیانہ نہ سہی مگر قعر مذلت میں گرنے کی راہ اختیار کر لیتے ہیں؟

(102) ہماری تجویز ہے کہ متعلقہ ادوار میں اسلام کے حوالے سے ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کے لئے تحقیق کی جائے اور اگر ممکن ہو تو اس (اسلام) کی بقا کے امکانات کو بھی زیر بحث لایا جائے۔

(103) اگر ہم ابن خلدون پر یقین کریں تو حیاتیاتی عنصر ایک اہم وجہ ہے۔ایک پیڑھی (نسلی سلسلہ) کے اختتام پر نسل انسانی، قوت حیات کھو بیٹھتی ہے اور اس میں نئی روح پھونکنے کے لئے کم از کم ان مردوں کے خاندان میں تبدیلی ناگزیر ہوتی ہے جو ارباب حل وعقد کے مقام پر فائز ہوں۔

اس نسلی نظریہ کو اگر عالمانہ مبالغہ بھی تصور کیا جائے تو بھی نسلی تہذیبوں اور تبدیلی مذہب کو تسلیم نہ کرنے والے ادیان پر اس کے اثرات مسلمہ ہیں مگر خوش قسمتی سے اسلام زوال کے اس نظریے سے متاثر نہیں ہوتا کیونکہ اس کے ماننے والے ہر نسل میں پائے جاتے ہیں اور اس کے فروغ کا سلسلہ زیادہ یا کم بہرحال دنیا میں ہر جگہ جاری رہتا ہے۔اس کے علاوہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اسلام نے امت مسلمہ کے اندر نسلی تعصب کا کم وبیش خاتمہ کر دیا ہے۔جس کے باعث مسلمان

بلا تامل اپنے لیڈروں کی اطاعت کرتے ہیں خواہ ان کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو اور قرآنی حکم کے تحت غلامی کو جس طرح بتدریج ختم کیا گیا یہ اسکی ایک روشن مثال ہے اور تاریخ میں ان گنت ایسی مثالیں موجود ہیں کہ آزاد کردہ غلاموں کے کئی خاندان نسل درنسل مسلمان رعایا کے حکمران رہے۔

(104) کسی بھی تہذیب کی زندگی اور موت کا انحصار اس کی بنیادی تعلیمات کے معیار پر ہے۔ اگر یہ اپنے پیروکاروں کو دنیا تیاگ دینے کا سبق دیتی ہے تو روحانی سطح پر بلاشبہ اس کو فروغ حاصل ہوگا مگر انسان کے دوسرے حصوں یعنی اس کے جسم اور اس کی ذہنی صلاحیتوں کو آزادانہ اور فطری انداز میں کام کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ جس سے ان پر بہار آنے سے پہلے ہی ان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی تہذیب زندگی کے صرف مادی پہلوؤں کو مرکز توجہ بنائے گی تو انسان صرف مادی مفادات کو ہی مطمح نظر بنالے گا جس سے زندگی کے دوسرے پہلو اور معاملات متاثر ہوں گے۔ اور یہ تہذیب بالآخر خود اپنے ہی ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جائے گی۔ اس لئے کہ مادیت پرستی خود پسندی اور دوسروں کے حقوق کا احترام نہ کرنے کے جذبات کو جنم دیتی ہے۔ اس سے آپ کے دشمن اور حریف پیدا ہوتے ہیں جو حساب چکانے کے لئے موقع کے انتظار میں رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں۔ دو ڈاکوؤں کی مشہور کہانی تو سب کو یاد ہے کہ انہوں نے کہیں سے مال اڑایا۔ بھوک لگی تو ایک سامان لینے شہر گیا اور دوسرا آگ جلانے کے لئے لکڑیاں جمع کرنے لگا۔ اب دونوں کے دل میں فتور پیدا ہو گیا کہ دوسرے سے چھٹکارا پا کر پورے مال کو کیوں نہ ہڑپ کیا جائے چنانچہ جو کھانا پکانے کا سامان لینے شہر گیا تھا اس نے کھانے میں زہر ملا دیا تا کہ دوسرا کھا کر مر جائے گا اور مال اس کے قبضہ میں آ جائے گا جب کہ اس کا ساتھی بھی بری نیت کے ساتھ اس کا انتظار کر رہا تھا جونہی وہ سامان لے کر آیا گھات میں بیٹھے اس کے ساتھی نے حملہ کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ پھر اس کے لائے ہوئے سامان سے کھانا تیار کر کے کھایا تو زہر نے اسے بھی اپنے دوست کے پاس پہنچا دیا۔

(105) کسی تہذیب میں ایک اور بنیادی خامی بھی ہو سکتی ہے اگر اس کی تعلیمات میں آگے بڑھنے اور حالات کے مطابق ڈھلنے کی فطری صلاحیت موجود نہ ہو اور چاہے ایک دور یا ایک مخصوص وقت میں اس کی تعلیمات کتنی ہی اعلیٰ کیوں نہ ہوں مگر ضروری نہیں کہ ایک اور دور کے لئے بھی یہ ایسی ہی سودمند ثابت ہوں بلکہ ایسی تعلیمات سے چمٹے رہنا، آنے والی نسلوں کے لئے مہلک ثابت ہوگا۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے بخوبی ہو جائے گی۔

جب ابھی بجلی کی روشنی کا وجود نہیں تھا اور عبادت گاہوں کے اخراجات کے لئے کوئی مستقل ذرائع آمدنی بھی نہیں تھے تو کسی عبادت گاہ میں روشنی کے لئے موم بتی یا دیا جلانا ثواب اور نیکی کا کام تھا اور کسی کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا تھا کہ کوئی اللہ کی نافرمانی پر توبہ کے کفارے کے طور پر یا کسی انسان کے خلاف کسی جرم کے ازالے کے لئے عبادت گاہ میں موم بتیاں جلا کر روشنی کرے، مگر اس صورت میں کہ کوئی مقام جو پہلے ہی برقی قمقموں سے جگمگا رہا ہے وہاں موم بتی جلانا تو اسراف اور وسائل کے ضیاع کے زمرے میں ہی آئے گا۔ آیئے ہم ان حالات کی روشنی میں اسلام کا مطالعہ کریں۔

اسلام کا نظریہ:

اسلام "دین اور دنیا" دونوں کو اہمیت دیتا ہے اور قرآن مجید میں یہ دعا مانگنے کا حکم ہے "رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً" (201:2) ترجمہ: اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھلائی (نعمتیں) عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی (نعمتیں) عطا فرما۔"

اسلام میں دونوں مکاتب فکر کے انتہا پسندوں کے لئے تسکین کا سامان نہیں یعنی روحانی شدت پسند (جو دنیاوی چیزوں کو ترک کر کے نفس کشی کو مذہبی فریضہ کے طور پر اپنا لیتے ہیں) اور مادیت پرستی میں انتہا کو چھو لینے والے (جو دوسروں کے حقوق پر یقین ہی نہیں رکھتے) مگر یہ بنی نوع انسان کی اکثریت کا مذہب بن سکتا ہے جو درمیانی راستہ اختیار کرتے ہوئے جسم اور روح دونوں کے تقاضوں کو ایک ساتھ پورا کرنے کے خواہاں ہوں اور اسی سے انسان میں بحیثیت مجموعی ایک خوبصورت توازن قائم ہو سکتا ہے۔ اسلام نے انسان کے ان دونوں تقاضوں کی تکمیل پر زور دیا ہے اور کہا ہے کہ کسی ایک کے لئے دوسرے کی قربانی نہ دی جائے۔ اگر اسلام نے کچھ روحانی فرائض عائد کئے ہیں تو ان میں مادی مفادات بھی پوشیدہ ہیں اور اگر اس نے کسی دنیاوی ضرورت کی تکمیل کی اجازت دی ہے تو یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس طرح یہ عمل روحانی تسکین کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے، درج ذیل امثال سے یہ دلیل مزید واضح ہو جائے گی۔

(107) اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ روحانی اعمال اور مشقوں کا مقصد ذات واجب الوجود کی جو ہمارا خالق اور پالنے والا ہے قربت اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس لئے انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ "اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگ لے۔" جیسا کہ قرآن کا حکم ہے (138:2) اور یہ

اس لئے کہ وہ اس کیفیت تک پہنچ جائیں کہ وہ دیکھیں تو اس کی یعنی اللہ کی آنکھ سے، بولیں تو اس کی زبان سے، اور خواہش کریں تو اس کی رضا کے ساتھ، جیسا کہ ایک حدیث پاک میں فرمایا گیا۔ مختصر یہ کہ وہ انسان مکمل طور پر اس طرح ڈھل جائے کہ اس کا ہر فعل اللہ کی مرضی کے تابع ہو جائے بلکہ یہاں تک کہ محدود انسانی صلاحیتوں کے باوجود اس کی نقل کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ مومن نے روزہ اسی وقت رکھنا ہے جس کا حکم قرآن نے دیا ہے کیونکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ اللہ کے حکم کی تعمیل بجائے خود پرہیزگاری ہے مگر روزہ سے جسم میں کمزوری آتی ہے مگر اس سے مادی خواہشات کم ہوتی اور روح کو قوت حاصل ہوتی ہے۔ روزہ دار ایک روحانی سربلندی محسوس کرتا ہے اور اللہ کو یاد کرتا ہے اور اس کی انسان کو بخشی گئی تمام نعمتیں ذہن میں آتی ہیں اور اسے بہت سی روحانی خوشیاں حاصل ہوتی ہیں۔

تاہم روزہ سے مادی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ بھوک اور پیاس کے وقت غدودوں سے جو ترشے خارج ہوتے ہیں وہ معدے میں پائے جانے والے کچھ جراثیم کو مارتے ہیں۔ اس کے علاوہ روزہ دار میں بحران کے موقع پر تنگی ترشی برداشت کرنے کی طاقت بھی پیدا ہوتی ہے اور وہ ہر قسم کے حالات میں اپنے معمول کے فرائض ادا کرتا رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص مادی فوائد کے حصول کے لئے روزہ رکھتا ہے تو اس کی کوئی روحانی اہمیت نہیں ہے لیکن اگر وہ اللہ کی رضا کے لئے روزہ رکھتا ہے تو اس کے مادی فوائد بھی اس کو اضافی طور پر حاصل ہو جاتے ہیں۔ تفصیلات میں جائے بغیر امر واقعی ہے کہ اسلام کے تمام روحانی اعمال وافعال اسی طرح روحانی اور مادی دونوں فوائد کے حامل ہیں۔ عبادات کو لے لیں چاہے انفرادی ہیں یا اجتماعی، حج بیت اللہ ہو یا خیرات و صدقات اور فرائض کے ساتھ ساتھ دوسرے مذہبی اور روحانی اعمال ہوں سب کے فوائد دوہرے ہیں۔ اگر کوئی شخص کوئی عمل صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتا ہے تو اس کو دو فائدے حاصل ہوں گے یعنی روحانی فائدے تو ملتے ہی ہیں مادی فوائد بھی ضائع نہیں ہوتے مگر اگر کوئی شخص وہی عمل صرف دنیاوی مقصد کے لئے کرتا ہے تو وہ مقصد تو اسے حاصل ہو جاتا ہے لیکن روحانی فائدے یکسر ضائع ہو جائیں گے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

”یقیناً اعمال کا دارومدار مقاصد اور ارادوں پر ہے۔“ (بخاری، مسلم)

(108) اب بات ہو جائے مکمل طور پر ایک دنیاوی معاملے کی مثلاً ٹیکس یا جنگ، ٹیکس کی ادائیگی حکومت کو کی جاتی ہے اور یہ حیرت انگیز نہیں کہ اسلام نے ٹیکس کی ادائیگی کو دین کے پانچ

بنیادی ارکان کا حصہ قرار دیا ہے یعنی ایمان، نماز، روزہ اور حج کے ساتھ زکوٰۃ [1] کی ادائیگی لازمی قرار دی ہے۔

اس کی اہمیت بہت گہری ہے۔اس کی ادائیگی میں روحانی اور مادی دونوں پہلو شامل ہو گئے ہیں کہ زکوٰۃ ادا کرنے والا اسے بیگار سمجھ کر یا سماجی فریضہ کے طور پر بھی ادائیگی نہیں کرتا بلکہ صرف اللہ کی رضا جوئی کے لئے کرتا ہے۔ جب ٹیکسوں کی ادائیگی کو ذہن میں مقدس فریضہ تصور کر لیا جائے کہ جسے اللہ تعالیٰ نے فرض قرار دیا ہے جس سے کچھ بھی چھپایا نہیں جا سکتا اور جو ہمیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور حساب لینے پر قادر ہے تو تصور کیا جا سکتا ہے کہ مسلمان کس احتیاط اور احساس ذمہ داری کے ساتھ یہ ٹیکس ادا کرے گا۔

اسی طرح اسلام میں اللہ کے راستے کے سوا جنگ کی ممانعت ہے اور یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ اللہ کی راہ میں لڑنے والے سپاہی کا طرز عمل زیادہ انسانی ہو گا اور جس مقصد کے لئے وہ اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا ہے اس میں وہ کوئی دنیاوی مفادات پیش نظر نہیں رکھے گا۔ دنیاوی ذمہ داریوں میں روحانیت کا رنگ شامل کرنے سے اسلام کا مقصد سوائے انسان کے روحانی پہلو کو مضبوط کرنے کے اور کچھ نہیں جو اس طرح مادی معاملات میں بھی محض دنیاوی فائدوں سے بے نیاز ہو کر اللہ کی رضا جوئی کو ہی منتہائے مقصود بنا لیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''دکھاوا شرک کے مترادف ہے۔''

اس کی وضاحت الغزالی نے اس طرح کی ہے: اگر کوئی شخص محض دکھاوے کے لئے روزہ رکھتا ہے تو یہ شرک ہے کیونکہ یہ عبادت اللہ کی رضا جوئی کے لئے نہیں بلکہ اپنے نفس کے لئے ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی مرد بیوی سے ازدواجی رشتہ بھی حصول لذت نہیں بلکہ اللہ کی طرف کی طرف سے عائد ایک فرض سمجھ کر قائم کرتا ہے تو یہ بھی پرہیزگاری اور اللہ کی اطاعت کے زمرے میں آتا ہے اور وہ اللہ کی رضا اور انعام کا مستحق قرار پاتا ہے۔(ابن حنبل 187.167.154)

---

1. قرآن کی اصطلاح میں زکوٰۃ کا مطلب خیرات نہیں ہے یہ زرعی پیداوار معدنیات، تجارت، مویشیوں کے ریوڑوں پر ٹیکس ہے۔زکوٰۃ اس ٹیکس کی اصطلاح ہے۔اس کے اخراجات کی مدوں کی تفصیل بھی قرآن میں دی گئی ہے۔(60:9) تفصیلات کے لئے دیکھئے اس کتاب کا باب (10)۔

(109) زندگی کے اس ہمہ گیر تصور کا بدیہی نتیجہ یہ حقیقت ہے کہ قرآن حکیم اکثر مقامات پر ''ایمان لاؤ اور اچھے کام کرو'' کا دوہرا حکم سناتا ہے کیونکہ عمل کے بغیر محض ایمان کے اعلان کی کوئی اہمیت نہیں۔ اسلام جتنا زور ایک یعنی ایمان پر دیتا ہے اتنا ہی دوسرے یعنی عمل پر دیتا ہے۔ اللہ پر ایمان لائے بغیر نیکی کے کام کرنا یقیناً معاشرے کے لئے برے کام کرنے کی نسبت پسندیدہ ہے مگر روحانی نقطہ نظر سے اللہ پر ایمان لائے بغیر اچھے کام آخرت میں بخشش کی ضمانت نہیں بن سکتے۔

(110) مگر نیکی اور برائی میں تمیز کیسے کی جائے؟ سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قانون ہے جو ہمارے لئے معیار اور کسوٹی ہے مگر سب سے آخر میں انسان کا اپنا ضمیر فیصلہ کر دیتا ہے کہ اچھائی کیا ہے اور برائی کیا ہے۔ جب کوئی مسئلہ درپیش ہو تو اگر آپ خود اس کی اہلیت رکھتے ہیں تو اسلامی قوانین سے خود رہنمائی لے لیں ورنہ پھر علماء اور فقہاء سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔ یہ امر پیش نظر رہے کہ عالم یا فقیہہ کا جواب اس کے سامنے پیش کئے گئے حقائق کی بنیاد پر ہوگا اور اگر اہم حقائق اس سے پوشیدہ رکھے گئے چاہے یہ جان بوجھ کر ہو یا سہواً، تو اس کے نتیجے میں اگر ناانصافی ہو جائے تو اس کا الزام قانون پر نہیں لگایا جا سکتا۔ اس حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان پاک ہے:

> ''اے لوگو! جو شکایات میرے سامنے آتی ہیں، میں ان پر فیصلہ پیش کردہ حقائق کی بنیاد پر کرتا ہوں اور اگر ناکافی حقائق کی بناء پر میرا فیصلہ اس کے حق میں چلا جائے جو اس کا مستحق نہیں تو وہ جان لے کہ میں نے اس کو جہنم کا ایک حصہ دے دیا۔'' (بخاری، مسلم)

اسلام کے نظام عدل کے ایک معروف اصول میں بھی یہی کہا گیا ہے کہ:

> ''اپنے ضمیر سے بھی مشورہ کرو چاہے مفتی تمہیں سند جواز بھی عطا کر رہا ہو۔''
>
> (مفہوم از حدیث، روایت ابن حنبلؒ اور الدارمی)

(111) دوسروں کو یکسر نظرانداز کر کے صرف اپنی ذات کے بارے میں سوچنا انسانی نہیں حیوانی رویہ ہے جب کہ اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد دوسروں کا بھی خیال رکھنا بھی درست ہے تاہم قرآن میں ان لوگوں کی تحسین کی گئی ہے۔

''بلکہ خود اپنے اوپر انہیں (دوسروں کو) ترجیح دیتے ہیں گو خود کو کتنی ہی سخت حاجت ہو۔'' (9:59)

بظاہر یہ محض پسندیدگی کا اظہار ہے فرض نہیں کیا گیا۔ اگر کوئی اس پر عمل نہیں کر سکتا تو وہ گناہ گار قرار نہیں پائے گا۔ ہم اس ضمن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معروف حدیث کا بھی حوالہ دے سکتے ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''تم میں بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں سے نیک برتاؤ کرے۔''

(112) قرآن مجید میں دی گئی ہدایت اسلام کی امتیازی خصوصیات کا حصہ ہے۔ ایک ارشاد ربانی ملاحظہ ہو:

''اور اپنے رب کی نعمتوں کو بیان کرتا رہ۔'' (11:93)

''اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے اپنی نعمتوں کا اظہار پسند کرتا ہے۔''

اس حوالے سے ایک حدیث نبویؐ (بہ روایت ترمذی) میں ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ اپنی مخلوقات سے اپنی نعمتوں کا اظہار سننا پسند کرتا ہے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد ایک واقعہ سے منسوب ہے کہ ایک شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو وہ بوسیدہ لباس میں ملبوس تھا حالانکہ وہ کھاتا پیتا شخص تھا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ ایسا کیوں کیا تو اس نے جواب دیا کہ اس نے اپنی یہ ہیئت کذائی کنجوسی کے سبب نہیں بلکہ خدا خوفی کے سبب بنائی ہے کیونکہ وہ ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنا اپنی ذات سے اہم سمجھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کو پسند نہیں فرمایا اور کہا کہ ایثار کی ایک حد ہونی چاہیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا (روایت ابوداؤد) ''جب اللہ تعالیٰ نے تم کو وسائل عطا فرمائے ہیں تو اس کے آثار تمہارے جسم پر نظر آنے چاہئیں۔''

قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر ارشاد ہے:

''اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تجھے دے رکھا ہے اس میں سے آخرت کے گھر کی تلاش بھی رکھ اور اپنے دنیوی حصے کو بھی نہ بھول۔'' (77:28)

اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ انسان کام کاج چھوڑ کر دوسروں پر بوجھ بن کر بیٹھ جائے بلکہ اس کے برعکس ہر شخص پر لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو پورے طور پر بروئے عمل لا کر اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ نعمتوں کو حاصل کرے اور جو ضروریات سے زائد ہو جائے وہ ان لوگوں کو دے دے جن کے پاس ضروریات زندگی کم ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا واضح فرمان ہے:

"یہ بہتر ہے کہ تم اپنے پسماندگان کے لئے چھوڑ کر جاؤ تا کہ وہ فراخی کی زندگی گزاریں نہ کہ دوسروں سے مانگنے پر مجبور ہو جائیں۔" (بخاری)

اسلام انسان پر روزمرہ کی متعدد ذمہ داریاں ڈالنے کے باوجود کسی قسم کی نفس کشی یا اپنے آپ کو خوامخواہ کسی سختی میں ڈالنے کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ قرآن ایسا رویہ اپنانے والوں کو سرزنش کرتا ہے۔

"آپ فرمایئے کہ اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے اسباب زینت کو، جن کو اس نے اپنے بندوں کے واسطے بنایا ہے اور کھانے پینے کی حلال چیزوں کو کس شخص نے حرام کیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے کہ یہ اشیاء اس طور پر کہ قیامت کے روز خالص ہوں گی، اہل ایمان کے لئے، دنیوی زندگی میں مومنوں کے لئے بھی ہیں۔ ہم اسی طرح تمام آیات کو سمجھ داروں کے واسطے صاف صاف بیان کرتے ہیں۔" (32:7)

ایسی چیزیں جو اللہ کے قانون کے تحت جائز ہیں ان سے ممنوع چیزوں کی طرح اجتناب کر کے نفس کو مارنا پرہیزگاری نہیں۔

اللہ پر ایمان:

انسان کی یہ کوشش تو ہمیشہ رہی ہے کہ وہ اپنے خالق کو پہچانے تا کہ وہ اس کی اطاعت کر سکے اور اس مقصد کے لئے ہر دور اور تہذیب کے بہترین مذہبی پیشواؤں نے بعض قواعد اخلاق مرتب کئے ہیں۔ ابتدائی دور کے لوگ طاقت اور خدائی کرم اور بخشش کے مظاہر کی پوجا کیا کرتے تھے اور اس سے ان کا مقصد در اصل خالق کی خوشنودی ہی تھا۔ بعض قومیں اچھائی اور برائی کے الگ

الگ خداؤں پر یقین رکھتی تھیں۔ اور انہیں اس بات کی پرواہ نہیں تھی کہ ایسا ہونے کی صورت میں دونوں خداؤں میں باہم جنگ وجدل شروع ہو جائے گی اور پھر ایسے بھی ہیں جنہوں نے خدا کو پراسراریت کے رنگ میں رنگ دیا ہے جس سے اللہ تعالیٰ کا وجود ہی پراسراریت کی زد میں آ گیا ہے اور بعض وہ ہیں جو ایسی علامات، تراکیب یا معنی خیز حرکات اپنا لیتے ہیں کہ ان کے دینی نظریات اور بت پرستی یا شرک میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

(114) اس میدان میں اسلام کی اپنی انفرادیت اور خصوصیت ہے اور یہ خدا کی مکمل وحدانیت پر یقین رکھتا ہے اور اس نے جو عبادات فرض کی ہیں ان میں کسی تصویر کی گنجائش ہے نہ علامت کی۔ (بت پرستی یا زمانہ قبل از تاریخ میں مظاہر پرستی تصور کرتے ہوئے) اسلام کے مطابق خدا کا وجود انسانی فہم وادراک سے ماورا ہے اور اس کی تجسیم کا کوئی تصور نہیں ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

"اس کو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی۔" (103:6)

حالانکہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے ہے، ہر جگہ موجود اور ہر ضرورت سے بے نیاز۔

(قرآن میں حوالے 7:58,16:50)

انسان اور اس کے خالق کے درمیان رابطے براہ راست اور انفرادی ہیں، ان کے درمیان کسی وسیلے یا "وچولے" کی ضرورت نہیں حتیٰ کہ ولیوں کے ولی یعنی پیغمبر بھی محض رہنما اور پیغام بر ہیں۔ باقی یہ ہر انسان کی ذاتی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ اپنے لئے کس عقیدے کا انتخاب کرتا ہے۔ ہر انسان اپنے اعمال وافعال کے لئے اللہ کے سامنے براہ راست جوابدہ ہے۔

(115) اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام ہر فرد کی شخصیت کو ابھارنے کا خواہاں ہے تاہم اسلام انسان کے اندر موجود کمزوریوں کو تسلیم کرتا ہے کیونکہ اس کے خمیر میں نیکی اور برائی دونوں کے کرنے کی صلاحیت ڈال دی گئی ہے تاہم اسلام اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ اس میں پیدائشی طور پر گناہ کی صلاحیت موجود ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتو پھر یہ اس کے ساتھ ناانصافی ہے۔ اگر آدم (علیہ السلام) سے گناہ سرزد ہوا تو اس کی ذمہ داری ان کی نسل پر تو نہیں ڈالی جا سکتی۔ ہر شخص انفرادی طور پر اپنے کیئے کا ذمہ دار ہے۔

(116) اپنی کمزوریوں کے سبب ممکن ہے کوئی شخص اللہ یا ساتھی انسانوں کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب کرے اور اصولی طور پر ہر جرم کی سزا بھی ملنی چاہئے مگر اسلام معافی کے امکان کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ جس کے ساتھ توبہ اور کفارہ منسلک ہے۔ جہاں تک افراد کے خلاف جرائم کا تعلق ہے

جہاں تک ممکن ہو اس کی معافی تلافی کرائی جائے۔ اس میں ہو سکتا ہے کہ جس سے زیادتی ہوئی وہ فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے معاف کر دے یا اس سے جو چیز چھینی گئی وہ واپس کر دی جائے یا اس کے بدلے میں کوئی چیز دے دی جائے۔ بہر حال اس کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں جہاں تک اللہ کے خلاف جرائم کا تعلق ہے۔ ان کی مجرم کو سزا ملے گی یا پھر اللہ اپنی رحمت سے معاف بھی کر سکتا ہے۔ اسلام میں اس بات کا کوئی تصور نہیں کہ خدا پہلے کچھ بے گناہوں کو سزا دے تاکہ (یہ سزا دیکھ کر) جو گناہ گار تائب ہو جائیں انہیں معاف کر سکے کیونکہ ایک کے گناہ کی سزا دوسرے کو دینا خدائی انصاف کے منافی ہے۔

معاشرہ:

(117) اگرچہ اسلام انسان سے معاملات بحیثیت فرد کرنے کی کوشش کرتا ہے تاہم یہ سماجی اجتماعیت کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے اور یہ حقیقت اس کی تمام تعلیمات میں موجود ہے چاہے ان کا تعلق مذہب سے ہو یا دنیاوی معاملات سے۔ اسی طرح عبادت میں اجتماعیت کا حکم ہے (تاہم نمازوں میں مجبوراً انفرادی نماز کی گنجائش ہے مگر نماز جمعہ یا عیدین میں انفرادی نماز کا کوئی تصور نہیں) حج ایک اور واضح مثال ہے کہ اس میں دنیا کے ہر کونے سے آنے والے مسلمان ایک مقام پر جمع ہوتے ہیں۔ روزے میں اجتماعیت کے پہلو کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کے لئے ایک ہی ماہ میں روزے رکھنے فرض کئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک خلیفہ کو حاکم بنانے اور ضرورت مندوں کے لئے زکوٰۃ ٹیکس کی ادائیگی وغیرہ بھی اجتماعیت کی ہی دلیل ہیں اور یہ بات تو مسلمہ ہے کہ اجتماعیت یا معاشرے میں جو قوت اور طاقت ہے وہ افراد میں انفرادی طور پر نہیں آ سکتی۔

(118) اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے مختلف افراد کو غیر یکساں صلاحیتوں سے نوازا ہے ایک ہی والدین کے دو بچے، ایک ہی جماعت کے دو طالب علم ہمیشہ ایک جیسی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک نہیں ہوتے۔ تمام زمینیں ایک جیسی زرخیز نہیں ہوتیں۔ آب و ہوا میں بھی فرق ہوتا ہے۔ ایک ہی جنس کے دو درخت یکساں مقدار اور معیار کی پیداوار نہیں دیتے۔ اس فطری عمل کی بنا پر اسلام ایک طرف بنیادی طور پر سب کو برابر قرار دیتا ہے تو دوسری طرف افراد کی ایک دوسرے پر برتری کو بھی تسلیم کرتا ہے حالانکہ سب ایک ہی خدا کی مخلوق ہیں اور یہ برتری مادی نہیں جو اللہ تعالیٰ کی

تعریف کی مستحق ٹھہرتی ہے بلکہ اللہ کی نظر میں خدا خوفی اور پرہیزگاری کی بنا پر اسے درجہ عطا ہوتا ہے۔ بہرحال دنیا کی یہ زندگی عارضی ہے اس لئے ایک انسان اور حیوان کے طرز عمل میں فرق تو ہونا چاہیے۔

قومیت:

(119) اسلام پیدائش اور مشترکہ خون کی تنگ بنیاد کو اتحاد و یکجہتی کے عنصر کے طور پر مسترد کرتا ہے۔ اپنی نسل یا جنم بھومی سے محبت اور وابستگی بلاشبہ فطری جذبہ ہے تاہم نسل انسانی کے مفاد کا تقاضا ہے کہ دوسرے انسانی گروہوں کے لئے برداشت اور رواداری کا مظاہرہ کیا جائے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں وسائل کی جو تقسیم دست قدرت نے کی ہے اس میں دنیا کی مختلف قوموں کو ایک دوسرے پر انحصار کا سبق دیا گیا ہے۔ اس لئے ''جیو اور دوسروں کو (بھی) جینے دو'' کے مقولے پر عمل ناگزیر بنا دیا گیا ہے۔ ورنہ انتقام در انتقام کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جائے گا اور زبان، نسل اور رنگ کی بنیاد پر قومیں تباہ ہو جائیں گی۔

اس حوالے سے اسلامی نظریہ ترقی پسندانہ ہے۔ اور اس کی بنیاد مکمل طور پر ہر شخص کے اپنی مرضی کے انتخاب پر ہے کیونکہ اس میں نسل زبان یا علاقے کے امتیاز کے بغیر ایک ہی نظریے پر ایمان رکھنے والوں کے اتحاد کا پیغام دیا گیا ہے اور چونکہ دوسرے انسانی گروہوں کا خاتمہ یا انہیں غلام بنانے کی ممانعت کر دی گئی اس لئے واحد صورت گھل مل کر رہنے کی رہ جاتی ہے۔ اگر کسی معاشرے میں ایک عقیدے کے پیروکار نہ ہوں تو ان کے آپس میں گھل مل کر رہنے کا کون سا ذریعہ ہو سکتا ہے؟ جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ نظریہ اسلام میں بدن اور روح دونوں کے تقاضے ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں رواداری اور برداشت کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسلام کا یہ واضح اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مختلف زمانوں میں مختلف قوموں میں اپنے پیغمبر بھیجے اور خود اس کا محض یہ دعویٰ ہے کہ ظہور اسلام کا مقصد اللہ تعالیٰ کے اسی ابدی پیغام کی تجدید اور بحالی کے علاوہ کچھ نہیں جو اس کے پیغمبر وقتاً فوقتاً لے کر آتے رہے۔ اسلام میں مذہبی عقائد دوسروں پر جبراً مسلط کرنے کی سختی سے ممانعت ہے اور چاہے یہ کتنا ہی ناقابل یقین معلوم ہو مگر اسلام میں ایک مذہبی فریضہ کے طور پر اسلامی ریاست میں آباد غیر مسلموں کو خود مختاری دینے کا

پابند کیا گیا ہے۔ قرآن، حدیث اور تمام ادوار کی روایات کے مطابق غیر مسلموں کو اپنے قوانین، اپنی عدالتیں، اپنے ججز رکھنے کا حق حاصل ہے جس میں مسلمان حکام کا کوئی عمل دخل نہ ہو چاہے یہ مذہبی معاملات ہوں یا سماجی (مزید تفصیل کتاب ہذا کے باب 12 پیرا گراف نمبر 406 میں)۔

اقتصادی نقطۂ نظر:

(120) اقتصادی معاملات کی سماجی اہمیت انتہائی توجہ کی متقاضی ہے اور قرآن کا یہ اعلان کوئی مبالغہ آرائی نہیں "مال کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری گزران کے قائم رکھنے کا ذریعہ بنایا ہے۔" (5:4)

اگر ہر شخص صرف اپنی ذات کے بارے میں ہی سوچنے لگے تو معاشرہ سنگین خطرات میں گھر جائے گا اور اس کی وجہ بڑی سادہ ہے کہ ہر دور میں بہت کم افراد امیر مگر بیشتر غریب ہوتے ہیں اور بقا کی جدوجہد میں ایسا وقت آ سکتا ہے کہ بھاری غریب اکثریت چھوٹی سی امیر اقلیت کا خاتمہ کر دے۔ بہت سی محرومیاں برداشت ہو سکتی ہیں مگر مستقل روگ اور فاقہ کشی کی نہیں۔ اس معاملے پر اسلام کا نقطہ نظر بالکل واضح ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ قومی دولت کی مستقل اور بار بار تقسیم ہو اور یہ گردش میں رہے۔ اس کے علاوہ غریبوں کو ٹیکس کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر کے اس کی ذمہ داری امیروں پر ڈالی گئی ہے تا کہ کم وسیلہ لوگوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔

اسلام کے قوانین کے تحت وراثت کی تقسیم لازمی ہے۔ جب کہ قرضوں پر سود کی وصولی اور قریبی رشتہ داروں کو ان کے حصے میں آنے والی وراثت سے محروم کرنے کی ممانعت کر کے دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کو بھی روک دیا گیا۔ اس کے علاوہ سرکاری خزانہ کے اخراجات کے قوانین میں یہ امر ملحوظ رکھا گیا کہ اس آمدنی کے حصہ داروں میں غربا کو سرفہرست رکھا جائے۔ اگر اس اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کے تحت کسی خطے، دور اور حالات کے مطابق وسائل میں اونچ نیچ اور حصول دولت کے لئے مختلف ذرائع اختیار کرنا جائز ہے بشرطیکہ مقصد حاصل کر لیا جائے۔ آزاد معیشت میں مسابقت اس حد تک قابل برداشت ہے کہ یہ معاشی طور پر کمزور طبقات کے گلے کاٹنے تک نہ پہنچ جائے۔ اگر مارکیٹ کے اُتار چڑھاؤ کے پیش نظر ضروری ہو تو اس سارے عمل کی منصوبہ بندی بھی جائز ہے۔ بہر صورت مال اور توانائی کے ضیاع سے بچا جائے اور ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جو وقت کے تقاضوں کے مطابق ہوں۔

آزادیٔ عمل اور تقدیر:

(121) یہ بات ہمیں انسان کی آزادیٔ عمل کے پیچیدہ مسئلے کی طرف لے جاتی ہے اور یہ دائمی الجھن محض منطق سے حل نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ انسان جو بھی اعمال کرتا ہے اس میں وہ مکمل طور پر آزاد ہے تو یہ بات اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر زد ڈالتی ہے۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ اس کی تقدیر میں لکھ دیا ہے وہی کچھ وہ کرے گا تو پھر انسان کو اپنے افعال کا ذمہ دار کیوں کر ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس معاملے کو موضوع بحث بنانے سے منع فرمایا ہے کہ ''تم سے پہلی قوموں کو ایسی بحثوں نے گمراہی میں ڈال دیا۔'' (روایت ابن حنبل، ترمذی اور دیگر) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں معاملات یعنی اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور انسان کی ذمہ داری کو الگ الگ کر دیا ہے۔ درحقیقت محبت کے لئے کسی منطق کی ضرورت نہیں اور مسلمان اپنے خالق سے محبت کرتا ہے اور وہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتا کہ خدا کی صفات میں کوئی کمی یا نقص بھی پایا جا سکتا ہے۔ خدا نہ صرف بدرجہ اولیٰ حکیم اور بڑی طاقت والا ہے بلکہ رحیم اور عادل بھی ہے۔ اسلام نے آسمانی معاملات کو جو خدائی صفات کا حصہ ہیں انسان کے دنیاوی معاملات سے الگ رکھا ہے اور مؤمنین کو اعمال کا حکم دیا ہے اور چونکہ خدائی ارادہ انسان سے پوشیدہ رکھا گیا ہے اس لئے انسان پر یہ لازم کیا گیا ہے کہ وہ ابتدائی ناکامی سے مایوس نہ ہو بلکہ بار بار کوشش کرے حتیٰ کہ مقصد حاصل ہو جائے یا پھر اس کا ناممکن ہونا یقینی ہو جائے۔

تقدیر کا اسلامی تصور مؤخر الذکر معاملے میں موجود ہے یعنی انسان کیلئے یہ تسلی و تشفی کہ اسی میں اللہ کی رضا ہے اور اُخروی اور ابدی نجات کے مقابلے میں اس دنیا کی کامیابی اور ناکامی کی ہرگز کوئی اہمیت نہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ انسان کو حسن نیت کی بنیاد پر پرکھتا ہے نتائج یا عمل کی بنیاد پر نہیں۔

(122) قرآن کے مطابق یہی وہ سچائی ہے جو ہمیشہ اس کے پیغمبروں پر نازل کی جاتی رہی۔

''کیا اسے اس چیز کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ علیہ السلام کے اور وفادار ابراہیم (علیہ السلام) کے صحیفوں میں تھی کہ کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور ہر انسان کے لئے وہی کچھ ہے جس کی کوشش خود اس نے کی

اور یہ کہ بے شک اسکی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی پھر اسے پورا پورا
بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ آپ کے رب کی طرف ہی پہنچنا ہے۔"

(42-36:53)

ہم (انسان) صرف اس لئے نوازے گئے کہ ہم نے ان اعمال کے بدلے بھی سزا کو تسلیم کرلیا جو ہماری تقدیر میں لکھے ہوئے ہیں اور یہ انعام وہ خدائی امانت ہے جو ہمیں سونپی گئی ہے۔ قرآن کہتا ہے:

"ہم نے اپنی امانت کو آسمانوں پر، زمین پر اور پہاڑوں پر پیش کیا لیکن سب نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے (مگر) انسان نے اسے اٹھالیا وہ بڑا ظالم جاہل ہے۔" (72:33)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میں تم سب کے اعمال (جو تم نے کرنے ہیں) پہلے سے تمہاری تقدیر میں لکھ دوں گا اور ان کی اچھائی یا برائی پر تم کو جزا اور سزا ملے گی۔ دوسری مخلوقات نے جواب دیا: کس طرح تم طے کرو گے (کہ ہم نے کیا کرنا ہے) اور ہمیں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔ اور وہ ڈر گئیں مگر انسان جسے اللہ تعالیٰ کے بے پایاں رحم و کرم پر یقین تھا تیار ہو گیا اور کہا: ہاں میرے رب میں یہ بار امانت اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ اللہ تعالیٰ انسان کے اس عزم سے بے حد خوش ہوا اور فرشتوں کو حکم دیا کہ انسان کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ چونکہ اسلام نے دونوں معاملات کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا ہے اس لئے اس کے لئے کوئی مشکل بات نہیں ہے کہ بیک وقت انسان کے فرائض (کوشش اور احساس ذمہ داری) اور تقدیر کے تعین سمیت تمام صفات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حقوق کو تسلیم کرے۔

(123) تقدیر کی اسلام میں ایک اور اہمیت بھی ہے اور معمولی اہمیت نہیں ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہی زیبا ہے کہ وہ انسانی عمل کو اچھا یا برا قرار دیتا ہے۔ خدا کی ذات ہی ہے جو تمام قوانین و احکام کا سرچشمہ ہے۔ یہ تمام خدائی احکام ہیں جن کا ہم نے اپنے طرز عمل میں مظاہرہ کرنا ہے اور جنہیں وہ اپنے پیغمبروں کے وسیلے سے ہم تک پہنچاتا ہے۔ جن میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخری نبی ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں جن کی تعلیمات دوسرے انبیاء کی نسبت زیادہ محفوظ

انداز میں ہم تک پہنچی ہیں۔ ہمارے پاس سابق انبیاء کی تعلیمات اصل حالت میں نہیں پہنچ سکیں جو انسانوں کی باہمی جنگ و جدل میں نقصانات سے دوچار ہوئیں۔ اس عمل سے صرف قرآن کو استثنٰی حاصل ہے جو آخری خدائی پیغام کا درجہ بھی رکھتا ہے اور یہ ایک مسلمہ اصول ہے کہ کسی قانون ساز کا نیا ضابطہ پہلے سے موجود ضابطہ کو منسوخ کر دیتا ہے۔

(124) آیئے آخر میں ہم اسلامی طرز زندگی کے ایک اور پہلو کا حوالہ دیں: یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ نہ صرف وہ انفرادی طور پر اپنے روزمرہ کے معمولات میں خدائی قانون پر عمل پیرا ہو بلکہ دنیاوی اور روحانی دونوں قسم کے معاملات میں اس کا طرز عمل امت مسلمہ کے رکن کے شایان شان ہونا چاہیے۔ اس کی یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور احکامات کے مطابق اسلام کے نظریہ کی تبلیغ و اشاعت میں اپنا حصہ ڈالے جس کا مطلوب و مقصود صرف نوع انسانی کی فلاح ہے۔

(125) اس کے جامع عقیدے میں انسان کی تمام زندگی کا سامان موجود ہے۔ دنیاوی بھی اور روحانی بھی اور انسان کی اس دنیا کی زندگی دراصل دوسری دنیا کی زندگی کی تیاری کے لئے ہے۔

باب نمبر 4

عقیدہ اور ایمان

انسانوں کا اعتقاد بہت سی چیزوں پر ہوتا ہے۔ سچائی پر اور ان تمام باتوں پر جو اس نظریہ سے متعلق ہیں۔ توہمات پر اور بعض اوقات ایسی چیزوں پر بھی جن کی بنیاد غلط فہمیوں پر ہوتی ہے۔ اعتقادات دوسرے عوامل کے علاوہ عمر اور تجربے کے ساتھ تبدیل بھی ہوتے ہیں تاہم بعض اعتقاد ایسے ہوتے ہیں جن پر انسانوں کا ایک گروپ متفق ہوتا ہے۔ اس تناظر میں سب سے اہم پہلو خود انسان کے اپنے وجود کے بارے میں ہے کہ وہ کہاں سے آیا، کہاں جانا ہے؟ اسے کس نے پیدا کیا؟ اس کے وجود کا مقصد کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

علم مابعد طبیعات اس ذہنی کشمکش سے پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب دینے کی کوشش کرتا ہے مگر وہ مذہب کا محض ایک جزو ہے جو نسبتاً جامع اور ایسے تمام متعلقہ سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ علم جو اس معاملے کو حل کرسکتا ہے وہ مذہب ہی ہے جہاں تک عقائد کا مسئلہ ہے وہ خالصتاً ذاتی فعل ہے۔ اس کے باوجود اس معاملے پر بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایسی ہولناک اور پرتشدد کارروائیاں کی گئی ہیں کہ اس پر جنگل کے درندے بھی شرما جائیں۔ اسلام کا اس معاملے میں بنیادی اصول درج ذیل آیت قرآنی میں واضح کردیا گیا ہے۔

> ”دین کے بارے میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت ضلالت (گمراہی) سے روشن ہوچکی ہے اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کرکے اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے اس نے مضبوط کڑے کو تھام لیا جو کبھی نہ ٹوٹے گا۔ اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔“ (256:2)

یہ اسلام کا رویہ ہے کہ کسی بھی عقیدے پر مجبور کئے بغیر دوسروں کی رہنمائی اور ساتھی انسانوں کی غفلت اور جہالت کے خاتمے کے لئے جدوجہد نیکی بلکہ قربانی ہے۔

(127) انسان کا علم اور ذہانت ایک مسلسل حالت ارتقاء میں ہیں۔ گیلین Galen کا طب یا اقلیدس کا حساب کا علم آج کے میٹرک کے طالب علم کے لئے بھی کافی نہیں جبکہ یونیورسٹی کے طالب علموں کو اس سے بہت زیادہ علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ جہاں تک مذہبی علم کا تعلق ہے ابتدائی دور کا انسان تو شائد خدا کے تصور سے بھی ناآشنا ہوگا جس کی عبادت کے لئے علامات کی ضرورت تھی نہ مادی مظاہر کی اور نہ ہی اس کی زبان ابھی اس قابل تھی کہ ان پیچیدہ اور لطیف نظریات کے اظہار پر قادر ہو سکے۔

(128) اسلام کا زیادہ زور اس بات پر ہے کہ انسان کی تخلیق میں بیک وقت دو عناصر کارفرما ہیں یعنی اس کا جسم اور روح اور اسے کسی ایک کے لئے دوسرے کو نظر انداز کرنا مناسب نہیں۔ صرف روحانی تقاضوں کی تکمیل کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فرشتہ بننے کا خواہاں ہے (جبکہ خدا نے فرشتوں کو ایک الگ مخلوق کی حیثیت سے پیدا فرمایا ہے) اور اس کے برعکس محض مادی ضروریات پوری کرنے پر ہی تلے رہنا اپنے آپ کو اگر شیطان نہیں تو حیوان یا پھر محض ایک پودے (گھاس پھونس) کے مقام تک لے آنے کے مترادف ہے۔ (خدا نے ان مقاصد کے لئے انسان کے علاوہ دوسری چیزیں پیدا فرمائی ہیں)۔ انسان کو دوہری صلاحیت کے ساتھ پیدا کرنے کا مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ جسم اور روح کے تقاضوں کو بیک وقت ایک توازن کے ساتھ پورا نہیں کرتا۔

(129) مسلمان اپنے مذہب کے لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرہون احسان ہیں۔ ایک روز خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سوال کے جواب میں کہ ایمان سے کیا مراد ہے؟ فرمایا:

"(ایمان کا مطلب ہے) خدا کی وحدانیت، فرشتوں اور آسمانی کتابوں، انبیاء اور روز قیامت پر ایمان رکھنا یعنی انہیں دل سے تسلیم کرنا۔"

اسی موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وضاحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے سامنے سر جھکانے سے دراصل کیا مراد ہے اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا بہترین طریقہ کیا ہے۔ ان نکات پر آئندہ کے دو ابواب میں بات ہوگی۔

خدا تعالیٰ:

(130) مسلمانوں کی ملحدوں، مشرکوں اور خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کرنے والوں کے ساتھ کوئی قدر مشترک نہیں۔ خدائے واحد کے لئے عربی لفظ اللہ ہے جو کائنات کا خالق اور مالک ہے۔

(131) بالکل ابتدائی اور سادہ ترین، تہذیب سے قطعی ناآشنا انسان بھی یہ بات جانتا ہے کہ کوئی بھی خود اپنا خالق نہیں ہو سکتا۔ یقیناً ہم سب اور اس کائنات کا ایک خالق ہونا چاہیے، مگر الحاد اور مادہ پرست اس منطقی تقاضے کو تسلیم نہیں کرتے۔

(132) ایک سے زیادہ خداؤں کے نظام میں ان کے مابین اگر خانہ جنگی نہ بھی ہو تو اختیارات کی تقسیم بے حد مشکل ہو گی۔ آپ کائنات کا مشاہدہ کریں تو آپ دیکھیں گے کہ تمام نظام ایک دوسرے سے منسلک اور باہم انحصار پر مبنی ہے۔ مثلاً انسان کو پودوں، دھاتوں، مویشیوں اور ستاروں کی ضرورت پڑتی ہے اور ان سب اشیاء کو بھی کسی نہ کسی انداز میں دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ اس طرح خدائی اختیارات کی تقسیم ناقابل عمل ہے۔

(133) بعض مفکروں نے دو مختلف خداؤں کا تصور پیش کر دیا یعنی ایک نیکی کا خدا اور ایک برائی کا خدا۔ مگر سوال یہ ہے کہ یہ دو خدا مل جل کر چلتے یا ان میں تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ دو خداؤں کا تصور محض خیال ہے، یعنی اگر نیکی کا خدا برائی کے خدا کے سامنے ہار مان لے تو سمجھیں وہ برائی میں ساتھی بن گیا اور اس طرح دو خداؤں کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ برائی کے خدا کو زیادہ بار فتح حاصل ہو گی اور وہ بالادست رہے گا تو کیا کمزور رہنے والے نیکی کے خدا کو کوئی معبود مانے گا؟ علاوہ ازیں برائی ایک متعلقہ چیز ہے یعنی ایک شخص کے حوالے سے اگر کوئی چیز بری ہے تو وہی چیز کسی دوسرے کے حوالے سے اچھی بن جاتی ہے اور چونکہ مکمل برائی کا کہیں وجود نہیں اس لئے خدا کے ساتھ برائی کی کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ (مزید وضاحت اسی کتاب میں پیراگراف نمبر 228.157.155 پر)

(134) صرف مکمل توحید کا اقرار ہی دلیل کا جواب ہو سکتا ہے۔ خدا ایک ہے چونکہ وہ سب کچھ کرنے پر قادر ہے۔ اس لئے اس کی تمام صفات اسی کو زیبا ہیں۔ خدا نہ صرف خالق ہے بلکہ سب کا

مالک اور آقا بھی۔ آسمانوں اور زمین پر اس کی حکمرانی ہے۔ اس کے علم اور اجازت کے بغیر پتہ بھی نہیں ہلتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے 99 خوبصورت نام ہیں جو 99 بڑی خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں۔ وہ خالق ہے اللہ کی یہ صفت دوسری تمام صفات کا نچوڑ ہے۔ یعنی فہیم، عادل، رحیم، ہر جگہ موجود، سب کچھ کرنے پر قادر، ہر چیز کا تعین کرنے والا اور جو زندگی، موت اور روز قیامت کا مالک ہے۔

(135) یہ بھی مشاہدے میں آیا ہے کہ خدا کا تصور ہر شخص کا اپنا ہے، ایک عالم یا فلسفی کا تصور خدا ایک عام آدمی جیسا نہیں ہوسکتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سادہ لوح لوگوں کے جوش و جذبے کی تعریف فرمایا کرتے تھے اور عموماً "بوڑھی عورتوں کا ایمان" کی مثال دیا کرتے تھے جو غیر متزلزل اور یقین کامل سے عبارت ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہاتھی اور نابیناؤں کے ایک گروپ کی چھوٹی سی خوبصورت کہانی معروف ہے۔ ان نابیناؤں نے کبھی ہاتھی کے بارے میں نہیں سنا تھا۔ اس لئے جب ہاتھی کی آمد کی خبر عام ہوگئی تو یہ سب اشتیاق میں اسے "دیکھنے" وہاں پہنچ گئے۔ ایک کے ہاتھ میں اس کی سونڈ آگئی، ایک کا ہاتھ تو کان پر جا پڑا، تیسرے نے ٹانگوں کو پکڑ لیا اور چوتھے نے دم پکڑ لی۔ ایک اور کے ہاتھ میں اس کے دانت آگئے۔ واپسی پر ہر ایک نے ہاتھی کا سراپا اپنے اپنے تجربے اور محسوسات کے مطابق بیان کیا۔ کسی نے کہا ہاتھی لمبے پائپ کی طرح ہوتا ہے، کسی نے کہا نہیں ستون کی شکل کا، ایک نے کہا پتھر کی طرح سخت ہوتا ہے۔ غرض ہر ایک نے ہاتھی کو اپنے انداز میں پہچانا اور بیان کیا۔ اپنے طور پر سب ہی درست تھے مگر کسی کو بھی مکمل حقیقت سے آگاہی نہ تھی اس لئے کہ ہاتھی کا مکمل سراپا ان کے تصور سے بالا تھا۔ اگر ہم اس مثال کے نابیناؤں کی جگہ ان دیکھے خدا کی حقیقت کے متلاشیوں کو لے آئیں تو ہمیں آسانی سے انفرادی مشاہدات کی سچائی کا ادراک ہوجائے گا۔ جیسا کہ اسلام کے دور اول کے بعض صاحبان تصوف کا قول تھا:

"خدا کے بارے میں ایک سچ وہ ہے جو عام آدمی کو معلوم ہے، ایک سچ وہ ہے جو عارفوں کو معلوم ہے، ایک وہ جس تک پیغمبروں کی رسائی ہے اور آخری وہ سچ ہے جو صرف خدا کو ہی معلوم ہے۔"

مندرجہ بالا بحث کے تناظر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین کی روشنی میں ہر طبقہ کے لوگوں کے ذہن کو مطمئن کرنے کے لئے کافی لچک موجود ہے جن میں پڑھے لکھے ہوں یا

ان پڑھ۔ ذہین ہوں یا سادہ، شاعر، فنکار، ماہرین قانون، عارفین اور دینی علوم کے ماہر سب شامل ہیں۔ نقطہ نظر یا زاویہ نگاہ ایک دوسرے سے مختلف ہوسکتا ہے مگر نگاہ کا مرکز ایک ہی ہوتا ہے۔

(136) مسلمان علماء و مشائخ نے اصول قانون کی بنیاد پر اپنا پورا نظام وضع کیا ہے جس میں حقوق اور فرائض لازم و ملزوم بنائے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اعضاء اور مختلف صلاحیتیں عطا کی ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ہر عطا ایک ذمہ داری کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ اللہ کی عبادت کرنا، اس کا شکر گزار ہونا، اس کی مکمل اطاعت کرنا اور ان تمام باتوں سے دور رہنا جو اس کی خدائی کے نظام سے ہم آہنگ نہیں۔ یہ سب ہر بندے کے انفرادی فرائض ہیں جس کی عدم ادائیگی پر اسے ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

فرشتے:

(137) چوں کہ خدا کی ذات آنکھ سے اوجھل اور کسی قسم کی تجسیم کے تصور سے ماورا ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ بندے اور اس کے خالق کے مابین رابطے کا کوئی وسیلہ ہو ورنہ اللہ کی رضا کا علم ہونا اور اس کی تکمیل ممکن نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نہ صرف ہمارے جسموں بلکہ ہماری صلاحیتوں کا خالق بھی ہے جو ایک دوسرے سے مختلف اور ان میں سے ہر ایک انسان کو ترقی کے زینے کی طرف لے جانے والی ہے۔ یہ اللہ کی ذات ہی ہے جس نے ہمیں وجدان کی قوت بخشی۔ ضمیر عطا کیا اور وہ طاقت عطا کی جس کی مدد سے ہم سیدھے راستے کی طرف رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ انسانی روح کے اندر ذہن میں اچھے اور برے دونوں خیال لانے کی قوت موجود ہے۔ عام انسانوں میں ممکن ہے بعض اوقات اچھے لوگوں کے ذہن میں برے خیالات (دنیاوی خواہشات) در آئیں اور برے لوگوں کے ذہن میں اچھے خیالات پیدا ہو جائیں۔ ہمارے ذہن میں جو خیالات اور وسوسے پیدا ہوتے ہیں وہ خدا کے علاوہ بھی کہیں اور سے آسکتے ہیں مثلاً برے خیالات اور وسوسے شیطان کی طرف سے بھجوائے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ جس سے ہمیں یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون سی چیز اللہ کی رضا کا باعث بنے گی اور کون سی شیطانی وسوسہ ہے جس سے ہمیں بچنا ہے۔

(138) اللہ اور بندے کے درمیان رابطہ قائم کرنے کے کئی طریقے ہیں ان میں سے بہترین تو یہ ہوتا ہے کہ خدا انسانی روپ میں آجائے مگر اسلام نے اس نظریے کو مسترد کر دیا ہے کیونکہ یہ بہت ذلت آمیز بات ہے کہ ہر چیز سے بلند خدا انسانی شکل میں آجائے۔ انسان کی طرح کھائے پیئے، اپنی ہی

مخلوق سے پٹے بھی اور موت کے گھاٹ اتارے جانے کے خطرہ سے بھی دوچار ہو۔ (نعوذ باللہ) تاہم اللہ کی جانب سفر میں کوئی انسان اللہ کا کتنا ہی قرب کیوں نہ حاصل کر لے مگر وہ رہتا انسان ہی ہے اور اللہ سے بہت دور بھی۔ انسان اللہ کی رضا کے حصول کے لئے اپنی ہستی کو چاہے فنا کر لے جیسا کہ تصوف کا نظریہ ہے اور اپنی شخصیت کی نفی کر دے مگر پھر بھی اور مجھے یہ دہرانے دیں کہ انسان، انسان ہی رہتا ہے اپنی کمزوریوں کا اسیر جبکہ خدا کی ذات ان کمزوریوں اور کوتاہیوں سے بالا ہے۔

(139) بندے اور اس کے رب کے درمیان رابطے کے طریقے جو انسان بروئے عمل لا سکتا ہے ان میں سب سے کمزور خواب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ اچھے خواب اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے جو انسان کی درست سمت میں رہنمائی کرتے ہیں۔

(140) ایک اور ذریعہ "القا" ہے (جس کا لغوی مطلب ہے کہ کوئی چیز کسی کی طرف پھینکنا) یعنی خود بخود ذہن میں در آنے والی قسم کی کوئی چیز، وجدان میں آئی بات، تعطل یا ناقابل حل یا پیچیدہ مسائل کی صورت میں ان کے حل کے لئے سوجھنے والی تجویز۔

(141) ایک چیز "الہام" بھی ہے جس کا ترجمہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ذہن میں ڈالی گئی بات۔ یہ صورت ان افراد کے ساتھ ہوتی ہے جن کی روح انصاف، صدق، دنیا سے بے رغبتی اور دوسروں کی فلاح و بہبود جیسی اقدار سے پوری طرح سرشار ہو چکی ہو۔ دنیا کے تمام ممالک میں ہر دور کے ولیوں کو یہ مقام نصیب ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیتا ہے اور اپنے نفس کو بھلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی زندگی میں ایسے لمحے آتے ہیں۔ جب مختصر سے وقت کے لئے خدا کی موجودگی کی کیفیت آسمانی بجلی چمکنے کی طرح ظاہر ہوتی ہے جب وہ شخص بغیر کسی کوشش سے وہ سب آگاہی حاصل کر لیتا ہے جو اسے کسی بھی کوشش سے حاصل نہ ہو سکتی۔ اس طرح انسانی روح یا پرانے بزرگوں کے مطابق اس کا دل روشن ہو جاتا ہے اور اس کے بعد یقین کامل، قناعت اور سچائی کے اظہار کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے اور پھر خدا ہی اس کی رہنمائی کرتا اور اس کے خیالات اور اعمال کو کنٹرول کرتا ہے۔ اللہ کے رسول اور پیغمبر بھی براہ راست اللہ کی نگرانی اور رہنمائی میں ہوتے تھے۔ بہر حال انسان کی طرف سے کسی چیز کو سمجھنے میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ اہل تصوف اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ بعض اوقات انتہائی نیک لوگ بھی ناقابل فہم انا کے تحت گمراہی کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں اور خدائی آزمائش کے طور پر ذہن میں آنے والے جھوٹے وسوسوں کو پہچاننے میں ناکام رہتے ہیں۔

(142) اللہ اور بندے کے درمیان رابطے کا اعلیٰ ترین اور کسی بھی ابہام سے پاک وسیلہ وہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''وحی'' کا نام دیا ہے۔ یہ کوئی عام ''الہام'' یا ''القا'' کی صورت نہیں تھی بلکہ یہ خدا کی طرف سے بندے کی طرف ایک باضابطہ پیغام، ایک آسمانی رابطہ تھا۔ انسان تو ایک مادی جسم رکھتا ہے جبکہ اس کے برعکس خدا کی ذات کا روح سے بھی بالا وجود ہے اس لئے انسان کے ساتھ کسی بھی مادی رابطے سے ماورا ہے (قرآن 103:6:) خدا ہر جگہ موجود ہے اور جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہے: ''انسان سے اس کی شہ رگ سے زیادہ قریب'' (16:50) مگر اتنی قربت کے باوجود مادی یا جسمانی رابطہ ممکن نہیں۔ اس لئے یہ رابطہ ''مَلَک''، جس کے لغوی معنی پیغام رساں کے ہیں۔ آسمانی پیغام رساں اور جسے عام طور پر فرشتہ کہا جاتا ہے کے ذریعے ہوتا ہے، یعنی فرشتہ رابطہ کار کے فرائض انجام دیتا ہے اور خدا کا پیغام اس کے انسانی نمائندے یا پیغمبر کو پہنچاتا ہے۔ پیغمبر کے سوا کسی دوسرے پر وحی نازل نہیں ہو سکتی۔ یہ بات انتہائی اہم ہے کہ اسلام میں پیغمبر سے مراد پیش گوئیاں کرنے والا نہیں بلکہ خدا کے رسول کو پیغمبر کہا جاتا ہے جو اپنی قوم کے لئے اللہ کی طرف سے ہدایت کا پیغام لے کر آئے۔ جہاں تک فرشتوں کا تعلق ہے اس موضوع میں یہ زیر بحث نہیں ہے کہ ان کا وجود مادی ہے یا ہوائی اور یا انہیں کسی اور چیز سے تخلیق کیا گیا ہے۔

(143) قرآن کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جو فرشتہ اللہ کا پیغام لے کر آتا تھا اس کا نام جبریل (جبرائیل۔ گبریل) ہے اور جس کے لفظی معنی ہیں ''خدا کی طاقت''۔ قرآن میں ایک فرشتے ''میکائل'' (میکائیل) کا بھی ذکر آتا ہے مگر اس کی ذمہ داریوں کی کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ دوزخ کے نگران فرشتے کا نام ''مالک'' ہے (لغوی معنی آقا یا مالک) قرآن میں دیگر فرشتوں کا بھی تذکرہ ہے مگر نام اور ذمہ داری کا حوالہ نہیں دیا گیا۔ ان سب کا کام اپنے مالک کے احکام کی بجا آوری ہے۔

اسلامی عقیدے کے مطابق جبریل علیہ السلام جنہیں اللہ تعالیٰ نے ''روح الامین'' یعنی ''امانت دار روح'' بھی قرار دیا ہے تمام فرشتوں کے سردار ہیں۔ احادیث نبوی کے مطابق جیسا کہ قرآن سے بھی ظاہر ہے، جبریل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ہمیشہ ایک ہی انداز میں حاضر نہیں ہوتے تھے۔ بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں آسمان کی وسعتوں میں ساکن دیکھا اور کبھی وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس انسانی شکل میں بھی حاضر

ہو جاتے اور کئی مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں پروں کے ساتھ بھی دیکھا۔ ایک روایت کے مطابق (اس کتاب کا حوالہ 129) جسے ابن حنبلؒ نے روایت کیا۔

ایک روز جب کہ بہت سے صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہم موجود تھے ایک اجنبی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے چند سوالات کیے اور پھر واپس چلا گیا۔ کئی روز بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا: فلاں روز جو شخص آیا تھا اور مجھ پر سوالات کیے تھے وہ جبریل علیہ السلام کے سوا کوئی اور نہ تھے اور وہ آپ لوگوں کو دین سکھانے آئے تھے۔ مجھے ان کو پہچاننے میں اتنی دیر کبھی نہیں لگی اور یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ پیغمبر کو آزمانے آئے تھے اللہ کا پیغام پہنچانے نہیں۔

(144) وحی کس طرح نازل ہوتی تھی اس کے بارے میں تفصیلات درج ذیل روایات سے ملتی ہیں۔ جن میں سے بعض خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین ہیں جب کہ بعض وحی آنے کے وقت موجود صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مشاہدات پر مبنی ہیں۔

"بعض اوقات وحی گھنٹی بجنے کی آواز کی طرح آتی تھی اور وحی کی یہ صورت سب سے سخت ہوتی تھی اور اس دوران جو کچھ کہا جاتا اسے میں اپنے حافظے میں محفوظ کرلیا کرتا تھا۔"

"بعض اوقات فرشتہ انسانی شکل میں مجھ سے ہم کلام ہوتا اور اللہ کا پیغام پہنچا دیتا جسے میں یاد کرلیتا۔" (بخاری)

ابن حنبل کی روایت اس طرح ہے:

"میں گھنٹیوں کے بجنے کی آواز سنتا ہوں اور پھر میں خاموش رہتا ہوں (جب اس انداز کی وحی آتی ہے) اور ایک بھی موقع ایسا نہیں جب (اس کی سختی کے باعث) مجھے یہ خوف نہ ہوا ہو کہ میری جان نکل جائے گی۔"

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی روایت یہ ہے:

"جب بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تو ایسا لگتا کہ کسی کیفیت نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جکڑ لیا ہے۔" (ابن حنبل)

"جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

پر غلبہ ہو جانے کا شبہ ہوتا جیسا کہ غنودگی کی کیفیت ہو۔" (ابن سعد)

"جب وحی آتی تو سخت سردی میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی سے پسینے کے قطرے موتیوں کی طرح ٹپکنے لگتے۔" (بخاری)

"ایک دفعہ جب وحی نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا سر اندر کر لیا (کپڑے وغیرہ کے اندر) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناک سے خراٹوں جیسی آواز نکلنے لگی اور پھر یہ کیفیت ختم ہو گئی۔" (بخاری)

"جب بھی وحی آتی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکلیف محسوس کرتے اور کرب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے پر ظاہر ہو جاتا۔" (ابن سعد)

"جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی آتی تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آواز سنتے۔" (ابن حنبل، ابونعیم)

"جب وحی آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت تکلیف محسوس کرتے اور اس دوران آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہونٹ متحرک ہوتے۔" (بخاری)

کچھ دیگر روایات کے مطابق وحی کے نزول کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بہت بوجھ پڑ جاتا۔

ایک روایت ہے کہ:

"ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اونٹنی پر سوار تھے تو وحی کا نزول ہونے لگا (اور اس کے بوجھ کے سبب) اونٹنی درد سے بلبلانے لگی اور اس کی ٹانگیں مڑنے لگیں۔ مجھے یہ خوف ہوا کہ کہیں یہ ٹوٹ نہ جائیں۔ بعض اوقات اونٹنی ایسی کیفیت میں بیٹھ جاتی اور بعض اوقات کھڑے رہنے کی کوشش میں اس کی ٹانگیں کھونٹی کی طرح مڑ جاتیں اور یہ کیفیت وحی کے اختتام تک جاری رہتی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے ہوتے۔" (ابن سعد)

"بعض اوقات وحی کے بوجھ سے اونٹنی کی ٹانگیں کڑکڑانے لگتیں۔" (ابن حنبل)

حضرت زیدؓ بن ثابت اپنا ایک ذاتی تجربہ بیان کرتے ہیں:

"ایک دفعہ وحی آنے کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ٹانگ مبارک میری ران پر دھری تھی تو مجھ پر ناقابل برداشت بوجھ پڑ گیا۔ ایسے لگا کہ میری ران کچلی جائے گی۔" (بخاری)

ایک اور روایت میں یہ اضافہ بھی موجود ہے کہ:

"اگر یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کا معاملہ نہ ہوتا تو میں تکلیف کی شدت کے سبب ٹانگ ہٹا کر اپنی ران آزاد کرا لیتا۔"

ایک اور روایت کے مطابق:

"آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی آئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد کے منبر پر تشریف فرما تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے حس و حرکت ہو گئے۔" (ابن حنبل)

"جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی آئی تو گوشت کا لقمہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں تھا۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو لقمہ بدستور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں ہی رہا۔" (ابن حنبل)

"ایسے موقع پر کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمر کے بل لیٹ جاتے اور بعض اوقات ایسی کیفیت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک پر احتراماً کپڑا ڈال دیتے مگر ان تمام کیفیات کے باوجود نہ تو کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے ہوش ہوئے اور نہ ہی ایسا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توازن کھو دیا ہو۔"

نبوت کے ابتدائی ایام میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وحی کے نزول کے دوران جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارا جاتا اسے بآواز بلند دہرا لیا کرتے تھے تاہم جلد ہی جب کہ ابھی

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ میں ہی تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ معمول ترک کر دیا تھا اور وحی کے دوران خاموش رہتے اور اس کے اختتام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کاتبین وحی کو نازل شدہ قرآن کا حصہ لکھوا دیا کرتے تھے۔ (جیسا کہ قرآن مجید میں مذکور ہے):

"(اے نبی!) آپ قرآن کو جلدی (یاد کرنے) کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، اس کا جمع کرنا اور (آپ کی زبان سے) پڑھوانا ہمارے ذمہ ہے۔" (75:16-17)

ایک اور مقام پر ارشاد خداوندی ہے:

"تو قرآن پڑھنے میں جلدی نہ کر اس سے پہلے کہ تیری طرف جو وحی کی جاتی ہے وہ پوری کی جائے، ہاں یہ دعا کر کہ پروردگار میرا علم بڑھا۔" (20:114)

اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کیفیت بحال ہو جاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت نازل ہونے والا قرآن کا حصہ کاتبین وحی کو لکھوا دیتے تا کہ اس کی نقول تیار کی جا سکیں (حوالہ کتاب ہذا پیراگراف نمبر 53,50) ابن اسحاق کی روایت ہے: "جب بھی وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے مردوں اور پھر عورتوں کو سناتے۔" (المباث والمغازی)

آسمانی کتابیں:

(145) اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا مالک ہے اس لئے انسان کا فرض ہے کہ اس کی مکمل اطاعت کرے۔ یہ اس کی رحمت ہے کہ اس نے انسان کی فلاح کے لئے اپنے رسول بھیجے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ تمام دینی اور دنیاوی قوانین اور ضوابط کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ ابھی یہ بات زیر بحث تھی کہ اللہ تعالیٰ کا پیغام وحی اور دوسرے وسیلوں سے انسان تک پہنچا۔ یہ وہی پیغام ہے جسے جمع کر کے آسمانی کتابوں کا نام دے دیا گیا۔

(146) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو عقیدہ پیش کیا وہ صرف ایک کتاب یعنی قرآن مجید کا ہی ذکر نہیں کرتا بلکہ کتابوں کا حوالہ دیتا ہے۔ برداشت اور رواداری آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کی خصوصیت ہے قرآن میں کئی مقامات پر ان کتابوں کا حوالہ آتا ہے مثلاً:

"اور مومن بھی ایمان لائے، یہ سب اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور اس کے رسولوں میں سے کسی میں ہم تفریق نہیں کرتے۔" (285:2)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

"اور ہم نے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق دے کر خوشخبری سنانے والا اور ڈر سنانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی امت ایسی نہیں ہوئی جس میں کوئی ڈر سنانے والا نہ گزرا ہو۔" (24:35)

"اور آپ سے پہلے کے بہت سے رسولوں کے واقعات ہم نے آپ سے بیان کئے ہیں اور بہت سے رسولوں کے نہیں بھی کئے۔"

(78:40,164:4)

قرآن مجید میں ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں، موسیٰ علیہ السلام کی تورات، داؤد علیہ السلام کی زبور اور عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل کا ذکر آسمانی کتابوں کی حیثیت سے آتا ہے۔

(147) یہ بات درست ہے کہ آج ابراہیم علیہ السلام کے صحائف کے کوئی آثار باقی نہیں جب کہ موسیٰ علیہ السلام کی تورات کی کہانی سے ہم آگاہ ہیں کہ کس طرح اسے بار بار مسخ کیا گیا۔ یہی معاملہ زبور کا ہوا۔ جہاں تک عیسیٰ علیہ السلام کا تعلق ہے انہیں اپنی تعلیمات کو جمع کرنے یا دوسروں سے لکھوا کر محفوظ کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ آپ کے حواریوں اور ان کے بعد میں آنے والوں نے آپ کے فرامین کو جمع کیا اور بعد والوں کے لئے ہر ایک نے تصحیح کے نام پر نئی انجیل تیار کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج 70 کے لگ بھگ انجیلیں موجود ہیں اور چرچ نے چار کے سوا باقی سب کو مسترد کر دیا ہے۔ اس سب کے باوجود مسلمان کے لئے قرآن کے ساتھ ساتھ باقی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان رکھنا ضروری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گوتم بدھ، زرتشت یا ہندو برھمیت کی تصدیق نہیں کی اس لئے مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ یقین کے ساتھ اوستا (پارسیوں کی مقدس کتاب) یا ہندوازم کی ویدوں کے الہامی ہونے کی تصدیق کریں اور نہ ہی وہ مکمل طور پر اس نظریے کو مسترد کر سکتے ہیں کہ ویدوں یا اوستا کا ماخذ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام نہیں تھا یا یہ کہ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوا جو تورات کے ساتھ ہوا۔ یہی صورتحال چین، یونان اور دوسرے ملکوں میں ہوئی۔

اللہ کے پیغمبر:

(148) اللہ کا پیغام فرشتہ ایک منتخب شخص کے پاس لے کر آتا ہے اور یہ ذمہ داری پیغمبر کی ہے کہ وہ پیغام اللہ کے بندوں تک پہنچائے۔

قرآن کی اصطلاح میں اللہ تعالیٰ کے اس انسانی نمائندہ کے مختلف نام ہیں یعنی نبی، رسول، مُرسل، بشیر، نذیر۔

(149) پیغمبر انتہائی پرہیزگار اور روحانی، دنیاوی اور سماجی حوالے سے حسن کردار کا اعلیٰ ترین نمونہ ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان کے پاس معجزات بھی ہوں (اگرچہ تاریخی روایات یہ ہیں کہ سب انبیاء کو معجزے عطا ہوئے تاہم انہوں نے ہمیشہ معجزات کے بارے میں یہی کہا کہ یہ اللہ ہی ہے جو سب کچھ کرتا ہے) یہ صرف ان کی تعلیمات ہیں جو ان کی ساکھ کی بنیاد ہے۔

(150) قرآن کے مطابق بعض پیغمبروں پر اللہ کا کلام نازل ہوا تاہم بعض پر نیا کلام نازل کرنے کی بجائے ان کے پیشرو انبیاء کے کلام کی پیروی ہی ان کے دین کی بنیاد تھی۔ اللہ تعالیٰ کے کسی بھی نبی کی تعلیمات میں بنیادی سچائی پر کوئی اختلاف نہیں۔ مثلاً خدائی وحدانیت، نیک کام کرنے اور برائی سے بچنے کی تلقین وغیرہ تاہم سماجی ارتقا کی بدولت لوگوں میں آنے والی تبدیلیوں کے مطابق معاشرتی رویوں یا ضوابط میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ اگر خدا نے یکے بعد دیگرے پیغمبر بھیجے ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سابقہ تعلیمات منسوخ ہو چکی ہیں اور اس کی جگہ نئے ضوابط آ چکے ہیں۔

(151) بعض پیغمبروں کی ذمہ داری صرف ایک گھر (قبیلہ یا خاندان) یا ایک نسل یا علاقہ تک اللہ کا پیغام پہنچانے تک محدود تھی جبکہ بعض کے ذمہ پوری نوع انسانی کو پیغام پہنچانا تھا۔

(152) قرآن مجید میں بعض پیغمبروں کا پورے التزام کے ساتھ ذکر ہے مثلاً آدم، ادریس، صالح، ہود، نوح، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب، داؤد، موسیٰ، یحییٰ، عیسیٰ علیہم السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ وضاحت بھی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو خاتم النبیین ہیں ان سے پہلے اور بھی انبیاء گزر چکے ہیں۔

عقیدہ جزا وسزا:

(153) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین میں یوم قیامت پر ایمان رکھنا بھی لازمی ہے۔ انسان کو اس کی موت کے بعد زندہ کیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ انسان کو دنیا میں اچھے اعمال کی جزا اور انعام اور برے اعمال کی سزا دینے کے لئے ایک میزان قائم کرے گا۔ ایک روز آئے گا جب اللہ کے حکم سے ہماری یہ کائنات فنا ہو جائے گی اور پھر مخصوص عرصہ گزرنے کے بعد جس نے ہمیں پہلی بار پیدا کیا ہمیں دوبارہ زندگی دے گا:

انعام کے طور پر جنت اور سزا کے لئے جہنم ہمیں سمجھانے کے لئے محض علامتی اصطلاحیں ہیں جو ہماری اس دنیا کی زندگی کے تصورات سے ماورا ہیں۔ قرآن میں اس کا ذکر اس طرح آتا ہے:

''کوئی نفس نہیں جانتا جو کچھ ہم نے ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ان کے لئے پوشیدہ رکھی ہے، جو کچھ کرتے تھے یہ اس کا بدلہ ہے'' (17:32)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

''ان ایمان دار مردوں اور عورتوں سے اللہ نے ان جنتوں کا وعدہ فرمایا ہے جن کے نیچے نہریں لہریں لے رہی ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں اور ان صاف ستھرے پاکیزہ محلات کا جو ان ہمیشگی والی جنتوں میں ہیں اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے، یہی زبردست کامیابی ہے۔'' (72:9)

اس لئے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ان تمام جنتوں سے بھی بڑھ کر ہے۔

قرآن مجید میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

''جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی ہے اور مزید برآں بھی۔'' (26:10)

بخاری اور مسلم کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس آیت کی تشریح یہ فرمایا کرتے تھے کہ جنت میں داخلے کے بعد اہل جنت کو خدا تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوگا اور

یہ ہے دراصل سب سے بڑا انعام جو نیک بندوں کو ملے گا۔ جہاں تک جنت کا تعلق ہے اس حوالے سے معروف حدیث نبوی ہے:

"خدا فرماتا ہے کہ میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے جنت میں ایسی نعمتیں مہیا کی ہیں کہ ان جیسی کوئی چیز کسی آنکھ نے دیکھی، نہ کسی کان نے سنی اور نہ کسی کے دل (ذہن) میں اس کا کبھی گمان ہوگا۔"

اب یہ سوال کہ جنت سے بڑھ کر پھر اور کیا ہوگا۔ اس بارے میں بخاری، مسلم، ترمذی اور دوسرے راوی ایک حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جب جنتی لوگ بہشت میں داخل ہو چکے ہوں گے۔ خدا ان سے مخاطب ہو کر کہے گا بتاؤ اب اس کے علاوہ تمہیں کیا چاہیے؟ لوگ حیران ہوں گے کہ اتنے انعامات اور جنت کی نعمتیں حاصل کرنے اور جہنم سے نجات پانے کے بعد اب وہ اور کیا مانگیں، جس پر اللہ تعالیٰ نقاب ہٹا دے گا (اور اہل جنت اپنے خالق کو دیکھ سکیں گے) جس کے بعد انہیں خدا کی ذات کو دیکھنے سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ رہے گی۔"

(ایک اور حدیث میں "نقاب" کی جگہ حجاب۔ ردا الکبریا کا لفظ استعمال ہوا ہے)

دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کی زیارت مومن کے لئے سب سے بڑا اور حقیقی انعام ہوگا۔ اس کا ادراک وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دوسری دنیا کی حقیقی ہیئت کو سمجھ سکتے ہوں۔ اس مصدقہ تشریح کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ قرآن و حدیث میں جنت کے پر لطف مناظر اور دوزخ کی ہولناکیوں کا جو مسلسل تذکرہ عام آدمی کے لئے کیا گیا ہے وہ ہمیں ہماری اس دنیا کی اشیاء کے حوالے سے سمجھانے کے لئے ہے کہ جنت میں باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، حوریں ہیں، قالین اور نفیس ملبوسات، موتیوں، قیمتی پتھروں، پھلوں، شراب اور وہ سب کچھ جس کی اہل جنت خواہش کریں گے۔ اسی طرح جہنم میں آگ ہے، خوفناک اژدہے، ابلتا ہوا پانی اور دوسرے عذاب۔ جہنم کے کچھ حصے انتہائی سرد ہوں گے مگر ان تمام تکالیف کے باوجود ان سے نجات کے لئے موت بھی نہیں ہوگی۔ یہ بات آسانی سے بیشتر انسانوں کو سمجھائی جا سکتی ہے جن کے لئے یہ پیغام بھیجا گیا ہے تاہم ضروری ہے کہ پیغام کو ہر ایک کی ذہنی سطح کے مطابق اسے سمجھایا جائے۔

ایک روز کا ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرامؓ کے ایک مجمع کے سامنے جنت کی خصوصیات بیان فرما رہے تھے کہ ایک بدو اٹھ کھڑا ہوا اور یہ سوال داغ دیا "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) کیا وہاں اونٹ بھی ہوں گے۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور نرمی سے جواب دیا "وہاں جس چیز کی خواہش کوئی کرے گا اسے مل جائے گی۔" (ابن حنبل اور ترمذی) قرآن جنت اور دوزخ کی بات ایک عام ذہن کے شخص کو سچائی اور نیکی کے راستے پر چلنے کی ترغیب دینے کے لئے کرتا ہے مگر اس میں تفصیلات کو اہمیت نہیں دیتا کہ آیا کس جگہ کا تذکرہ ہے یا صورت حال کا اور ہمیں اس میں زیادہ دلچسپی لینی بھی نہیں چاہیے کہ ایک مسلمان ان سب پر یہ سوال کیے بغیر ایمان رکھتا ہے کہ "یہ سب کیسے ممکن ہے"!

(154) یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ جنت دائمی ہے۔ ایک روز جو اس میں داخل ہو گیا تو اسے وہاں سے نکالنے کا کوئی سوال نہیں۔ قرآن میں یقین دلایا گیا ہے۔

"نہ تو وہاں انہیں کوئی تکلیف چھو سکتی ہے اور نہ ہی وہاں سے نکالے جائیں گے۔" (48:15)

بعض کو فوراً جنت میں داخلہ مل جائے گا جبکہ بعض دوزخ میں کچھ مدت (اپنے گناہوں کے تناسب سے) گزار کر پھر جنت میں داخل ہونے کے اہل قرار پائیں گے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا کافروں کے لئے جہنم دائمی ہے؟ اس مسئلے پر مسلم فقہاء کا اختلاف ہے اگرچہ بیشتر نے قرآنی آیات کی روشنی میں اس کی تصدیق کی ہے (116:4,48:4) کہ اللہ تعالیٰ ہر گناہ معاف کر سکتا ہے مگر خدا سے انکار کا جرم معاف نہیں ہوگا، اور اس گناہ کی سزا دائمی جہنم ہے تاہم فقیہوں کی رائے ہے کہ اللہ سے انکار کی سزا بھی بالآخر اللہ کی رحمت سے معاف ہو جائے گی یہ فقہاء بھی یہ نتیجہ قرآنی آیات سے ہی اخذ کرتے ہیں۔ (107:11) ہمیں ضرورت نہیں کہ ہم اس بحث کو طول دیں بلکہ ہمیں اللہ کی بے پایاں رحمت کی امید کرنی چاہیے۔

تقدیر اور عمل کی آزادی کی حدود:

(155) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے کہ اس بات پر ایمان ضروری ہے کہ قدر (یا تقدیر) اچھی ہو یا بری اللہ کی طرف سے ہے۔ کیا یہ فرمان اس بات کا اظہار ہے کہ ہر چیز انسان کے لئے پہلے سے طے شدہ ہے یا کہ کسی مخصوص کام کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار خدا کی مرضی پر

ہے؟ دوسرے لفظوں میں کوئی بھی چیز اپنے طور پر اچھی یا بری نہیں بلکہ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے اچھا یا برا قرار دے دیا ہے اور انسان کے لئے اس کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں۔

(156) یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ مسئلہ فقہا کے لئے ایک چیستان ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے تو یہ اس اصول سے مطابقت نہیں رکھتا کہ اس کے اعمال پہلے سے طے شدہ ہیں۔ اسی طرح اگر یہ کہا جائے کہ انسان اپنے اعمال میں آزاد ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو نہ تو انسان کے اعمال پر کوئی قدرت حاصل ہے اور نہ ہی علم کہ وہ اپنی اس دنیاوی زندگی میں کیا کرنے والا ہے۔ یہ دونوں ہی پہلو الجھن میں ڈال دینے والے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نہ صرف سب سے بڑا انصاف کرنے والا ہے، بلکہ قادر مطلق اور علیم وبصیر ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بحث کو ناپسند فرمایا ہے جس کا کبھی کوئی حتمی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مومنوں کو اس بحث میں پڑنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا: تم سے پہلی قومیں اس بحث میں پڑ کر گمراہ ہوگئیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین کے مطابق اللہ تعالیٰ پر اس کی تمام قدرتوں کے ساتھ کہ وہ قادر مطلق اور علیم وخبیر ہے، ایمان ضروری ہے اور یہ کہ انسان کو اپنے اعمال پر جوابدہ ٹھہرایا جائے گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک ان معاملات کو ایک دوسرے سے منسلک کرنا درست نہیں یعنی ایک طرح سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بحث کو کارلا حاصل سمجھ کر اس سے گریز کرنا چاہتے ہیں کہ جیسے اس بحث کا کوئی فائدہ نہیں کہ پہلے انڈہ پیدا ہوا تھا یا مرغی۔

(157) اس کے علاوہ اچھائی اور برائی محض تقابلی اصطلاحیں ہیں۔ ایک شیر اپنی خوراک کے لئے خرگوش کا شکار کرتا ہے۔ اب ایک طرف جو کچھ ایک کے لئے اچھائی (رزق) ہے اور دوسرے کے لئے وہی چیز مصیبت یا برائی (موت) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو برائی ہم تک پہنچی ہے وہ ہماری اپنی فطرت کے سبب ہے جو اس برائی کی مستحق ہے یا اسے اس برائی کی ضرورت ہے۔ اور یہ وجہ بھی ہے کہ یہ خدا تعالیٰ کی ذات ہے جس نے یہ تعین کرنا ہے کہ کس کے لئے کوئی کام اچھا ہے اور کس کے لئے برا۔ اس کے علاوہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ''ذمہ داری'' کا تصور اس دنیا کی چیز ہے جب کہ خدائی جزا اور سزا کا تعلق دوسری دنیا کے معاملات سے ہے۔ ہمیں دھچکا صرف اس وقت پہنچتا ہے جب ہم دونوں کو ایک سطح پر رکھتے ہیں جبکہ ایسا کرنا حماقت ہے۔

(158) یہ بات قابل ذکر ہے کہ بیک وقت اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور کسی بھی فعل کے کرنے میں حتمی طور پر انسان کے خودمختار ہونے کے عقیدے کے باعث ہی ایک مسلمان عمل پر آمادہ ہوتا ہے حالانکہ وہ اسے آسانی سے اپنی قسمت کے کھاتے میں ڈال کر عمل سے فرار حاصل کر سکتا ہے لیکن یہ چیز اس میں ایک ولولہ پیدا کرتی ہے۔ ہمیں اس بیان کی سچائی پر قائل ہونے کے لئے اولین مسلمانوں کے طرز عمل کا حوالہ لینا چاہیے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین پر سختی سے عمل کرنے والے تھے۔

بحث کا خلاصہ:

(159) اس ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عملاً مسلمان کو بہرحال یقین ہی رکھنا پڑے گا۔ عقیدے کا مکمل نچوڑ دو جملوں میں ہے:

''خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول اور اس کے بندے ہیں۔''

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام محض ایک عقیدہ نہیں بلکہ ایک عملی نظام ہے جو روحانی تقاضے بھی پورے کرتا ہے اور مادی بھی۔ یہ درحقیقت مکمل ضابطہ حیات ہے۔

باب نمبر 5

اسلامی زندگی اور عبادات

اسلام نے بنی نوع انسان کے لئے ایک مکمل ضابطہ حیات پیش کیا ہے اور انسانی زندگی کے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔ اسلام کا نصب العین یہ ہے کہ ان تمام پہلوؤں کو ایک نظام میں مربوط کر دیا جائے اور اس ''مرکزیت'' کو اسلام جو اہمیت دیتا ہے وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ اس کی عبادات میں جسم اور روح دونوں کے تقاضے ملحوظ رکھے گئے ہیں۔ دنیاوی معاملات کو جب اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق نمٹایا جاتا ہے تو ان میں بھی تقدس شامل ہو جاتا ہے اور اسی طرح روحانی اعمال میں دنیاوی فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ اسلام میں دنیاوی یا دینی دونوں معاملات کے ضوابط کا سرچشمہ ایک ہی ہے یعنی قرآن جو کلام الٰہی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسلام میں ''امام'' (اسلامی دنیا کا قائد اعلیٰ) کی اصطلاح سے مراد ایسی شخصیت ہے جو نہ صرف مسجد میں نمازوں کی امامت کے فرائض ادا کرے بلکہ مسلم ریاست کے سربراہ کی ذمہ داریاں بھی اٹھائے۔

(161) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک معروف حدیث میں یقین (ایمان) اطاعت (اسلام) اور عمل حسنہ (احسان) کی تعریف بتائی گئی ہے۔ گزشتہ باب میں ''عقائد'' کی وضاحت کی گئی ہے اور اب جو موضوع زیر بحث ہے اس کی تشریح کے لئے اس حدیث کے دوسرے نکتے کے حوالے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جامع فرمان سے صورتحال پوری طرح واضح ہو جائے گی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اسلام کے فرائض میں نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ شامل ہیں۔''

نماز:

(162) حدیث نبویؐ ہے: ''نماز دین کا ستون ہے۔''
قرآن مجید میں ایک سو سے زیادہ مرتبہ اس کی تاکید کی گئی اور کسی جگہ صلوٰۃ، کہیں دعا، ذکر، تسبیح اور انابہ کے نام سے اس کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

(163) زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کی فضا پیدا کرنے کے لئے اسلام نے ایک دن میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ یعنی فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ اسلام نے ضروری قرار دیا ہے کہ نماز مکمل یکسوئی کے ساتھ اللہ کے سامنے حاضری کے تصور کو ذہن میں رکھ کر ادا کی جائے اور دنیاوی معاملات کو چند منٹوں کے لئے ذہن سے جھٹک دیا جائے تاکہ اپنے معبود جو ہمارا خالق ہے کے حضور سجدہ شکر ہر قسم کی دنیاوی آلائشوں سے پاک ہو۔ نماز ہر بالغ مرد اور عورت پر فرض ہے۔

(164) جمعہ کے روز نماز ظہر ہفتہ وار اجتماعی نماز کی صورت میں ادا کی جاتی ہے جس میں مسلمان بڑے اہتمام کے ساتھ شرکت کرتے ہیں اور امام نماز سے قبل خطبہ بھی دیتا ہے۔ اظہار مسرت کے لئے مسلمانوں کو دو تہوار دیئے گئے ہیں۔ ایک ماہ رمضان کے بعد عید الفطر اور دوسرا حج بیت اللہ کے موقع پر عید الاضحیٰ۔ ان دونوں مواقع پر دو رکعت نماز عید ادا کی جاتی ہے جو معمول کی پانچ نمازوں کے علاوہ ہے۔ عید کے لئے مسلمان علی الصبح صاف یا نئے کپڑوں میں ملبوس ہو کر جمع ہوتے ہیں اور امام نماز کی ادائیگی کے بعد خطبہ دیتا ہے جب کوئی مسلمان فوت ہو جاتا ہے تو تدفین سے قبل اس کی مغفرت کے لئے نماز جنازہ پڑھی جاتی ہے جس میں دوسری نمازوں کے برعکس سجدہ نہیں کیا جاتا۔

(165) نماز کے پوشیدہ معانی اور غیر ظاہر اثرات کے بارے میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کہتے ہیں:

''یہ جان لو کہ کبھی کبھار ایسا ہو جاتا ہے کہ کسی کو آسمانی بجلی کی چمک جیسی تیزی کے ساتھ تخت خداوندی کی مقدس حدود میں لے جایا جاتا ہے اور وہ شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تخت سے ممکنہ حد تک قریب پاتا ہے اور پھر وہاں اس پر خدائے ذوالجلال کی تجلی نازل ہوتی ہے، جو اس کی روح کو سرشار کر دیتی ہے۔ وہ ایسی چیزیں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے جنہیں انسانی

زبان بیان کرنے سے قاصر ہے اور جب نور کی وہ کیفیت ختم ہوتی ہے تو وہ اپنی پہلی حالت میں واپس آ جاتا ہے۔ مگر بے خودی کی اس حالت کا اختتام اس کے لئے کربناک بن جاتا ہے اور پھر سرمستی وجذب کی اسی کیفیت کے دوبارہ حصول کے لئے اس کے اندر ایک جہد مسلسل شروع ہو جاتی ہے چنانچہ اپنے خالق کو جاننے یا حصول معرفت کی کوشش میں اس کی حالت مجذوبوں جیسی ہو جاتی ہے اور وقف اور فنا کی اس کیفیت میں وہ اللہ تعالیٰ سے کم و بیش ہم کلامی کا درجہ پالیتا ہے اور پھر اس سے مخصوص افعال سرزد ہوتے اور الفاظ اس کے منہ سے ادا ہوتے ہیں۔"

عبادت (نماز) بنیادی طور پر تین عناصر پر مشتمل ہے:

(i) دل (روح) کی عاجزی جو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے تصور سے جنم لیتی ہے۔ (ii) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور انسان کی بے مائیگی کو الفاظ کے بیان کے ساتھ تسلیم کرنا۔ (iii) جسمانی اعضا کی حرکت کے ذریعے خدا سے نسبت کا اظہار، ایک ایسی ہستی کے لئے جذبہ عبودیت کا مظاہرہ جس کے سامنے ہم ایستادہ ہوتے ہیں، مکمل یکسوئی کے ساتھ اپنا رخ اس کی جانب موڑے ہوئے۔ اور رکوع میں اس سے بھی زیادہ عجز کا اظہار اور سجدہ میں عجز کی انتہا کہ سر اور چہرہ زمین کے ساتھ مس ہو جاتا ہے۔ چونکہ انسان اپنے روحانی مدارج کی چوٹی پر درجہ بدرجہ ہی پہنچتا ہے۔ یہ بات ظاہر ہے ایسی معراج تینوں مراحل سے گزر کر ہی حاصل ہو سکتی ہے اور نماز ان تین حالتوں سے ہی تکمیل کو پہنچ پاتی ہے۔ یعنی قیام، رکوع اور سجود۔ اور اس تصور کے ساتھ کہ ہم قادر مطلق کے روبرو پیش ہیں اور یہ سب کچھ روحانی ارتقاء کے لئے کیا جاتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کے جلال و جمال اور انسان کے عجز و انکسار کا صحیح معنوں میں اظہار ہو سکے۔" (حجۃ البالغہ، جلد اول، نماز کے اسرار)

(166) قرآن پاک میں ارشاد ہے:

''کیا تو نہیں دیکھ رہا کہ اللہ کے سامنے سجدے میں ہیں سب آسمانوں والے اور سب زمین والے اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور جانور اور بہت سے انسان بھی......؟'' (18:22)

ایک اور مقام پر فرمان خداوندی ہے:

''ساتوں آسمان اور زمین اور جو بھی ان میں ہے اس کی تسبیح کر رہے ہیں، ایسی کوئی چیز نہیں جو اسے پاکیزگی اور تعریف کے ساتھ یاد نہ کرتی ہو، ہاں یہ صحیح ہے کہ تم اس کی تسبیح سمجھ نہیں سکتے......'' (44:17)

نماز میں دراصل تمام مخلوقات کی عبادات کی جو مختلف صورتیں ہیں وہ سمودی گئی ہیں۔ فلکی اجسام (سورج، چاند اور ستارے) ایک تسلسل کے ساتھ طلوع اور غروب ہوتے ہیں (گویا ''نماز'' کی رکعت پر رکعت پڑھ رہے ہیں) پہاڑ ایستادہ رہتے ہیں (گویا نماز کی حالت قیام میں ہیں) اور جانوروں کی تو زندگی ہی ''جھکے ہوئے'' گزرتی ہے (گویا حالت رکوع میں ہیں) جہاں تک درختوں کا تعلق ہے وہ خوراک زمین سے جوڑوں کے ذریعے حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح جڑیں ان کے منہ ہیں جو زمین کے اندر ہیں (گویا درخت منہ نیچے کیے مسلسل حالت ''سجدہ'' میں ہیں جو نماز کا رکن ہے)۔

اس کے علاوہ قرآن کے مطابق (11:8) پانی کے بنیادی فوائد میں سے ایک یہ ہے کہ وہ پاک کرتا ہے (اس کا وضو کے لئے درکار پانی سے موازنہ کیجئے)۔

قرآن پاک کی ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

''(بادلوں کی) گرج اس کی تسبیح و تعریف کرتی ہے......'' (13:13)

اور اس فرمان سے ہمیں ''اللہ اکبر'' کا آواز بلند کہنا ذہن میں آتا ہے جسے ہم نماز میں کئی مرتبہ ادا کرتے ہیں کہ کسی نماز کے دوران باقی تسبیحات بالجہر یعنی آواز کے ساتھ نہ بھی ادا کی جائیں مگر امام اللہ اکبر بآواز بلند ادا کرتا ہے جب کہ کچھ نمازوں (یعنی فجر، مغرب، عشا اور نماز جمعہ) کے دوران تسبیحات اور تلاوت بالجہر ہی ادا کی جاتی ہے۔ پرندوں کے غول بھی اللہ کی تعریف و تسبیح کرتے ہیں۔ (قرآن 41:24)

جیسا کہ مسلمان نماز باجماعت ادا کرتے ہیں اور پھر جو سایہ گھٹتا اور بڑھتا ہے (جو نماز کے دوران مختلف حالتوں کی علامت ہے۔ بحوالہ قرآنی آیات 13:15-16:48) اسی طرح انسان نماز کے دوران قیام، رکوع، سجود اور قعدہ کی پوزیشنیں اختیار کرتے ہیں، عبادت کا یہ طریقہ صرف انسانوں کے لئے مخصوص ہے۔

(166۔الف) یہ بات قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تعریف کے مختلف طریقوں کیلئے اجتماعی اصطلاح ''عبادت'' ہے جس کا مادہ ''عبد'' ہے جس کے معنی ہیں بندہ یا غلام۔ دوسرے لفظوں میں عبادت سے مراد خدمت یا کام ہے جو غلام اپنے آقا کے حکم یا خواہش پر بجا لاتا ہے۔ خدا کا پہاڑوں کے لئے حکم ہے کہ وہ سیدھے کھڑے رہیں۔ جانوروں اور پرندوں کو جھکے رہنے، پودوں کو مستقل حالت سجدہ میں رہنے کا حکم ہے۔ ان کی اپنے آقا کی خدمت اور عبادت یہی ہے۔ ہر ایک مخلوق کی زندگی میں وہی چیز اس کے لئے موزوں ہوتی ہے جو اس کے خالق اور آقا کی خواہش ہوتی ہے۔ اور انسان کے لئے بھی جو اشرف المخلوقات اور زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے وہی کچھ فطری اور معقول بن جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ اس سے چاہتا ہے۔

(166۔ب) وضو کے ذریعے جسم کو پاک کرنا نماز کی صحیح ادائیگی کے لئے لازم ہے۔ جس کا تفصیلی تذکرہ آئندہ صفحات میں (پیراگراف نمبر 549) آئے گا۔ ایک مسلمان فلسفی نے بڑے احسن انداز میں اس کی اہمیت واضح کی ہے۔ وضو کے لئے ہاتھ، منہ، (کلی کرنا) ناک (میں پانی ڈالنا) چہرہ، بازو، سر، کان (دونوں کا مسح کیا جاتا ہے) اور پاؤں دھونا ہوتے ہیں۔ ان اعضا کو دھونے سے نہ صرف ظاہری صفائی ہو جاتی ہے بلکہ یہ ماضی کے گناہوں سے توبہ اور آئندہ گناہوں سے بچنے کا عہد بھی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ وضو کے دوران جو اعضا دھوئے جاتے ہیں ان کا تعلق کئی قسم کی بداعمالیوں سے ہے۔ ہاتھ حملہ کرتے ہیں، منہ یعنی زبان سے باتیں کی جاتی ہیں، ناک سونگھتی ہے، چہرہ یا وجود مقام و مرتبہ کا غلط استعمال کرتا ہے اور اثر و رسوخ اور دباؤ کا حربہ اختیار کرتا ہے۔ بازو پکڑتے ہیں، سر یعنی دماغ غلط منصوبے سوچتا اور سازشیں کرتا ہے۔ کان سنتا ہے اور پاؤں چل کر ان برے کاموں کی طرف جاتے ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے، جہاں تک جنسی گناہ (بدکاری) کا تعلق ہے تو اس کے لئے وضو شروع کرنے سے پہلے ہی نجات حاصل کرنا ہوتی ہے اور اس سے پاک ہونے کا عمل طہارت خانہ کے اندر ہوتا ہے۔ پاک صاف ہونے کے لئے جو دعائیہ کلمات ہر عضو کے دھونے کے دوران ادا کئے جاتے ہیں یہ بہت پُر معنی اور موقع سے

مناسبت رکھتے ہیں: طہارت خانہ میں ہم یہ دعا کرتے ہیں:

''اے میرے رب میرے دل کو منافقت سے پاک کر دے اور میرے اعضائے صنفی کو شرمناک فعل اور بدکاری سے محفوظ رکھ۔''

وضو کا ارادہ کرتے وقت یہ دعا کی جاتی ہے:

''تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے پانی کو پاک اور پاک کرنے والا بنایا۔''

چہرہ دھوتے وقت یہ دعا مانگتے ہیں:

''(اے میرے رب) میرا چہرہ قیامت کے روز چمکتا ہوا ہو سیاہ نہ ہو۔''

بازو دھوتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے:

''(اے میرے رب) مجھے صرف اچھے کاموں کی توفیق دے اور برے کاموں سے مجھے دور رکھ، قیامت کے روز میرا اعمال نامہ میرے دائیں ہاتھ میں دینا اور میرے حساب کتاب کو میرے لئے آسان کر دے۔''

سر پر مسح کرتے وقت یہ دعا پڑھنی چاہیے:

''اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔''

کانوں کا مسح کرتے ہوئے جو دعا پڑھی جاتی ہے وہ یہ ہے:

''اے میرے رب! میرے کانوں میں صرف تمہارے کلام اور تمہارے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے فرامین کی آواز ہی پڑے۔''

پاؤں دھونے کی یہ دعا ہے:

''اے میرے رب! پل صراط پر سے گزرتے وقت مجھے ثابت قدم رکھنا کہ میرے قدم ڈگمگا نہ جائیں، جس دن تمہارے دوست ثابت قدم رہیں گے اور تمہارے دشمن کے پاؤں ڈگمگا جائیں گے۔''

' مسلمانوں کے لئے پانچ نمازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج کے موقع پر فرض ہوئیں۔ اس حوالے سے فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ مومن کی نماز اس کے لئے

معراج ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کے حضور لے جاتی ہے۔ یہ محض خالی الفاظ نہیں ہیں۔ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان نماز کے دوران کون سے فرائض ادا کرتا ہے۔ سب سے پہلے وہ کھڑا ہو کر ہاتھ کانوں تک لے جا کر پیٹ کے اوپر باندھ لیتا ہے اور کہتا ہے "اللہ اکبر" (اللہ سب سے بڑا ہے) اور اس طرح اللہ کے سوا سب کی نفی کر دیتا ہے اور اپنے آپ کو خدا کے حضور پیش کر دیتا ہے۔ اس دوران وہ تسبیح و حمد کے بعد اپنے آپ میں اس قدر عجز و انکسار پاتا ہے کہ اپنے وجود کو اللہ کی بارگاہ میں جھکا دیتا ہے۔ رکوع کی حالت میں کہتا ہے " سبحان ربی العظیم " (پاک ہے میرا رب جو بڑی عظمت والا ہے) پھر وہ کھڑا ہو کر راہ ہدایت دکھانے پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور کہتا ہے "سمع اللہ لمن حمدہ. ربنا لک الحمد" (اللہ نے اس بندے کی بات سن لی جس نے اس کی تعریف کی۔ اے ہمارے پروردگار تیرے لئے تمام تعریفیں ہیں) پھر اللہ کی کبریائی کے سامنے وہ اس قدر کمزوری محسوس کرتا ہے کہ اپنا ماتھا زمین پر ٹیک کر سجدے میں گر جاتا ہے اور کہتا ہے " سبحان ربی الاعلی" (پاک ہے میرا پروردگار اونچی شان والا)

نماز مسلمان کی معراج کیسے؟

بندہ ان عبادات کی کثرت سے اپنے جسم کو ان روحانی مشقوں کا عادی بناتا ہے اور درجہ بدرجہ خدا کا اتنا مقرب بن جاتا ہے کہ وہ مقام آجاتا ہے کہ اسے مادی دنیا سے اٹھا کر آسمان کی وسعتوں سے گزار کر بارگاہ رب العزت میں حاضر کر دیا جاتا ہے جہاں وہ خدا کی طرف سلام بھیجتا ہے اور اسے اپنے سلام کا جواب بھی ملتا ہے۔ دراصل وہ اس مقصد کے لئے وہی طریقے اختیار کرتا ہے جو معراج کے دوران اختیار کئے گئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ سے شرف ہم کلامی حاصل کیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ جل شانہٗ کو سلام کیا اور جواب میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صلوٰۃ بھیجی۔

(168) نماز کی روحانی اہمیت تو دیکھ لی اس کے دنیاوی فوائد بھی بے شمار ہیں۔ اس کے باعث آبادی کے مکین پانچ وقت ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں۔ ڈیوٹی اور کاموں کی یکسانیت سے چند منٹ کے لئے فراغت کا موقع میسر آجاتا ہے۔

بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا شخص بھی بالکل برابر کی سطح پر ایک جگہ حاضری دیتے ہیں۔ (یہ اس لئے کہ علاقے کا حاکم نماز کی امامت بھی کرواتا ہے) اور دارالحکومت میں

بڑی جامع مسجد میں سربراہ مملکت امامت کے فرائض ادا کرتا ہے۔اس طرح ایک عام آدمی نہ صرف اپنے جیسے دوسرے لوگوں سے ملتا ہے بلکہ علاقے کے حکام تک بھی اس کی بلا روک ٹوک رسائی ہو جاتی ہے۔نماز کا ایک سماجی پہلو یہ ہے کہ مومن اپنے اردگرد خدا کی حاکمیت محسوس کرتا ہے اور ایک گونہ فوجی نظم وضبط کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔جونہی مؤذن کی آواز آتی ہے تمام مسلمان مسجد کی طرف لپکتے ہیں اور امام کے پیچھے صفیں باندھ کر کھڑے ہوتے اور اس کی تقلید میں سب ایک جیسی حرکات اور فرائض بجالاتے ہیں۔اس کے علاوہ مسلمان دنیا کے کسی بھی خطے میں ہوں تو وہ ایک ہی جانب رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ان کا رخ کعبہ یعنی بیت اللہ کی طرف ہوتا ہے جو مکہ میں ہے اور یہ اونچ نیچ ،نسل اور خطے کے کسی بھی قسم کے امتیاز کے بغیر اتحاد بین المسلمین کا بہترین مظاہرہ ہے۔

(169) اللہ کے نزدیک پسندیدہ عبادت نماز باجماعت ہے۔لیکن اگر نماز باجماعت کا اہتمام ممکن نہ ہو تو عورت ہو یا مرد انفرادی نماز کی ادائیگی کی بھی اجازت ہے۔

پانچ نمازوں کی ادائیگی کا مطلب ہے کہ آپ دن کے 24 گھنٹوں میں محض 24 منٹ اللہ کے حضور حاضری دیتے اور اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔حالانکہ مومن کو چاہیے کہ وہ ہر وقت خدا کو یاد رکھے،خوشی کا موقع ہو یا غم کا۔کام پر ہو یا بستر میں یا کسی دوسری مصروفیت میں ہو۔اس حوالے سے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

> ”......(وہ صاحب فہم ہیں) جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں غور وفکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ (کائنات) بے فائدہ نہیں بنائی......“(91-92:3)

اللہ تعالیٰ نے یہ کائنات انسان کے استعمال اور فائدے کے لئے اس کے تابع کر دی ہے مگر اس سے فائدہ اٹھانے کے ساتھ اللہ کے خلاف سرکشی نہیں اس کی شکرگزاری اور اطاعت کی جانی چاہیے۔اور دوسرے انسانوں پر ظلم وستم اور ناانصافیوں سے باز رہنا چاہیے۔

(170) یہ امر قابل ذکر ہے کہ جب نماز فرض کی گئی تو یہ قرآنی آیت نازل ہوئی:

> ”اللہ تعالیٰ کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“
> (286:2)

درحقیقت اللہ تعالیٰ کسی بھی فرد کا ارادہ اور حسن نیت دیکھتا ہے اہمیت زیادہ عبادت یا کسی حکم الٰہی کی تعمیل کے ظاہری طریقے کو حاصل نہیں۔ اگر کوئی سچا مسلمان دیانت داری یا صمیم قلب کے ساتھ یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی مجبوری یا معذوری کے باعث پانچ اوقات نماز ادا کرنے سے قاصر ہے تو وہ چار اوقات پڑھ لے، تین، دو یا پھر ایک ہی بار ساری نماز ادا کرنا بھی جائز ہے۔ اس کا انحصار مواقع اور حالات یا (پانچ نمازوں کی راہ میں) رکاوٹ کے دورانئے پر ہے۔ اصل اہمیت یہ ہے کہ کوئی شخص دنیاوی اور دیگر مصروفیات میں خدا کی طرف سے عائد فرائض کو یکسر بھول نہ جائے۔ لیکن یہ رعایت صرف غیر معمولی حالات میں جائز ہے مثلاً کوئی بیمار ہو جائے اور اس میں بے ہوش ہو جائے یا اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد دیگر ذمہ داریوں کی نزاکت سے اسے نماز کی فرصت ہی نہ رہے اور یہ روایت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں موجود ہے۔ جنگ خندق کے دوران حالات کی نزاکت کے پیش نظر ظہر، عصر، مغرب اور عشاء کی نمازیں رات گئے اکٹھی ادا کیں کیونکہ دشمن کے دباؤ کے باعث مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی دفاعی پوزیشنوں سے ہٹنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ (مقریزی، انفاء، I، 233)

اس کا مطلب یہ ہوا کہ دن میں نمازیں (پانچ کی بجائے) دو بار ادا کی گئی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ وہ حدیث کے مطابق (بخاری، مسلم، ترمذی، ابن حنبل، مالک خاص طور پر صحیح مسلم کتاب الصلوٰۃ باب الجمع بین الصلاتین فی الحضر نمبر 54,50,49) بعض اوقات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہر اور عصر اور مغرب اور عشاء کی نمازیں (بغیر کسی عذر کے) جمع کر کے بھی پڑھتے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمن کا خوف تھا نہ ہی سفر کا مسئلہ درپیش تھا۔ دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کسی مشکل میں نہ پڑے۔"

اس حدیث میں ایک روز کے دوران تین دفعہ نماز پڑھی گئی (یعنی پانچ نمازیں تین اوقات میں پوری کی گئیں) دراصل یہ سب کچھ ہر شخص کے ضمیر پر منحصر ہے جو انفرادی طور پر اللہ تعالیٰ کو جوابدہ ہے جس کو وہ دھوکہ دے سکتا ہے اور نہ ہی اس سے کچھ چھپا سکتا ہے۔ مسئلہ پھر اوقات کا ہے۔ یہ بات ہمارے علم میں ہے کہ معمول کے خطوں میں واقع ممالک (استوائی اور منطقہ حارہ کے ممالک) اور قطبین کے قریب واقع ملکوں میں طلوع آفتاب اور غروب کے اوقات میں نمایاں فرق ہے۔ البیرونی نے (بحوالہ الجماہر) لکھا ہے کہ قطبین پر سورج چھ مہینے مسلسل حالت

غروب اور مسلسل چھ ماہ حالت طلوع میں رہتا ہے۔ (سوائے ان ایام کے جب رات اور دن برابر ہوتے ہیں) علوم اسلامیہ کے ماہرین عمومی طور پر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ 45 درجے متوازی کے اوقات ہی 90 درجے متوازی کے لئے شمار ہوتے ہیں یعنی قطبین تک اور ان خطوں میں جو 45 اور 90 درجے کے درمیان واقع ہیں نماز، روزوں اور دیگر فرائض کے لئے سورج کے طلوع وغروب کی بجائے گھڑی کے اوقات کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔

(171) عورتوں کو ماہانہ ایام (پیریڈز) اور زچگی میں نمازوں کی ادائیگی سے رخصت حاصل ہے۔

روزے:

(172) اسلام کے ماننے والوں کے لئے دوسرا فرض ہر سال ایک مہینے کے روزے رکھنا ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ روزہ دار ماہ رمضان کے دوران ہر روز کھانے، پینے اور تمبا کو نوشی (انجکشن بھی اسی حکم میں ہیں) سے مکمل پرہیز کرے۔ یہ پابندی استوائی اور منطقہ حارہ کے ممالک میں علی الصبح سے غروب آفتاب تک اور گلوب پر خط استوا سے دور واقع ممالک کے لئے 45 درجے متوازی کی بنیاد پر (جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے) متعین کئے گئے اوقات کے دوران کرنا ہوگی۔

بیمار افراد کے لئے روزے کی پابندی سے چھوٹ کا تذکرہ بعد میں پیراگراف نمبر 174 میں آرہا ہے۔ لازم ہے کہ کھانے پینے سے پرہیز کے ساتھ ساتھ جسمانی خواہشات اور روحانی ضبط کے منافی کاموں سے بھی کنارہ کشی کی جائے۔ یہ پابندیاں دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو یقیناً مشکل محسوس ہوتی ہیں لیکن صدیوں کے مشاہدے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جب صمیم قلب کے ساتھ کوئی غیر مسلم دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے تو وہ بہت جلد ان تمام معمولات کا عادی ہو جاتا ہے اور اسے ان پابندیوں کے ساتھ چلنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔

(173) روزہ کا دورانیہ پورے ایک مہینے کا ہوتا ہے اور اسلام میں قمری کیلنڈر چلتا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ ماہ رمضان باری باری تمام موسموں سے گزرتا ہے اور اہل اسلام خزاں، بہار، سردی، گرمی میں روزوں کی آزمائش سے گزرتے ہیں۔ لو کے تھپیڑے ہوں یا برفیلی ہواؤں کی لہر، مسلمان اس احساس مسرت کے ساتھ روزے رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم کی اطاعت کر رہے ہیں اور وہ اس نظم وضبط کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ موسم کی شدت ان کے عزم کو کمزور کرنے کی

بجائے انہیں مزید توانائی دیتی ہے۔اس کے ساتھ ساتھ روزہ داروں کو جسمانی عوارض سے نجات اور فوجی تربیت جیسے کڑے نظم وضبط اور مضبوط قوت ارادی کے ساتھ زندگی گزارنے کے اضافی فائدے بھی حاصل ہوتے ہیں، جو نماز سے ملنے والے فوائد کے علاوہ ہیں۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ صرف فوجی سپاہی ہوتے ہیں جو محاصرہ یا جنگ کے دوران کھانے پینے سے بے نیاز ہو کر دفاع کی ذمہ داری ادا کرتے ہیں اور اس طرح سب سے بڑھ کر وہی ہیں جنہوں نے عملاً یہ ثابت کر دیا ہے کہ بھوک اور پیاس کے باوجود روزمرہ کے معمولات بلا رکاوٹ جاری رکھے جا سکتے ہیں۔اس لئے وہ حاکم یا فوجی سربراہ انتہائی احمق ہوگا جو رمضان میں سپاہیوں کو روزے رکھنے سے روکے گا، تاہم یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ روزے کا بنیادی مقصد خدا کی خوشنودی کے لئے ایک مذہبی فرض کی ادائیگی اور ایک روحانی مشق سے گزرنا ہے اور اگر کوئی دنیاوی مقاصد کے لئے روزہ رکھتا ہے مثلاً ڈاکٹر کے مشورے پر بغرض علاج، تو یہ خدا کی طرف سے عائد فرض کی ادائیگی شمار ہوگی نہ ہی اسے اس کے روحانی فوائد حاصل ہوں گے۔

(174) خواتین اپنے ایام کے دوران روزہ رکھنے کی پابندی سے مستثنیٰ ہوتی ہیں تاہم نمازوں کے برعکس کہ اس دوران نمازیں معاف ہوتی ہیں چھوڑے ہوئے روزے رمضان المبارک گزرنے کے بعد رکھنا پڑتے ہیں۔یہی رعایت بیمار کے لئے ہے کہ اگر وہ رمضان المبارک کے دوران اتنا علیل ہے کہ روزے نہیں رکھ سکتا تو وہ بعد میں رکھ لے۔مگر بہت معمر افراد (اور دائمی مریض، ناقابل علاج بیماری میں مبتلا) روزے نہ بھی رکھیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں، تاہم اگر ان کے پاس وسائل ہوں تو رمضان کے ان روزوں کے عوض ہدیہ دے دیں جو ایک روزے کے لئے ایک غریب کا کھانا کھلانے کے برابر ہے (اگر کھانا کھلانا ممکن نہ ہو تو اس کے برابر خشک راشن یا نقد رقم بھی کسی غریب یا ضرورت مند کو دی جا سکتی ہے۔(مترجم)

(175) یہ امر قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محض زیادہ ثواب کی خاطر روزے کو کئی روز تک لمبا کرنے (مثلاً 48 یا 72 گھنٹے تک) سے منع فرمایا ہے یا پورا سال روزے رکھنے یا عمر بھر کی روزہ داری کی بھی اسلام میں اجازت نہیں۔فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:
''تم پر تمہاری جانوں کا بھی حق ہے''۔رمضان کے فرض روزوں کے علاوہ نفلی روزے رکھنے کی بھی فضیلت ہے اور اس مقصد کیلئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک وقت میں دو روزے کافی ہیں۔طبی نقطہ نظر سے مسلسل روزے رکھنے سے وہ فوائد حاصل نہیں ہوتے جو

کبھی کبھار روزہ سے حاصل ہوتے ہیں۔ایک ماہ سے کم روزے رکھنے سے کوئی قابل ذکر اثرات مرتب نہیں ہوتے اور 40 روز سے زیادہ رکھنے سے یہ عمل محض ایک معمول بن کر رہ جاتا ہے۔

(175۔الف) یہ کہنا محض غلط العام مفروضہ ہے کہ سرد موسم میں کھانے پینے سے گھنٹوں پرہیز انسانی صحت کے لئے مفید نہیں۔جنگلی جانوروں کی زندگی کے معمولات کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ وہ برفباری کے دوران عملاً خوراک سے مکمل محروم رہتے ہیں۔وہ اس دوران سوتے یا پھر اپنا وقت فاقہ کشی (روزے جیسی کیفیت) میں گزارتے ہیں اور موسم بہار کا آغاز ہوتے ہی از سرنو فعال ہو جاتے ہیں۔یہی صورتحال درختوں کے حوالے سے بھی ہے کہ موسم سرما میں ان کے تمام پتے جھڑ جاتے ہیں اور وہ ''نیند'' کے عالم میں چلے جاتے ہیں۔اور اس دوران انہیں پانی دینے کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔چند ماہ کی اس ''فاقہ کشی'' کے بعد موسم بہار کی آمد پر وہ دوبارہ نئے پتے اور پھول لے آتے ہیں اور ان پر بھرپور جوبن آ جاتا ہے۔درحقیقت تمام جسمانی اعضا کی طرح نظام ہضم کو بھی آرام کی ضرورت پڑتی ہے اور کچھ عرصہ کھانے پینے سے پرہیز اس کے تقاضے پورے کرسکتا ہے۔آج کل تمام مغربی ممالک میں ایک نیا طریقہ علاج وجود میں آ گیا ہے جس کے تحت فاقہ کشی کے چھوٹے اور لمبے وقفوں کے ذریعے بالخصوص پرانی بیماریوں کا علاج کیا جاتا ہے۔

(175۔ب) انسانی معاشرے کا یہ ایک قدیم معمول ہے کہ اپنی آمدنی کا دسواں حصہ اللہ کی راہ میں دے دیا جائے۔زرعی پیداوار کا عشر اس کی ایک مثال ہے۔روزہ بھی ہمارے کھانے کا عشر ہے۔جو ہم اللہ کے حضور پیش کرتے ہیں اس کے ساتھ ہی ایک اصول یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کا انعام دس گنا عطا کرتا ہے (قرآن مجید میں بھی اس کی تائید آئی ہے ''جو شخص نیک کام کرے گا اس کو اس کے دس گنا ملیں گے۔'' (160:6)

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ کی بھی وضاحت کردیتا ہے ''جو کوئی رمضان کے پورے اور (عید کے بعد) شوال میں 6 روزے مزید رکھے وہ اس طرح ہے جیسا کہ اس نے پورے سال کے روزے رکھے۔''

یہ اس طرح ہے کہ اسلام کے قمری کیلنڈر کے مطابق سال میں 355 دن ہوتے ہیں جبکہ کچھ قمری مہینے تیس اور کچھ انتیس دن کے ہوتے ہیں۔اس لئے اس فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق جو مسلمان روزے رکھے وہ گویا 35 یا 36 دن روزے رکھتا ہے جس کا دس گنا 350 یا 360 دن ہوتے ہیں اور اس کا اوسط 355 ہے اور اتنے ہی دن قمری سال میں ہوتے ہیں۔

(176) صوفیائے کرام (عارفین) لوگوں کا کہنا ہے کہ غصے یا جذبات کا حیوانی انداز کا اظہار انسانی روح کی تکمیل کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اس لئے بدن کو روح کے تابع کرنے کے لئے بدن کی طاقت کو توڑنا اور روح کی طاقت کو بڑھانا ضروری ہے۔ اور یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لئے بھوک، پیاس، جسمانی خواہشات سے پرہیز اور زبان، دل (دماغ) کے ناپسندیدہ خیالات اور دوسرے اعضاء پر کنٹرول میں کارآمد کوئی اور طریقہ نہیں۔ تکمیل ذات کا ایک پہلو یہ ہے کہ حیوانی فطرت کو ہوشمندی اور روح کے تابع رکھا جائے۔ فطرت (جبلت) بعض اوقات بغاوت کرتی ہے جبکہ بعض اوقات اس کا طرز عمل عاجزانہ ہوتا ہے اس لئے حیوانیت پر قابو پانے کے لئے سخت ریاضت کی ضرورت ہے مثلاً روزے رکھ کر، اگر کسی سے گناہ کا ارتکاب ہو جائے تو توبہ اور روزے رکھ کر نفس کشی کے عمل سے گزر کر شائد اس کی روح پاک ہو جائے اور اسے تسکین مل جائے۔

یہ بھی تذکرہ ہے کہ کھانا اور پینا فرشتوں کا معمول نہیں ہے اور روزے رکھ کر انسان فرشتوں سے مشابہ ہونے کی کوشش کرتا ہے اور چونکہ اس کے اعمال کا مطلوب و مقصود خدا کی خوشنودی کا حصول ہے تو اس کے نتیجے میں وہ خدا تعالیٰ کے قرب کو پالیتا ہے اور اس کی خوشنودی کا انعام بھی اسے ملتا ہے اور یہی انسان کی حتمی خواہش ہے۔

حج:

(177) حج کے لفظی معنی ہیں سفر (خدا کی طرف)۔ اس کے علاوہ اس سے مراد کسی چیز کو مغلوب کرنا (اس معاملے میں اپنے نفس کو) روایتی طور پر اس کا جو ترجمہ انگریزی میں کیا جاتا ہے Pilgrimage (ہجرت)۔ اس کا حج کی حقیقی معنویت اور اہمیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حج اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ حج (وسائل رکھنے والے) ہر بالغ مسلمان مرد اور عورت پر کم از کم زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ حج کا مقصد یہ ہے کہ سفر مکہ (اور مدینہ) کی مشکلات جھیلتے ہوئے اپنی اناؤں کو ختم کر کے (سب امیر غریب ایک جیسے لباس میں ملبوس) اللہ کی رضا کے حصول کے لئے نکلیں۔ اس سفر کے مالی وسائل نہ رکھنے والے اس فرض کی ادائیگی سے مستثنیٰ ہیں۔ مگر شاید ہی کوئی مسلمان ہوگا جو غربت کو اس سفر کی راہ میں حائل ہونے دے گا۔ بہت سے لوگ عمر بھر پائی پائی جوڑ کر اس سفر مقدس کے لئے زاد راہ اکٹھا کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید جب یہ کہتا ہے تو یہ ہرگز

مبالغہ نہیں کہ یہ (کعبہ) دنیا میں قدیم ترین گھر ہے جو انسانوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے وقف کیا۔

"اللہ تعالیٰ کا پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا ہے وہی ہے جو مکہ (شریف) میں ہے جو تمام دنیا کے لئے برکت و ہدایت والا ہے۔"

(96:3)

اگر ہم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں غور کریں جنہوں نے آدم علیہ السلام کے بنائے ہوئے کعبہ کی از سر نو تعمیر کی تو ثابت ہو جاتا ہے کہ کعبہ شریف ہیکل سلیمانی (بیت المقدس) سے بھی قدیم ہے۔ دنیا میں کوئی اور ایسا مقام نہیں جو بیت اللہ سے قدیم ہو اور جہاں اب بھی خدائے واحد کی عبادت ہو رہی ہو۔

(178) حج کے ارکان مختصراً یہ ہیں۔ مکہ کے نواح میں بیت اللہ کی شرعی حدود میں داخلے سے قبل مرد ایک نیا لباس زیب تن کرتے ہیں جو سفید کپڑے کی دو چادروں پر مشتمل ہے۔ ایک کو بطور تہبند استعمال کیا جاتا ہے اور دوسرے کو کندھے کے اوپر سے اوڑھ لیا جاتا ہے (جیسے بُکل مارتے ہیں) سر ننگا رکھا جاتا ہے۔ عورتوں کے لئے اس لباس کے پہننے کا حکم نہیں ہے۔ ایام حج میں جو ماحول بن جاتا ہے اس میں حاجیوں کو سوائے عبادات اور ارکان حج کی تکمیل کے کسی اور چیز کا ہوش نہیں ہوتا۔ حج کے ارکان میں عرفات جانا بھی شامل ہے جہاں حج کا رکن اعظم وقوف ادا کیا جاتا ہے۔ اسی روز شام کو غروب آفتاب سے قبل میدان عرفات سے نکل کر مزدلفہ پہنچتے ہیں جہاں رات کھلے آسمان تلے گزار کر اگلے روز منیٰ جاتے ہیں جہاں تین روز تک قیام کیا جاتا ہے جس کے دوران روزانہ شیطان کو کنکر مارے جاتے ہیں اور قربانی کی جاتی ہے اور پھر واپس مکہ آ کر طواف بیت اللہ اور صفا مروہ کے درمیان سعی کی جاتی ہے۔ حج کے ان فرائض کا پس منظر مختصراً اس طرح ہے:

(179) جنت سے اخراج کے بعد آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو جب زمین پر اتارا گیا تو وہ ایک دوسرے سے جدا اور اس بات سے بے خبر ہو گئے کہ دوسرا کہاں ہے مگر ایک دوسرے کی تلاش کے لئے سرگرداں رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کی رحمت سے انہوں نے ایک دوسرے کو پالیا۔ ان کی یہ ملاقات عرفات کے مقام پر ہوئی۔ اس مہربانی پر اظہار شکر کے لئے اولاد آدم لاکھوں کی تعداد میں یہاں جمع ہوتی ہے اور عجز و انکسار سے سجدہ عبودیت بجالاتے ہوئے اپنے

گناہوں اور کوتاہیوں پر ندامت کا اظہار کر کے اللہ تعالیٰ سے خطاؤں سے درگزر کرنے کی التجائیں کرتی ہے۔

(180) شیطان کو کنکریاں مارنے کا پس منظر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے عظیم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اپنے خدا سے محبت کی آزمائش اس طرح ہوئی کہ انہیں خواب میں حکم ملا کہ اپنے بیٹے اسماعیل کو اللہ کی راہ میں قربان (ذبح) کر دو۔ وہ تیار ہو گئے اور کم سن اسماعیل کو لیکر مذبحہ کی طرف چل دیئے۔ اس موقع پر شیطان نمودار ہوا اور اس نے ابراہیم علیہ السلام کو اس کام سے روکنے کی کوشش کی۔ کہا جاتا ہے کہ شیطان نے یہ حرکت منیٰ کے مقام پر کی مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان کو کنکر مار کر دور جانے کا کہا، پھر اس نے دوسری کوشش اسماعیل کی والدہ ہاجرہ کی ممتا کو آواز دے کر کی کہ وہ اپنے شوہر کو اس سے روکیں مگر انہوں نے بھی اس پر پتھر پھینکے جس کے بعد آخری کوشش خود اسماعیل کے ساتھ کی کہ وہ کمسن بچے تھے مگر انہوں نے بھی شیطان کو دھتکار دیا اور اس پر پتھر مارے۔ اس سنت کو زندہ رکھنے کے لئے حاجی تین مقامات پر شیطان کو کنکریاں مارتے اور شیطانی ترغیبات سے بچنے کا عہد کرتے ہیں۔

(181) بیت اللہ میں حاضری خود اپنی وضاحت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت، عبودیت اور فرمانبرداری کے اظہار کے لئے حاجی عقیدت سے لبریز عاجزی اور انکساری کے پیکر بن کر اللہ کے گھر میں حاضر ہوتے ہیں کسی چیز سے عقیدت اور محبت کے بے پایاں اظہار کے لئے اپنے آپ کو قربان کر دینے پر آمادگی کا اظہار اس کے گرد پھیرے لگا کر کرنا قدیم روایت ہے۔

(181۔الف) بہت سی غلط فہمیوں کے ازالہ کے لئے حجر اسود کا خصوصی تذکرہ ضروری ہے۔ یہ کسی شہاب ثاقب کا ٹکڑا نہیں بلکہ ایک ایسا سیاہ رنگ کا پتھر ہے اس کی عملی اہمیت تو یہ ہے کہ یہ طواف کعبہ کے آغاز کا مقام ہے۔ اپنی سیاہ رنگت کے باعث یہ عمارت میں آسانی سے نظر آ جاتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حجر اسود کو سجدہ نہیں کیا جاتا بلکہ کعبہ شریف کی تمام چیزوں کے سامنے سجدہ کیا جاتا ہے بلکہ زائر کی توجہ کا مرکز حجر اسود کے سوا باقی کعبہ ہوتا ہے۔ یاد رہے کہ قرامطہ نے جب 318 ہجری / 930ء میں مکہ پر حملہ کیا تو بیت اللہ کی حرمت بھی پامال کی اور حجر اسود کو اکھاڑ کر ہمراہ لے گئے اور اکیس برس تک ان کی تحویل میں رہا۔ اس دوران کسی حاجی نے اس مقام (اومان) کی طرف منہ نہ کیا جہاں اسے رکھا گیا تھا بلکہ بدستور بیت اللہ ہی مسلمانوں کی عقیدت اور محبت کا مرکز بنا رہا۔ حتیٰ کہ بیت اللہ کی عمارت کی بھی اہمیت نہیں۔ اہمیت اس جگہ کو ہے جہاں یہ تعمیر کی گئی۔ اگر تعمیر و مرمت

کے لئے کعبہ کی عمارت گرادی جائے تو مسلمان اس مقام کا طواف کرتے رہیں گے جس پر اسے تعمیر کیا گیا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ حجر اسود کی عملی اہمیت اور افادیت تو یہ ہے کہ یہ طواف کے آغاز اور اختتام کی علامت ہے اس کے علاوہ اس کی ایک علامتی اہمیت بھی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث مبارکہ میں اسے ''یمین اللہ'' (اللہ کا دایاں ہاتھ) اور با مقصد قرار دیا۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ حاجی اس مقام پر اللہ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر اپنے خالق سے وفاداری اور اطاعت کا عہد کرتا ہے۔ قرآنی زبان میں اللہ تعالیٰ بادشاہ (قادر مطلق) ہے اور اس کے پاس نہ صرف خزانے اور لشکر ہیں بلکہ ایک قلمرو بھی ہے اور اس قلمرو کا دارالحکومت بھی ہے (ام القریٰ) اور اس ''دارالحکومت'' میں ''بادشاہ کا محل'' (بیت اللہ، اللہ کا گھر) بھی ہے۔ رعایا کے کسی فرد کو اگر بادشاہ سے وفاداری کا عہد کرنا ہے تو ایسے شاہی محل میں ذاتی طور پر حاضر ہو کر باضابطہ اس کی تکمیل کرنا ہوگی۔ اس طرح حجر اسود ان دیکھے خدا کے دائیں ہاتھ کی علامت ہے۔

(182) صفا اور مروہ نامی پہاڑیوں کے درمیان ''سعی'' (تیز چلنا اور ایک مقام پر دوڑنا) کے پس منظر میں بھی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ واقعات کے مطابق ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ ہاجرہ علیہا السلام اور نوزائیدہ بچے اسماعیل علیہ السلام کو ایک بے آب و گیاہ ویرانے میں (جس جگہ آج کا مکہ آباد ہے) چھوڑ کر واپس اپنے وطن (عراق) چلے گئے۔ جب ساتھ لایا ہوا پانی ختم ہو گیا تو پیاس سے تڑپتے بچے کے لئے پانی کی تلاش میں ہاجرہ علیہا السلام ان دو پہاڑوں کے درمیان بار بار چکر لگاتی تھیں (اور جس مقام پر بچہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا وہ جگہ دوڑ کر عبور کرتی تھیں تاکہ جلدی سے بچہ دوبارہ ان کی نظروں کے سامنے آ جائے۔ صفا مروہ کے درمیان وہ مقام ''میلین اخضرین'' کہلاتا ہے۔ (مترجم) اور پھر وہاں زمزم کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ حاجی جو سعی کے سات چکر لگاتے ہیں وہ ہاجرہ علیہا السلام کی اسی سنت کی یادگار ہے۔

(183) اس کا سماجی پہلو بھی کم اہم نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مابین عالمگیر اخوت کا یہ شاندار مظاہرہ ہے۔ نسل، زبان، جائے پیدائش یا طبقہ کے امتیاز کے بغیر ایک فرض سمجھ کر وہاں جاتے ہیں اور ایک دوسرے میں برادرانہ مساوات کے جذبہ کے تحت گھل مل جاتے ہیں۔ وہ صحرا میں اکٹھے قیام کرتے ہیں اور مشترکہ طور پر فرائض حج ادا کرتے ہیں۔ کئی روز تک مقررہ اوقات پر وہ اکٹھے حرکت میں آتے ہیں اور اکٹھے ہی رکتے ہیں۔ خیموں میں رات گزارتے ہیں یا پھر کھلے آسمان تلے۔ اور ساری تگ و دو جو ایک حد تک پانچ نمازوں سے بھی بڑھ کر ہے اللہ کے سپاہیوں کو نظم و ضبط کی زندگی گزارنا سکھاتی ہے۔

(183۔الف) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصال سے چند ماہ قبل حج کیا (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں ایک ہی حج کیا تھا۔مترجم) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میدان عرفات میں جبل رحمت سے خطبہ ارشاد فرمایا: یہ خطبہ بنی نوع انسان کے لئے اسلام کے منشور کا درجہ رکھتا ہے۔ حج الوداع کے اس سفر میں عرب کے کونے کونے سے آنے والے ایک لاکھ 40 ہزار فرزندان اسلام ہادی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم رکاب تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ کے چیدہ چیدہ نکات یہ تھے:

ایک خدا پر ایمان جس میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں۔نسل اور قوم کے کسی بھی امتیاز کے بغیر تمام مسلمان برابر ہیں۔کسی کو دوسرے پر برتری نہیں سوائے تقویٰ کے یعنی پرہیز گاری اور خدا کا خوف رکھنے والے لوگ دوسروں سے برتر ہیں۔ ہر فرد کو جان، مال اور آبرو کے تحفظ کے تین بنیادی حق حاصل ہیں۔سود کی قطعی ممانعت، چاہے سود کی مالیت زیادہ ہو یا کم۔ذاتی انتقام اور قانون ہاتھ میں لے کر بدلہ لینے سے منع کر دیا گیا، عورتوں سے حسن سلوک کی تاکید۔دولت کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کو روکنے کے لئے اس کی مسلسل تقسیم اور گردش میں رکھنے کا حکم (وراثت کی تقسیم لازمی کر کے اس حوالے سے وصیتیں کرنے پر پابندی اور سود کی ممانعت کے ذریعہ) پُر زور تاکید کہ قرآن کے قوانین کو ہی اپنی زندگی کے ہر شعبے میں جاری وساری کرنا......یہی خطبہ اب ہر سال میدان عرفات میں حاجی سنتے ہیں جو جبل رحمت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔

(184) یہ تسلیم کرنے کی ٹھوس وجوہ موجود ہیں کہ کم از کم مسلمانوں کی پہلی نسلوں تک زمانہ قبل از اسلام کی ایک روایت جاری تھی کہ ایام حج کے عظیم اجتماع سے فائدہ اٹھانے کے لئے مکہ سماجی اور معاشی سرگرمیوں کا مرکز بن جاتا۔

(زمانہ قبل از اسلام کا مشہور میلہ ''عکاز'' اس کا لازم و ملزوم بن چکا تھا۔مترجم) اس موقع پر ایک سالانہ ادبی اجتماع منعقد ہوتا جس میں عرب بھر کے شعراء اپنا نیا کلام پیش کرتے۔ مقررین اپنی فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھاتے۔کھیل تماشے بھی ہوتے اور پہلوان ناظرین کو اپنے داؤ پیچ سے محظوظ کرتے۔مختلف ممالک سے آنے والے تاجر بھی اپنی دکانیں سجاتے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں اس موقع کو اپنی انتظامیہ کی چال ڈھال جانچنے اور ان کا احتساب کرنے کے لئے استعمال کرنے کی بنا ڈالی۔آپ رضی اللہ

تعالیٰ عنہ ان ایام میں اپنے گورنروں، کمانڈروں اور سول انتظامیہ کے دوسرے عمال کے خلاف عوامی شکایات کی سماعت کرتے اور فیصلے کرتے نیز ان سے مختلف منصوبوں پر تبادلہ خیال بھی ہوتا۔ اس حوالے سے یہ بات دہرانا ضروری ہے کہ اسلام میں دینی، دنیاوی، مذہبی اور غیر مذہبی تمام معاملات ایک ساتھ اور کامل اشتراک کے ساتھ چلتے ہیں۔

زکوٰۃ:

(185) آج زکوٰۃ کی اصطلاح سے مراد یہ لیا جاتا ہے کہ اپنی بچت کی رقم سے ہر سال ایک مخصوص شرح سے غریبوں کا حصہ نکال لیا جائے۔ مگر قرآن وحدیث اور اسلام کی ابتدائی صدیوں کی روایات کے مطابق زکوٰۃ (جسے صدقات اور حق[1] ایک جامع اصطلاح ہے جس سے مراد وہ تمام قسم کے ٹیکس ہیں جو ایک مسلم ریاست اپنے مسلمان شہریوں سے وصول کرتی ہے مثلاً زرعی پیداوار، زیرِ زمین معدنیات، تجارتی سرمائے، سرکاری چراگاہوں پر پلنے والے مویشیوں کے ریوڑوں اور جمع شدہ رقوم پر لگنے والے ٹیکس وغیرہ۔ شروع میں یہ تمام ٹیکس براہ راست حکومت کو ادا کیے جاتے تھے تاہم بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں اجازت دے دی گئی کہ جمع شدہ رقوم (بچتوں) پر عائد ٹیکس حکومت کو شامل کیے بغیر براہ راست ضرورت مندوں کو دیا جا سکتا ہے۔ جس کی صراحت قرآن نے کر دی ہے۔(60:9)

(185۔الف) قرآن اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ مال و دولت بنی نوع انسان کی بقا کے لئے ناگزیر اور بنیادی ضرورت ہے۔(5:4) اس لئے اس امر میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سرکاری ٹیکس کی ادائیگی کو اتنی اہمیت دی کہ اسے دین کا حصہ اور اسلام کے چار بنیادی ارکان یعنی نماز، روزہ اور حج کے ساتھ چوتھا رکن قرار دیا۔ اسلام میں حاکم شہر کو جو "ہدیہ" پیش کیا جاتا ہے وہ اس کی ذاتی عیش وعشرت کے لئے نہیں بلکہ شہری اجتماعی فلاح کی خاطر

1۔ قرآن پاک کی نزولی ترتیب کے حوالے کو دیکھا جائے تو قرآن نے "نصیب" کی اصطلاح (56:16.136:6) اور "حق" کی اصطلاح (24:70,141:6) مکی سورتوں میں استعمال کی ہے جبکہ "انفاق" (167:2) "صدقات" (60:9) اور "صدقہ" (103:9) مدنی سورتوں میں استعمال ہوتی ہے بعد میں "زکوٰۃ" کا لفظ فقہا نے ان تمام اصطلاحات کی جگہ استعمال کرنا شروع کر دیا تاہم اس میں مندرجہ بالا تمام الفاظ واصطلاحوں کے معنی شامل ہیں۔

اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے ادا کرتے ہیں، خاص کر ضرورت مندوں کے لئے۔ اور یہ اپنے نفس کو پاک صاف کرنے اور اپنے درجات بلند کرنے کے لئے ہے جو کہ زکوٰۃ سے مراد لیا جاتا ہے۔

فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے ''قوم کا سردار (دراصل) قوم کا خادم ہوتا ہے۔'' اپنے فرمان کی سچائی کے اظہار اور ادنیٰ سے ادنیٰ مفاد نہ اٹھانے کے حوالے سے ایک روحانی قائد اور سربراہ مملکت کی حیثیت سے اپنی امت کے لئے اعلیٰ ترین مثال قائم کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے باضابطہ طور پر اعلان کیا کہ سرکاری محاصل جو مسلمان شہری ادا کرتے تھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذات اور آپ کے اہل خانہ کے لئے مذہبی طور پر ممنوع ہیں۔ اگر سربراہ مملکت (یا حکومت) عوام کی امانت میں خیانت نہ کرے تو اس کے ماتحت عمال اپنی ذمہ داریوں کی بجاآوری میں حد درجہ محتاط ہوں گے۔

☆ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور خلفائے راشدین کے ادوار حکومت میں مسلمانوں پر زکوٰۃ کے سوا کوئی ٹیکس نہ تھا اور اس کی حیثیت خیرات وصدقات کی نہیں بلکہ سرکاری ٹیکس کی تھی) جس کی شرح مقرر اور ادائیگی لازمی تھی اور بعض اوقات اس کی وصولی کے لئے طاقت کا استعمال بھی کیا جاتا۔ اس کی ادائیگی کی اہمیت کو اپنی امت پر واضح کرنے اور ان کے ذہنوں میں راسخ کرنے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسے ایک خدا پر ایمان، نماز، روزہ اور حج کے برابر قرار دیا۔ اگر ایمان ایک روحانی فرض ہے اور نماز، روزہ اور حج بدنی فرائض ہیں تو زکوٰۃ مالی فرض ہے۔ فقہا اسے مالی عبادت قرار دیتے ہیں۔

(187) قرآن مجید میں زکوٰۃ کا کئی انداز سے ذکر ہوا ہے۔ متعدد آیات میں اسے دولت میں اضافہ اور دولت کو پاک صاف کرنے کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے کہ اپنے بڑھتے ہوئے مال کو پاک صاف کرنے کے لئے اس کا حصہ زکوٰۃ کی شکل میں ادا کردو۔ (I) صدقات (قرآن 60:9) اس میں ٹیکس اور خیرات دونوں کا اشارہ ہے کہ سچی انسان دوستی کا تقاضا ہے کہ معاشرے کے نادار افراد کی طرف دست تعاون دراز کیا جائے (II) حق (قرآن 141:6) اگر اس سے مراد دوسروں کا حق بھی لیا جائے تو اس سے اس شخص پر فرض عائد ہوتا ہے جو صاحب مال ہے اور حقوق وفرائض دو ایسی اصطلاحات ہیں جو باہم لازم وملزوم ہیں اور معاشرے کی بقا مل جل کر چلنے میں ہے۔

(188) بچتوں، پیداوار یا تجارتی سامان پر ٹیکس لگتا ہے۔ اس کے علاوہ سرکاری چراگاہوں پر گزارا کرنے والے مویشیوں کے ریوڑوں، کانوں اور سمندری پیداوار بھی قابل ٹیکس ہیں۔ شرحیں مختلف ہیں تاہم ان ٹیکسوں کو زکوٰۃ، صدقات اور دیگر ملتے جلتے نام دیئے گئے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارکہ میں ٹیکسوں کی شرح منجمد یا ناقابل ردوبدل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ (پیراگراف نمبر:88) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل طائف کو زکوٰۃ کی ادائیگی سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔ (بعض دوسرے علاقوں کو بھی یہ رعایت دی گئی تھی) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور حکومت میں مدینہ میں اناج کی درآمد پر محصول کی شرح کم کردی تھی جیسا کہ ابوعبید نے روایت کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ میں کئی مواقع پر لوگوں سے مختلف ضروریات مثلاً دفاعی جنگوں کے لئے فنڈز دینے کی اپیل کی جس سے فقہا نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حکومت کسی بحران کے موقع پر عارضی طور پر مزید ٹیکس بھی عائد کرسکتی ہے جسے نوائب کا نام دیا جاتا ہے یا ٹیکس کی شرح میں اضافہ کرسکتی ہے۔ (بحوالہ امام سرخسی کی مبسوط باب 10 صفحہ 21)

قرآن مجید میں قابل ٹیکس اشیاء اور شرح کے تذکرے کی عدم موجودگی فقہا کے تاثر کی تائید کرتی ہے۔

(190) یہ امر قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید ریاست کے اخراجات کے حوالے سے تفصیلاً تذکرہ کرتا ہے اور یہ کہ سرکاری بجٹ کی بڑی مدات کیا ہوسکتی ہیں:

> ''صدقات (ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنی کتاب میں یہاں بریکٹ میں لکھا ہے ''مسلم شہریوں پر عائد ٹیکس'') صرف فقیروں کے لئے ہیں اور مسکینوں کے لئے اور ان کے وصول کرنے والوں کے لئے اور ان کے لئے جن کے دل پرچائے جانے ہوں اور گردن چھڑوانے میں قرض داروں کے لئے اور اللہ کی راہ میں اور راہرو مسافروں کے لئے، فرض ہے اللہ کی طرف سے اور اللہ علم وحکمت والا ہے۔'' (60:9)

جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے صدقات اور زکوٰۃ ہم معنی لفظ ہیں جس سے مراد ہے: (مالی ذمہ داری) جس کا اطلاق مسلمانوں پر ہوتا ہے جبکہ غیر مسلموں پر عائد ہونیوالا اخراج۔ جذبہ اور غنیمت زکوٰۃ میں شامل نہیں۔ اس طریقے سے ان دونوں مختلف مدات میں جمع رقوم سے استفادہ کرنے والے بھی مختلف ہیں۔

(191) معمول تو یہ ہے کہ قانون ساز آمدنی کے حصول کے لئے قوانین وضوابط مرتب کرتے ہیں تاہم قرآن نے اس کے برعکس سرکاری اخراجات کی مدات مقرر کی ہیں اور قابل ذکر امر ہے کہ قرآن میں زکوٰۃ لینے کے اہل افراد میں پیغمبر کا نام شامل نہیں۔ اس آیت کی تشریح اور بہتر تفہیم کے لئے چند معاملات کا تذکرہ مناسب ہوگا تا کہ اخراجات کے حوالے سے صورتحال مزید واضح ہو جائے۔

(192) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جلیل القدر خلیفہ کے مطابق (بحوالہ امام ابو یوسف، ''خراج''، باب فی من تجب علیه الجزیه) فقراء سے مراد غریب اور ضرورت مند مسلمان اور مساکین سے مراد غیر مسلم غریب شہری ہیں۔ (ذمی) (ملاحظہ ہو پیراگراف نمبر 353) یہ بات قابل ذکر ہے کہ صدقات کی وصولی غیر مسلموں سے نہیں ہوتی مگر قرآن نے مسلمان شہریوں سے جمع ہونے والے ٹیکس میں غیر مسلموں کو بھی حصہ دیا ہے۔

(193) محاصل کے معاملات نمٹانے والوں میں انہیں جمع کرنے والے، اکاؤنٹنٹس، اخراجات کے نگران، کنٹرولر اور آڈیٹرز شامل ہیں عملاً اس فہرست میں سول، فوج اور ریاست کی تمام انتظامی مشینری آ جاتی ہے۔

(194) ''جن کے دل جیتے جانے یا پرچائے جانے ہوں'' کی فہرست میں بہت سے لوگ آ جاتے ہیں۔ عظیم فقیہہ ابو یعلیٰ الفرا (الاحکام السلطانیہ صفحہ 116) کہتے ہیں: ''جہاں تک ان افراد کا تعلق ہے جن کے دل جیتے جانے ہیں تو وہ چار اقسام کے لوگ ہیں (1) وہ جن کو مسلمانوں کی امداد پر مائل کرنا مقصود ہو (2) وہ جن کو مسلمانوں کو کسی قسم کے نقصان پہنچانے سے باز رہنے پر آمادہ کیا جائے۔ (3) جن کو اسلام کی طرف راغب کیا جانا ہو۔ (4) ایسے افراد جن کے ذریعے ان کے قبائل (یا زیر اثر افراد) کو دائرہ اسلام میں داخل کیا جا سکتا ہو۔ مندرجہ بالا تمام افراد کو زکوٰۃ سے رقم دی جا سکتی ہے چاہے وہ مسلم ہوں یا مشرک۔''

(195) ''گردن چھڑوانے'' کی اصطلاح معروف ہے یعنی غلام خرید کر آزاد کرتے اور دشمن کے قبضے سے جنگی قیدی چھڑوانے کے لئے بھی زکوٰۃ کی رقم استعمال کی جا سکتی ہے۔ غلاموں کے بارے میں تھوڑی سی تفصیلی بات ہو جائے۔ اسلام سے پہلے کسی مذہب نے غلاموں کی حالت بہتر بنانے کی طرف توجہ نہیں دی۔ سرخسیؒ کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عربوں کو غلام بنانے کی قطعی ممانعت کر دی۔ جہاں تک دوسرے لوگوں کا تعلق ہے اس بارے میں

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے (33:24) کہ اگر کوئی شائستہ اطوار غلام اپنی قیمت ادا کر کے آزاد ہونا چاہے تو اس کا مالک اسے انکار نہ کرے۔ اسلامی قانون کے مطابق عدالت اس کے مالک کو حکم دے گی کہ وہ اپنے غلام کو اس امر کا موقع فراہم کرے کہ وہ کما کر اتنی رقم بچا لے کہ ادائیگی کر کے اپنی آزادی خرید ے۔ (اور اس اضافی کام کے دوران اسے مالک کی خدمت سے مستثنیٰ رکھا جائے) اس کے علاوہ بھی ہم نے دیکھا کہ مسلم حکومتیں غلام آزاد کرانے کے لئے باقاعدہ رقوم مختص کرتی تھیں (زکوٰۃ کی ایک مد) اسلام میں غلامی کی اجازت کا مطلب اپنے بدقسمت ہم جنسوں کا استحصال نہیں ہے بلکہ درحقیقت اس کا ایک مقصد جنگی قیدیوں کو پناہ فراہم کرنا تھا جو اپنا سب کچھ کھو چکے تھے اور اب کسی نہ کسی وجہ سے ان کی ان ملکوں کو واپسی ممکن نہ تھی اور دوسرا اسلامی ماحول میں اللہ تعالیٰ کے ماننے والوں کی حکومت کے زیر سایہ انہیں تعلیم دے کر اسلامی ثقافت سے روشناس کرانا تھا۔ یاد رہے کہ صرف انہی لوگوں کو غلام بنایا جاسکتا تھا جو باقاعدہ حکومتوں کے درمیان جنگ کے نتیجے میں جنگی قیدی بنتے تھے۔ ذاتی لڑائیوں کے قیدیوں یا اغوا یا والدین کی طرف سے کمسن اولاد کی فروخت کی کوئی قانونی حیثیت نہ تھی۔[1]

(196) بھاری قرض تلے دبے ہوئے لوگوں یا جن پر ذمہ داریوں کا بوجھ بہت زیادہ تھا ان کی مدد کے لئے خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سود سے پاک قرض دینے کا ایک ادارہ قائم کیا۔

(197) اخراجات کی ایک مد "اللہ کی راہ میں خرچ" کرنے کی ہے۔ جس میں ہر قسم کے خیرات وصدقات آ جاتے ہیں اور فقہا نے اسلام کے دفاع کے لئے فوجی ساز و سامان خریدنے کے لئے ان رقوم کے استعمال کو جائز قرار دیا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلام کی تمام تر جدوجہد کا محور روئے زمین پر اللہ کی حاکمیت کا قیام ہے۔

---

[1] اسلام نے غلامی کو حکمت کے ذریعے ختم کیا۔ غلامی تو صدیوں سے جاری تھی اور اگر اعلان عام کے ذریعے اسلام میں غلامی ختم کر دی جاتی تو جو جوان تھے وہ تو اپنی روزی کما کر گزارا کر لیتے مگر جو بوڑھے غلام تھے ان کا کوئی سہارا باقی نہ رہتا اور ان کی تعداد لاکھوں میں تھی چنانچہ ایک تو یہ کیا کہ غلام بنانے پر پابندی لگا دی گئی اور جو پہلے سے موجود تھے ان کو آزاد کرنے کو باعث ثواب اور حصول درجات قرار دے دیا گیا چنانچہ مسلمان غلام خرید خرید کر آزاد کرتے رہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ہزاروں غلام آزاد کئے۔ (مترجم)

(198) ''مسافروں کی مدد'' نہ صرف انہی فراخدلانہ سہولتیں فراہم کر کے بلکہ ان کی صحت اور آرام کو یقینی بنا کر کی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ راستوں کو محفوظ بنانے اور گھر سے دور سفر کرنے والوں کو قیام وغیرہ کی سہولتیں فراہم کرنے پر بھی زکوٰۃ کی رقم خرچ ہو سکتی ہے چاہے وہ مقامی ہوں یا کسی دوسری جگہ کے رہنے والے ہوں۔ مسلمان ہوں یا غیر مسلم ہوں۔

خلاصہ:

(198۔الف) عبادات سے متعلق تفصیلات بیان کرنے کے بعد مناسب ہوگا کہ اس حقیقت کو دہرا دیا جائے کہ اس سارے نظام کی ترقی اور اس کے تمام حصوں کو باہم ایک ہی اصول کے تحت مربوط کیا گیا ہے جو اسلامی طرز حیات کی بنیاد ہے۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ کہا گیا ہے ''نماز قائم کرو اور زکوٰۃ (ٹیکس) ادا کرو۔''

بدن اور روح (یعنی دین اور دنیا) کی یکجائی کا اس سے بہتر اظہار اور کس طرح ہو سکتا ہے کہ خدائے واحد کی عبادت اور معاشرے کی طرف سے عائد ہونے والے فرائض کی بجا آوری کا حکم ایک ہی سانس میں دے دیا گیا ہے۔ روحانی یعنی دینی فرائض کی ادائیگی بھی مادی فوائد سے خالی نہیں ہوتی۔ اسی طرح دنیاوی معاملات بھی (اگر اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے مطابق نمٹائے جائیں) روحانی اقدار کے حامل ہوتے ہیں اور بہرحال اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ دونوں قسم کے معاملات کس نیت اور مقصد کے لئے نمٹائے جاتے ہیں۔

باب نمبر 6

اسلام اور روحانیت

اسلام نے انسانوں کے لئے جو ضابطہ حیات تجویز کیا ہے وہ مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں کو محیط ہے مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر ایک کی افتاد طبع الگ الگ ہونے کے باعث بعض لوگ کسی خاص شعبے میں بہت نمایاں ہوتے ہیں جبکہ دوسرے میں نہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی زندگی کے روحانی پہلو کی طرف زیادہ راغب ہوتا ہے تو وہ کسی نہ کسی حد تک اپنی بقا اور معاشرے کے لئے جس کا وہ ایک رکن ہے زندگی کی دوسری ذمہ داریوں کا بوجھ بھی اٹھا رہا ہوتا ہے۔

(200) اللہ پر ایمان اور اس کی اطاعت اور اطاعت کے بہترین اسلوب کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مشہور فرمان میں اس طرح تعریف فرمائی ہے:

> ”اللہ کی عبادت کا بہترین اسلوب یہ ہے کہ اسے اس انداز میں کرو کہ جیسے تم اس کو دیکھ رہے ہو (بہرحال) اگر تم اس کو نہیں دیکھ سکتے وہ تو تم کو دیکھ ہی رہا ہے۔“

اللہ کی اطاعت اور تسلیم ورضا کا یہ خوبصورت انداز اسلام کی روحانی ثقافت ہے۔” خدا کی عبادت“ ایک جامع اصطلاح ہے اور اس میں نہ صرف عقیدے یعنی مذہب کے معاملات شامل ہیں بلکہ اس کا تعلق زندگی بھر کے انسانی رویہ سے بھی ہے۔ اور روحانی حوالے سے وہ لوگ سب سے زیادہ مہذب اور سلجھے ہوئے شمار ہوتے ہیں جو اپنے تمام افعال واعمال میں اللہ کی رضا کو ہی مطلوب ومقصود بناتے ہیں۔

(201) معرفت (تصوف) کے حوالے سے اس ضابطہ کے بارے میں کچھ سوالات جنم لیتے ہیں: معرفت کی اصطلاح کے اسلام میں کئی مترادف ہیں۔ احسان، قرب (اللہ سے قربت)،

طریقت (راستہ، اللہ کی جانب سفر)، سلوک (خدا تعالیٰ کی طرف سفر)، تصوف (جس کے لفظی معنی ہیں اونی کپڑے پہننا) اور اس حوالے سے اب تصوف کی اصطلاح ہی عموماً استعمال ہوتی ہے۔

(202) یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمان صوفی اور دوسری تہذیبوں میں ان کے ہم مسلک اپنی معمول سے مختلف مخصوص روایات اور اپنا طریقہ عبادت ان لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے سے گریزاں ہوتے ہیں جو ان کے حلقہ ارادت سے باہر ہوں۔ یہ اس لئے نہیں کہ ان کی زندگی میں کوئی خفیہ سکینڈل ہیں بلکہ اس لئے کہ عام آدمی شاید اس بات کو سمجھ نہ سکے کہ وہ کیوں خوامخواہ زندگی کی آسائشوں سے اپنے آپ کو محروم رکھے ہوئے ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ عموماً لوگ صوفیاء کے ذاتی مشاہدات پر یقین نہیں کرتے۔ اس لئے وہ سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں سے معاملات کو پوشیدہ رکھیں جو انہیں سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز اسرار کے پردے میں چھپی ہو تو یہ ان لوگوں کے لئے زیادہ باعث کشش بن جاتی ہے جو اسے نظرانداز کرتے ہیں مگر دراصل وہ اس کی تلاش میں ہوتے ہیں۔

(203) بنی نوع انسان میں ہمیشہ سے مختلف مزاجوں کے افراد موجود رہے ہیں۔ مگر یہ اسلام کا ہی اعجاز ہے کہ اس نے ایسی کچھ چیزیں دریافت کرلی ہیں جو اس نے ہر فرد پر مزاجوں کے اختلاف کے باوجود فرض کردی ہیں حالانکہ کسی بھی معاملہ میں شرکت کے لئے ہم خیال یا ہم مزاج ہونا کم ازکم تقاضا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لئے ایک حوالہ قابل ذکر ہے اس بات پر سب متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریبی ساتھی بہترین مسلمان تھے۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کرامؓ اور ان کی زندگیوں کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں مختلف رجحانات، مزاج اور صلاحیتیں رکھنے والے لوگ شامل تھے۔ ان میں خالدؓ (بن ولید) تھے۔ جنگی مدبر اور مخلص سپاہی جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوش ہو کر سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا خطاب عطا کیا۔ عثمانؓ (بن عفان) اور عبدالرحمٰنؓ بن عوف تھے جو امیر کبیر تاجر تھے اور ان کا شمار ان دس صحابہؓ میں ہوتا تھا جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیا میں ہی جنت کی بشارت دے دی تھی (عشرہ مبشرہ) ابوذرؓ تھے جو اپنی تمام املاک کو چھوڑ کر اسلام کے لئے وقف ہو گئے اور نفس کشی کی زندگی اپنالی۔

ایک خانہ بدوش بدو کا تذکرہ بھی آتا ہے کہ جو ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا کہ جنت حاصل کرنے کے لئے کم ازکم کیا فرائض ہیں؟ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایک خدا پر ایمان، پانچ وقت نماز، رمضان کے روزے، حج اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ بدو نے اسی وقت اسلام قبول کرلیا۔ اور کہنے لگا خدا کی قسم آج کے بعد یہی کچھ کروں گا، اس سے کم نہ زیادہ۔ جب وہ رخصت ہوگیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا ''جس نے کسی جنتی کو دیکھنا ہو اسے دیکھ لے۔'' (بخاری اور مسلم)

میدان جنگ میں شجاعت دکھانے والے خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہوں یا مرفع الحال عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ انہوں نے کبھی اسلام کے ضروری فرائض اور اس کی روحانی اقدار سے اغماض نہیں برتا۔ اسی طرح ابوذرؓ، سلمان فارسیؓ، ابودرداءؓ اور دوسرے جو زاہدانہ زندگی کی طرف رجحان رکھتے تھے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متاہلانہ زندگی گزارنے، مسلسل روزے رکھنے اور جسمانی خواہشات سے ماورا رہنے کی بطور خاص اجازت نہیں لی تھی۔ اس کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو انہیں شادی کرنے کے بارے میں کہا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''تم پر اپنے بدن کے حوالے سے بھی ذمہ داری ہے'' (ابن حنبل)

اسلام کے مطابق کوئی بھی انسان خود اپنا مالک نہیں بلکہ سب کا مالک خدا ہے۔ اور ہماری اپنی شخصیت یا وجود کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو امانت ہمارے سپرد کی ہے اس میں خیانت جائز نہیں۔

اصحاب صفہؓ:

(204) مسجد نبویؐ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارکہ میں اس ہال سے جہاں نماز ادا کی جاتی تھی ذرا ہٹ کر ایک جگہ تھی جسے صفہ کہتے تھے اس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتی نگرانی میں صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت تعلیم و تربیت حاصل کرتی تھی۔ اسلامی طرز زندگی کی تربیت کے علاوہ بندے کے خدا سے تعلقات اور انسانوں کے معاشرے کے دوسرے افراد سے باہمی رویے اور برتاؤ کے حوالے سے تعلیم اس کا حصہ تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ یہ لوگ ہمہ وقت یہاں موجود رہتے تھے بلکہ وہ اپنے روزمرہ کے معمولات بھی نمٹاتے اور اپنے لئے روزی بھی کماتے تاکہ دوسروں کے دست نگر اور ان پر بوجھ نہ بنیں۔ جب کہ رات کو وہ نوافل ادا کرتے اور اللہ سے لو لگائے رکھتے۔ اس ادارے کو ''تکیہ'' کا نام دے دیں یا ''خانقاہ'' کا یا پھر کوئی اور نام مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اصحاب صفہؓ مادی مشاغل کی نسبت روحانی معاملات کی طرف زیادہ

راغب تھے۔ شائد ان معمولات یا امور کی تفصیل تو معلوم نہ ہو سکے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت پر اسلام کے یہ پہلے صوفی اختیار کئے ہوئے تھے یا انجام دیتے تھے جو یقیناً ان کے مزاج اور صلاحیتوں کے مطابق ہوتے ہوں گے تاہم اگر مقصد کا تعین کر لیا جائے تو اس حوالے سے تحقیق اور تلاش کے راستے کھلے ہیں۔ یہاں ایک حدیث نبوی کا حوالہ برمحل ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''دانائی مومن کی گمشدہ میراث ہے یہ جہاں سے بھی مل سکے حاصل کرلو۔''
(ترمذی، ابن ماجہ)

تصوف کا نچوڑ:

(205) تصوف کے واسطے سے اسلام کا منشا یہ ہے کہ اسوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زندگی کے تمام معمولات میں سرچشمہ ہدایت اور تقلید بناتے ہوئے عقائد کی درستی، ذاتی کردار اور رویہ کی اصلاح اور اسلام کے عائد کردہ فرائض کی بجا آوری کو یقینی بنایا جائے اور اپنے آپ کو کہاں تک اسلام کی راہ میں وقف کیا جا سکتا ہے اس میں بھی اسوہ حسنہ کو ہی حوالہ بنایا جائے۔

(206) تصوف کا نادیدہ اشیاء کے بارے میں جاننے، شعبدے بازی یا پراسرار نفسیاتی ذرائع سے دوسروں کو اپنی قوت ارادی سے مغلوب کرنے کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ ہی ترک دنیا، نفس کشی، گوشہ نشینی اور اپنے آپ کو دیگر معاملات سے قطعی الگ تھلگ کر کے اپنی دنیا میں گم رہنے کو اس میں سند حاصل ہے۔ حتیٰ کہ خدا کی ذات کے حوالے سے مخصوص عقائد (ہمہ اوست وغیرہ) کا بھی اس سے کوئی واسطہ نہیں کجا یہ کہ ان لپاٹیوں کے دعوؤں کی کوئی حقیقت ہو کہ صوفی اسلام کے قوانین سے ماورا ہوتا ہے اور اس کے عائد کردہ کم سے کم فرائض بھی اس پر عائد نہیں ہوتے۔

(207) کوئی بہتر اصطلاح نہ ہونے کی وجہ سے Mysticism (باطنیت، عرفان، تصوف) کا لفظ ہی استعمال کرنا پڑے گا۔ اسلام میں اس سے مراد یہ ہے کہ بہترین انفرادی رویہ کا اسلوب یعنی وہ طریقے جن کی مدد سے انسان اپنے نفس پر قابو پالیتا ہے، اخلاص تمام خیالات اور افعال میں خدا کی ہمہ وقت موجودگی کا ادراک، خدا کی زیادہ سے زیادہ محبت کی جستجو۔

(208) اسلامی تعلیمات میں کچھ ''ظاہری'' فرائض ہیں مثلاً نماز، روزہ، صدقات وخیرات، برائی سے اجتناب وغیرہ جبکہ کچھ باطنی فرائض بھی ہیں مثلاً ایمان۔ اللہ تعالیٰ کے حضور اظہار تشکر،

خلوص نیت اور انانیت سے نجات، تصوف زندگی کے اس دوسرے پہلو (باطنی) کی تربیت ہے۔ تاہم ظاہری فرائض بھی روح کی صفائی کے لئے ناگزیر ہیں جو ابدی نجات کا واحد ذریعہ ہے۔ دراصل صوفی کی روحانی ریاضتوں کے ذریعے اس کی بعض قوتوں اور صلاحیتوں کو بڑھا دیا جاتا ہے جو عام آدمی کو کرامت معلوم ہوتی ہے مگر صوفی شعوری طور پر اس کی کوشش نہیں کرتا بلکہ وہ ان کو ناپسند کرتا ہے۔ اگر بعض خصوصی ریاضتوں کے نتیجے میں کچھ لوگوں کے لئے نادیدہ اشیا تک رسائی ممکن بھی ہو جائے تو صوفی کے لئے یہ بات بہرحال ناپسندیدگی کا ہی درجہ رکھتی ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں اور ان تک قبل از وقت رسائی آخر کار انسان کے لئے نقصان دہ ہی ثابت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفی کو اگر ایسی قوتیں حاصل بھی ہو جائیں تو وہ انہیں استعمال نہیں کرتا۔ اس کا مطلوب و مقصود ہر حال میں روح کی صفائی ہی رہتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کا مزید قرب حاصل کر سکے۔ مرد کامل تو وہ ہے جو نہ صرف اپنا ظاہر بلکہ باطن بھی اجلا بنا لے، جسے صوفی جسم اور دل کا نام دیتے ہیں۔ ظاہری پہلو کے لئے فقہ ہے یعنی اسلامی قوانین کا مجموعہ، جو مکمل ظاہری زندگی کے لئے قواعد اور ضوابط پر مشتمل ہے مثلاً عقیدہ، عائلی تعلقات، سزائیں وغیرہ، تاہم تصوف کا حقیقی معاملہ باطنی پہلو کا ہے۔ نمازیں فقہ کے دائرہ کار میں آتی ہیں جب کہ بے ریائی، زہد اور بندگی کا تعلق باطن سے ہے اور یہ تصوف کا میدان ہے۔ اس حوالے سے قرآن مجید کی دو آیات قابل ذکر ہیں:

> ''یقیناً ایمان والوں نے فلاح حاصل کر لی جو اپنی نمازوں میں خشوع کرتے ہیں۔'' (2,1:23)
>
> ''......اور (منافق) جب نماز کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو بڑی کاہلی کی حالت میں کھڑے ہوتے ہیں، صرف لوگوں کو دکھاتے ہیں اور یاد الٰہی تو یونہی برائے نام سی کرتے ہیں۔'' (142:4)

ان دونوں آیات میں اچھی اور بری نمازوں کا فرق اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا اور اس میں ہمارے لئے سبق موجود ہے کہ اسلام مسلمانوں سے تمام معاملات زندگی میں کس اسلوب کا تقاضا کرتا ہے۔

(208۔الف) اسلامی روایت تو یہ ہے کہ خلیفہ یا مسلم ریاست کا سربراہ حکومت (حاکم وقت) نہ صرف سیاسی امور نمٹائے (بشمول انصاف کی فراہمی) بلکہ مذہب کے امور کی انجام دہی بھی اس کی ذمہ داری ہو یعنی نماز، روزہ، اور حج وغیرہ۔ یہ سب معاملات فقہ (مسلم لاء) کے دائرہ کار میں آتے ہیں جو مختلف مکاتب فکر کے وضع کردہ ہیں (حوالہ پیرا گراف نمبر 563 الف) اور (بدقسمتی سے) ہر مکتب فکر اپنے عقائد کو (درست قرار دیتے ہوئے) اس کے نفاذ پر ہی مصر ہے حالانکہ اس کی ہماری زندگی میں زیادہ اہمیت نہیں ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کے مابین فرقہ وارانہ اختلافات تو شروع سے موجود رہے ہیں اور ان کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد ان کی جانشینی پر تنازعے سے ہو گیا تھا کہ کون ان کے سیاسی اور دینی جانشینی کا حقدار ہے۔ ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ یہ فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیں جو وہ روز قیامت کر دے گا اور ہم اپنے مستقبل اور خدا کے دشمنوں سے اپنے بچاؤ کی فکر کریں۔ جہاں تک ہماری باطنی زندگی کا تعلق ہے جو آخرت میں ہماری نجات کا واحد ذریعہ ہے تو اس (طبقے) میں کوئی حسد کے معاملات نہیں ہیں۔ روحانی حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانشینی کے اہل کئی افراد تھے اور ایسا ہوا بھی۔

اگر تصوف کے سلسلہ نقشبندیہ کے لوگ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے توسط سے اپنا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک لے جاتے ہیں تو سلسلہ اویسیہ اور سہروردیہ والے ایسا ہی تعلق حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذریعے بناتے ہیں اور یہ سارے سلسلے سنیوں میں ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واحد سیاسی جانشین مانتے ہیں۔ یہ روحانی قلمرو جس میں سنی اور شیعہ اپنے اپنے عقائد پر کاربند ہیں معروف عقائد سے ہٹ کر کوئی چیز نہیں۔ اس کا اپنا ایک مکمل نظام ہے۔ ابدال اور اوتاد کے سلسلوں کی موجودگی کا حوالہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ تک جاتا ہے جس کی روایت ابن سعد جیسے دور اول کے مؤرخ کے ہاں ملتی ہے۔

سیوطی نے قطب، ابدال اور اوتاد کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام احادیث ایک مجموعہ میں اکٹھی کر دی ہیں تاہم یہاں اس کی تفصیلات کی ضرورت نہیں۔

رضائے الٰہی:

(209) ہماری خواہش ہوتی ہے کہ اللہ ہم سے محبت کرے مگر یکطرفہ گاڑی چلاتے ہوئے کہ خود اللہ سے محبت کیۓ بغیر اپنی خواہش کی تکمیل چاہتے ہیں اور یہ بھی کہ اس کی اطاعت کیۓ بغیر اس کی رحمت کے امیدوار بن جاتے ہیں۔ قرآن ہمیں باور کراتا ہے:

''...... اور ایمان والے اللہ کی محبت میں بہت سخت ہوتے ہیں ......''

(165:2)

ایک دوسری جگہ بہترین انسانوں کی صفت بیان کی گئی ہے:

''...... اللہ تعالیٰ بہت جلد ایسی قوم کو لائے گا جو اللہ کی محبوب ہو گی اور وہ بھی اللہ سے محبت رکھتی ہو گی ......'' (54:5)

(210) اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کی کیفیت کا موازنہ مادی عیش و آرام کی زندگی سے نہیں کیا جا سکتا جو اللہ تعالیٰ کسی شخص کی شکرگزاری کی آزمائش کے لئے اسے عطا کر دیتا ہے جبکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی شخص کی استقامت اور صبر کو آزمانے کے لئے اسے دنیا کی نعمتوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں انسان کو اللہ کی اطاعت اور محبت کا ثبوت دینا چاہیے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ ایک طرف اللہ کی رضا کے لئے اپنی ذات اور انا کی نفی کی کیفیت پیدا کریں اور دوسری طرف ہر وقت یہ احساس اس پر غالب رہنا چاہیے کہ خدا ہر جگہ موجود ہے۔

(211) ہمہ اوست یا وحدت الوجود کا فلسفیانہ تصور ''فنا فی اللہ'' کی کیفیت سے پھوٹتا ہے ایک صوفی کے لئے اس عقیدے کی محض تصدیق کی کوئی اہمیت نہیں۔ وہ اسے جذب کرنا اور اسے ایک حقیقت کے طور پر محسوس کرنے کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس طرح ایک سچے صوفی کے لئے وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے مابین عالمانہ امتیاز محض نزاع لفظی ہے جس سے ایک مشتاق مسافر اپنا راستہ کھو بیٹھتا ہے اور اس کی منزل تک رسائی تاخیر کا شکار ہو جاتی ہے۔

(212) یہ امر قابل ذکر ہے کہ ''وحدت الوجود'' کے اسلامی تصور میں بندے کی خدا کے ساتھ ''یکجائی'' کی گنجائش نہیں ہے کہ کوئی بندہ اپنے رب کے کتنا ہی قریب ہو جائے مگر مخلوق اور خالق کے مابین ایک امتیاز، دوری اور فاصلہ بہرحال برقرار رہتا ہے۔ اس حوالے سے ہم جوں جوں درجات حاصل کرتے جاتے ہیں اتنا ہی زیادہ خدا ہماری زبان کے ذریعے بولتا ہے۔ ہمارے ہاتھوں کو وہی

متحرک کرتا ہے اور ہمارے دل میں پیدا ہونے والی خواہش اس کی ہوتی ہے۔(بخاری)[1]

بلاشبہ یہ بلندی کی طرف سفر ہے جو بندے کا اپنے خالق کی جانب ہے مگر کسی بھی مرحلے پر دونوں کا ملاپ نہیں ہو پاتا۔ (مسلمانوں میں مروج) ''معراج'' کے لفظی معنی تو سیڑھی کے ہیں اور اس سے مراد بلندی کی جانب ایسا روحانی سفر ہے جو ہر فرد کی صلاحیت یا درجہ کے مطابق مختلف ہوسکتا ہے اور عظیم ترین مقام جس تک انسانی تخیل کی رسائی ہوسکتی ہے وہ ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہنچے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس تجربے کو بھی ''معراج'' کہا جاتا ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکمل شعور اور بیداری کی حالت میں دیکھا (روءیا) کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آسمان پر لے جایا گیا اور بارگاہ رب العزت میں حاضری سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سرفراز کیا گیا۔ کون و مکان کی پابندیوں سے ماوراء اس حالت میں بھی قرآن خدا اور بندے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں فاصلے کی نشاندہی کرتا ہے۔

''پس دو کمانوں کے بقدر فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم۔'' (9:53)

اس آیت میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اپنے خالق سے قربت کا ذکر کیا گیا وہاں بہرحال '' فاصلے'' کی نشاندہی بھی کر دی۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ''معراج'' کی اصطلاح کو اس طرح بیان فرمایا ''نماز مومن کی معراج ہے'' اور ہر بندے کی ''معراج'' اس کے اعمال اور فضیلت کے مطابق ہے۔

(213) روحانی سفر کے کئی مرحلے اور درجے ہیں اور اس سفر پر چلنے والا درجہ بدرجہ ہی آگے بڑھتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آغاز غار حرا کی خلوت نشینی سے کیا اور پھر نبوت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مکہ کے دور ابتلا کا مرحلہ آتا ہے جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کی نفی کر کے اللہ کے لئے مصائب اور مشکلات کے اس مرحلے کو صبر اور استقامت سے گزارا۔ یہ تو ہجرت کے بعد ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے حکم پر ظلم اور ناانصافی کا مقابلہ طاقت سے کیا۔

[1] اصل الفاظ یہ ہیں ''میں اس کا کان بن جاتا ہوں، جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔''

یہ عین ممکن ہے کہ بظاہر درویش نظر آنے والا، بھیڑ کے بھیس میں دراصل بھیڑیا ہو، اسی طرح یہ بھی عین ممکن ہے کہ ایک بادشاہ جس کے ہاتھ میں تمام تر طاقت اور وسائل ہوں مگر وہ درویش بنا رہے اور تمام تر ذرائع وسائل ہوتے ہوئے بھی انہیں استعمال کرنے کی بجائے اپنی جسمانی راحتیں چھوڑ کر عظیم ذاتی قربانی کا مظاہرہ کرے اور اس طرح اپنے فرائض سے عہدہ برآ ہو۔

(214) انا کو کچلنے کے لئے سب سے پہلی ضرورت عاجزی اور انکساری ہے جسے اپنی زندگی میں جاری اور ساری کر لینا چاہیے۔ تکبر اور غرور اللہ کے سامنے سب سے بڑا گناہ ہے۔ الغزالی کے الفاظ میں دکھاوا اپنے نفس کی پوجا ہے اس لئے شرک کی ایک قسم ہے۔

(215) چونکہ مختلف لوگوں کے مزاج مختلف ہوتے ہیں اس لئے راستے بھی بہت سے ہیں۔ کسی رہنما اور استاد کی ضرورت بہر حال محسوس ہوتی ہے۔ کسی نے اگر میڈیسن کا علم پرائیویٹ پڑھ لیا ہے مگر کوئی عملی تربیت حاصل نہیں کی یا ماہر ڈاکٹروں سے تعلیم نہیں پائی تو اسے پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں ملتی۔ ایسے افراد کی تعداد بہت کم ہے جو اپنی تمام خامیوں پر نظر رکھتے ہیں اور ایسے افراد کی تعداد تو اور بھی کم ہے جو اپنی خامیاں فوری طور پر دور کر لیتے ہیں۔ استاد یا رہنما کو چاہیے کہ سب سے پہلے تو ہمیں ہماری خامیوں سے آگاہ کرے اور پھر وہ طریقے بتائے جن کی مدد سے ہم اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری رہتا ہے اور اس طرح استاد یا رہنما ہمیں بہت ساری غیر ضروری کوشش سے بچا لیتا ہے۔ اگر کوئی ماضی کے تجربے سے استفادہ نہ کرتا اور ہر نیا آنے والا از سر نو کام کا آغاز کرتا اور وہ اپنی ذات کا ہی اسیر بن کر رہ جاتا تو نہ ثقافت میں کوئی ترقی ہوتی اور نہ ہی تہذیب پنپنے پاتی جو نسل در نسل ہمارے آبا و اجداد کے علم اور روایات کے امتزاج سے وجود میں آئی ہے۔

ایک شاگرد کے دل میں اپنے استاد کی بصیرت اور رائے کا بڑا احترام ہوتا ہے جبکہ اپنے ہم مکتب ساتھیوں اور برابر کے لوگوں کے بارے میں اس کے جذبات ایسے نہیں ہوتے۔ کتابی مطالعہ کے بعد اس کے عملی استعمال کے سیکھنے کے لئے مشقوں کے ایک دورانئے سے گزرنا پڑتا ہے یہ بات جتنی مادی سائنس کے لئے درست ہے اتنی ہی روحانی علوم کے لئے سچ ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو محض پڑھ کر یا سن کر نہیں سیکھی جا سکتیں اور ان کے عملی استعمال کو سیکھنے کے لئے اس علم کے ماہر استاد کی زیر نگرانی کام کرنا اگرنا گزیر نہیں تو ہمیشہ سود مند ضرور ثابت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ محض حصول علم ہی کافی نہیں بلکہ اسے اس طرح جسم و جان میں سمو لینا چاہیے کہ یہ فطرت ثانیہ بن جائے۔

(216) صوفیائے کرام چار معمولات کو ضروری قرار دیتے ہیں۔(1) کم کھانا۔(2) کم سونا۔ (3) کم بولنا۔ (4) لوگوں سے کم ملنا جلنا۔ ''کم'' کا مطلب مکمل گریز نہیں ہے کیونکہ یہ تو بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے (مثلاً کھانے اور سونے کے حوالے سے) اور ناخوشگوار بھی، ہمیشہ اعتدال کی راہ ہی اپنائی جانی چاہیے۔ معمول یہ ہونا چاہیے کہ زندہ رہنے کے لئے کھاؤ یہ نہیں کہ کھانے کے لئے زندہ رہو۔ اس لئے کھانا کہ اللہ کی رضا کے حصول اور اس کے احکام پر عمل کے لئے جسم میں توانائی آ جائے بندگی اور مکمل اطاعت کا عمل ہے جب کہ کم کھا کر اپنے آپ کو اس حد تک کمزور کر لینا کہ روحانی بالیدگی متاثر ہونے لگے تو یہ گناہ ہے۔ نیند صحت کے لئے ضروری ہے تاکہ انسان اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکے تاہم کاہلی اور سستی کے باعث ہم بستر میں گھسے رہتے ہیں اور یہ کمزوری روحانی پیشرفت پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کم سونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مادی مفادات کے حصول کی جانب زیادہ توجہ دینا شروع کر دیں بلکہ اس کا مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اور روحانی ریاضتوں کو زیادہ وقت دے کر تقویٰ اور پرہیزگاری کی راہ اپنائی جائے۔

کم بولنے سے مراد یہ ہے کہ بیہودہ سرائی اور یاوہ گوئی سے پرہیز کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو بری باتوں سے اجتناب کیا جائے۔ یہ ایک عام عادت ہے کہ دوسروں کو نصیحتیں کی اور مشورے دیئے جاتے ہیں مگر خود ان پر عمل نہیں کرتے۔ لوگوں سے کم ملنے جلنے کے سبق کا منشا یہ ہے کہ بلاضرورت لوگوں سے گپ شپ اور اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے وقت ضائع نہ کیا جائے۔ ہاں دوسروں کی اصلاح کے لئے ایسی گفتگو قابل قبول ہے جس میں اللہ کی خوشنودی ہی مطلوب و مقصود ہو۔ مگر یہ بات فراموش نہ کی جائے کہ ہر فرد کی ضرورتیں روحانی ارتقا کے درجوں کے مطابق مختلف ہوتی ہیں اور جو مشورہ یا نصیحت اس میدان کے نووارد کے لئے کارگر ہے وہ بحرِ روحانیت کے شناور کے لئے بے سود ہے۔

دنیاوی مقصد کے لئے دوسرے لوگوں سے کی جانے والی میل ملاقاتیں مختلف ترغیب پیدا کرتی، قیمتی وقت ضائع کرتی اور دوسرے اہم فرائض کو ذہن سے فراموش کر دیتی ہیں۔ مندرجہ بالا چار میں پانچویں نصیحت بھی شامل کی جا سکتی ہے کہ کم خرچ کرنا۔ اس کا مطلب ہے کہ عیش و آرام اور فضول تفریحات وغیرہ پر اخراجات نہ کئے جائیں۔ اس سے بچائی جانے والی رقم ان کاموں پر خرچ ہو سکتی ہے جو ہمیں بہت پسند ہوتے ہیں مگر دیگر کاموں پر فضول

خرچیوں کے باعث ہم مالی مشکلات کا شکار رہتے اور اس خوشی سے محروم رہتے ہیں۔ ان پانچ مشوروں کو اسلامی معیشت کے پانچ اصول کہا جاسکتا ہے اور اس میں روحانی اور دنیاوی یا مادی دونوں ہی معاملات شامل ہیں۔

خصوصی عبادات یا اذکار:

(217) اللہ تعالیٰ کا ذکر ہر وقت کرنا چاہیے اور دل میں ذکر کرنا اسکا اہم جزو ہے مگر اس سے وہ ذہنی ارتکاز یا قلبی توجہ نہیں حاصل ہو پاتی جو اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاضر و ناظر تصور کر کے اسے تمام تر توجہ کا مرکز بنانے کے لئے جسمانی مشقیں کر کے حاصل ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"(اے) مسلمانو! اللہ تعالیٰ کا ذکر بہت زیادہ کرو۔"

"اور صبح شام اس کی پاکیزگی بیان کرو۔"(42,41:33)

ایک اور مقام پر فرمایا:

"جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر لیٹے ہوئے کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمینوں کی پیدائش میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ بے فائدہ نہیں بنایا تو ایسا ہے، پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے۔"(191:3)

کچھ دعائیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کچھ اذکار بار بار دہرائے جاتے ہیں جبکہ کچھ دعائیں ایسی ہیں جو ہر روز عادتاً کی جاتی ہیں۔ یہ کبھی بلند آواز میں اور کبھی زیر لب کی جاتی ہیں ان میں ایک تسلسل بھی ہے اور تکرار بھی اور ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے کی جاتی ہیں۔ مخاطب ہمیشہ اللہ کی ذات ہوتی ہے یا اللہ کی صفات، کبھی ان دعاؤں کا مخاطب کوئی مخلوق نہیں ہوتی۔ چاہے موضوع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارکہ ہی کیوں نہ ہو، اظہار تشکر اور ممنونیت کے لئے وسیلہ خالق کائنات کو ہی بنایا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست دُعا نہیں کی جاتی کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارا فلاں کام کر دو۔ مثلاً "اے ہمارے رَب! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کرم و رحمت کی نظر کر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی پناہ میں لے لے" یا "اے ہمارے رب! محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلند مقام عطا فرما جس کا تو نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ کیا ہے اور ہمارے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت کو قبول فرما۔"

خیالات کی یکسوئی یا ذہن کے ارتکاز کے لئے صوفی بعض اوقات تنہائی میں مراقبے کے دوران چند لمحوں کے لئے سانس بند کر لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ذات کو ذہن میں لا کر دل کی دھڑکن کو توجہ کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ کے ذکر کے تین درجے ہیں: (1) صرف اس کے نام کا ذکر کرنا۔ (2) نام کے ذریعے اس کی ذات کا ذکر۔ (3) نام یا کسی اور وسیلے کو لائے بغیر اس کی ذات کا ذکر۔ اور یہ کہ ایسا کرنا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ چیز کہیں باہر سے اسلام میں داخل نہیں ہوئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس دھاگے سے بنی ایک تسبیح تھی جس پر دو ہزار گانٹھیں لگی ہوئی تھیں اور وہ اس پر ہر رات کوئی ذکر کرتے تھے (ابن فضل اللہ العمری، مسالک الابصار، جلد 5، مسودات استنبول)

(218) دوسرے معمولات کے علاوہ ترک دنیا اور نفس کشی کی زندگی اور خصوصاً موت اور روز حساب پر گہرے فکر اور سوچوں میں گم رہنے کا جہاں تک تعلق ہے۔ اسلام میں یہ کوئی مقصد یا منزل نہیں بلکہ منزل تک پہنچنے کا وسیلہ ہیں جو انا کا خول توڑنے اور نفس پر قابو پانے کے لئے عارضی اور وقتی طور پر استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ اس دنیا میں جو بھی چیزیں اپنی ذات کے لئے استعمال میں آتی ہیں ان کو دو درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے: (1) ضروریات۔ (2) تعیشات (سہولتیں) جہاں تک ضرورت کا تعلق ہے ان کو ترک نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہ خودکشی ہوگی اور اسلام میں خودکشی حرام ہے کیونکہ ہم اپنے آپ کے خود مالک نہیں بلکہ ہمارا مالک ہمارا خدا ہے اور کسی چیز کی ہر لحاظ سے تکمیل سے پہلے اسے تباہ کر دینا اللہ کی رضا کے خلاف ہے۔

جہاں تک تعیشات یا سہولتوں یعنی عیش و آرام کی زندگی کا تعلق ہے اگر انہیں زندگی کا واحد مقصد ہی نہ بنا لیا جائے تو یہ جائز ہے۔ اور اگر کوئی اپنی "حیوانیت" پر قابو پانے کا خواہاں ہو تو وہ عیش و طرب کی زندگی کو خیر باد کہہ دے اور ایسے بھی ہیں جو ان لوگوں کی مدد کے لئے تعیشات کو ترک کر دیتے ہیں جن کے پاس زندگی کی بنیادی ضروریات ہی نہیں ہیں یا پھر کوئی گناہوں کے کفارے میں عیش و آرام سے دستبرداری اختیار کرے۔ مگر ان سب کے لئے حد اعتدال سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں۔ ایک صحت مند شخص جو اپنے اوپر قابو رکھ کر پاکیزہ زندگی گزارتا ہے اس شخص سے درجے میں بڑھا ہوا ہے جو مصنوعی ذرائع سے مثلاً آپریشن وغیرہ کروا کر اپنے آپ کو مردانہ صلاحیت سے محروم کر لیتا ہے۔ جو شخص برائی کرنے کے قابل ہی نہیں اس شخص کے برابر کیسے ہو سکتا ہے جو برائی پر پوری طرح قادر ہے مگر صرف اللہ کے ڈر سے اس سے اجتناب کرتا ہے۔

(219) نفس کشی، پرہیز گاری (کسی گناہ پر قادر ہونے کے باوجود پاک دامن رہنا) اور دوسری روحانی ریاضتیں انسان کی بعض خصوصیات کو جلا بخشتی ہیں لیکن ان کی صورت کرامات تک بھی کیوں نہ پہنچ جائے یہ اللہ کی طرف سفر کرنے والوں کا مطلوب و مقصود نہیں ہوتا۔ اس راہ کے مسافر مخصوص معمولات کو تکمیل تک پہنچانے کے متمنی ضرور ہوتے ہیں مگر جو کچھ از خود ظہور میں آ جاتا ہے (یعنی مافوق الفطرت مظاہر) وہ ان کی طلب نہیں ہوتی۔ یہ تو عین ممکن ہے کہ کوئی کافر اور مشرک بھی ولیوں جیسی کرامات کے اظہار پر قادر ہو جائے مگر وہ اس کی نجات کا وسیلہ نہیں بن سکتا۔ صوفی کی نظر اپنی منزل پر ہوتی ہے اور وہ اس سفر میں پیش آنے والے بعض کراماتی مظاہر پر توجہ دیئے بغیر اپنا یہ سفر جاری رکھتا ہے۔

(220) صوفی، درویش یا صاحب معرفت کی زندگی ماضی کے گناہوں پر سچی توبہ سے شروع ہوتی ہے اور دوسرے لوگوں کو اگر کبھی اس کے ہاتھ سے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو جہاں تک ہو سکے اس کا ازالہ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اپنے حق کی کوتاہیاں تو معاف کر دیتا ہے لیکن اگر اس کے ہاتھ سے کسی دوسری مخلوق کو تکلیف پہنچی یا وہ اس کا حق دبائے بیٹھا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرتا۔ بلکہ صرف متاثرہ فرد ہی کو حق ہے کہ وہ معاف کر دے اس طرح ان دونوں پہلوؤں سے پاک ہو کر ہی وہ اپنے رب کی طرف اپنے سفر کا آغاز کرتا ہے۔ اس سفر پر کسی شخص، گروہ طبقہ یا ذات برادری کی اجارہ داری نہیں بلکہ ہر ایک کے لئے یہ راہ کھلی ہے اور اللہ کے ہر بندے کا یہ فرض ہے کہ وہ اس راہ کو اپنا لے۔ اس سفر کی دو شرائط ہیں: اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اس کا مسلسل ذکر۔ اللہ کی اطاعت اس حوالے سے آسان ہے کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ اس کی اطاعت کیسے کرنی ہے اور اس کی رضا کے حصول کا کیا طریقہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت ہے کہ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے ہمیں بتا دیا ہے کہ اس کی رضا اور خوشنودی کا نسخہ کیا ہے جو انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو بہ کمال و تمام پہنچا دیا ہے۔

(221) اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ان گنت پیغمبر مبعوث فرمائے ہیں۔ اگر ان کی تعلیمات کی تفصیلات ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رائے یا نظریہ تبدیل کر دیا ہے بلکہ اپنی رحمت اور حکمت کے باعث انسانی صلاحیتوں کے اتار چڑھاؤ کو مدنظر رکھتے ہوئے ضوابط کار کی تفصیلات میں قدرے ردوبدل کر دیا لیکن جہاں تک بنیادی اصولوں خصوصاً بندے کے خدا اور اس کے رسولوں سے تعلق اور رشتے کا تعلق ہے ان میں کوئی

تبدیلی نہیں ہوئی اور قرآن اس پر بہت زور دیتا ہے اور یہ اللہ کے احکام کی تعمیل اور اس کی اطاعت کا حصہ ہے کہ بندہ اس دور میں نازل ہونے والے تازہ ترین احکام کو مانے۔ مثلاً اگر خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توسط سے اپنی تعلیمات ان کی امت کو پہنچائیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعلیمات کو ترک کر کے اپنے پیغمبر کے فرامین پر عمل کرنے لگے تو یہ اللہ کی نافرمانی شمار نہیں ہوگی کیونکہ ان کے پاس اسی مقنن یعنی قانون ساز کا تازہ ترین حکم نامہ آگیا تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شریعت دی تھی۔ ہاں اگر موسیٰ علیہ السلام کے دور نبوت میں ان کی امت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر عمل پیرا ہونے پر مصر ہوتی تو یہ اللہ کی صریح نافرمانی ہوتی۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا کہ نئے پیغمبر کی آمد پر اسی خدا کا بھیجا ہوا سابقہ دین منسوخ ہو جاتا حتیٰ کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد پر تمام سابقہ شریعتیں منسوخ ہو گئیں۔ اب مسلمان تمام سابق انبیاء کو اللہ کے سچے پیغمبر تسلیم کرتے ہیں مگر عمل شریعت محمدی پر کرتے ہیں۔ اسی طرح ہر مسلمان تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی بھیجی ہوئی کتابیں مانتا ہے مگر عمل خدا کی آخری کتاب قرآن پر کرتا ہے۔ اگر کوئی سابقہ خدائی قوانین پر جما رہتا ہے تو ان قوانین کا خالق اسے قانون پسند اور اطاعت شعار تسلیم نہیں کرتا۔

خلاصہ:

(222) چونکہ انسان کی تخلیق جسم اور روح دونوں سے ہوئی ہے یعنی اس کا ایک بیرونی وجود ہے اور ایک اندرونی، اس لئے تکمیل کی جانب یکساں پیشرفت اور متوازن ارتقا کا تقاضا ہے کہ انسان کے ان دونوں پہلوؤں کی طرف توجہ دی جائے۔ تصوف یا اسلام کی روحانی ثقافت انا کے بتدریج خاتمے اور خدا کی موجودگی کے ہر لحظہ بڑھتے ہوئے احساس سے عبارت ہے۔ خدا کی رضا میں اپنے آپ کو گم کر دینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اپنے معمولات کو جمود کا شکار کر لیا جائے بلکہ حقیقت اس سے بہت بعید ہے۔ بے شمار قرآنی آیت میں انسان کو عمل کی تلقین کی گئی ہے بلکہ اللہ کی رضا کا حصول بھی اچھے اعمال سے ہی ممکن ہے۔ یہ جو کہا گیا کہ اپنی شیطانی خواہشات کی تکمیل کی بجائے صرف اللہ کی رضا کے مطابق چلو تو یہ بات بے عملی کی طرف نہیں لے کر جاتی۔ ہوتا وہی کچھ ہے جو خدا چاہتا ہے اور چونکہ انسان کو اللہ کے ارادوں کی خبر نہیں ہوتی کہ یہ سب کچھ پردہ غیب کے اندر ہے اس لئے انسان کو اس گوہر نایاب کو پانے کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہنا چاہیے جس کو وہ

پوری دیانت داری سے درست اور اللہ کے احکام کے مطابق سمجھتا ہے چاہے اس میں پے در پے ناکامیوں کا سامنا ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

''باعمل تقدیر'' کا یہ اصول جو انسان کو عمل پر ابھارتا اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے کا سبق دیتا ہے قرآن مجید کی ان آیات میں مذکور ہے:

''نہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ (خاص) تمہاری جانوں میں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں۔ وہ ایک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے۔ یہ (کام) اللہ تعالیٰ پر (بالکل) آسان ہے۔

''تاکہ تم اپنے سے فوت شدہ کسی چیز پر رنجیدہ نہ ہو جایا کرو اور نہ عطا کردہ چیز پر اترا جاؤ اور اترانے والے شیخی خوروں کو اللہ پسند نہیں فرماتا۔''

(23,22:57)

انسان کو اللہ تعالیٰ کی قوت و جبروت اور اس کے سامنے اپنی بے کسی کے علاوہ یوم حساب کو پیش نظر رکھنا چاہیے جب ہر جان سے حساب لیا جائے گا۔ قرآن میں ارشاد ہے:

''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم انہیں اپنی راہیں ضرور دکھا دیں گے، یقیناً اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کا ساتھی ہے۔''

(69:29)

باب نمبر 7

اسلام کا نظامِ اخلاقیات

انسانوں کو تین بنیادی درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1) فطرتاً اچھے لوگ جنہیں کسی ترغیب سے گمراہ نہیں کیا جا سکتا اور جن کا وجدان ہی انہیں کسی چیز کے اچھے یا برے ہونے کی خبر دے دیتا ہے۔

(2) اس کے بالکل برعکس لوگ اور وہ ناقابل اصلاح ہوتے ہیں۔

(3) وہ لوگ جو ان دونوں کے درمیان کے درجہ میں ہوتے ہیں کہ اگر انہیں مناسب نگرانی اور پابندی میں غلط کاموں سے روکا جائے تو وہ سیدھے راستے پر چل سکتے ہیں لیکن رہنمائی نہ ملنے یا ان کے حال پر چھوڑ دینے کے نتیجے میں وہ غفلت کا شکار ہو جاتے اور دوسروں پر ظلم اور ناانصافی کے مرتکب ہو جاتے ہیں۔

(224) انسانوں کی اکثریت اس تقسیم کے تیسرے درجے سے تعلق رکھتی ہے جبکہ پہلے اور دوسرے درجے میں آنے والے لوگوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ پہلے درجہ کے لوگوں (انسانی فرشتوں) کو کسی قسم کی رہنمائی یا نگرانی کی ضرورت نہیں ہوتی جبکہ دوسرے درجے میں آنے والوں (انسانی شیطانوں) کے لئے سخت نگرانی اور نہی عن المنکر (برے کاموں سے روکنا) کا اہتمام ضروری ہے۔ تیسری قسم (عام انسانوں) کو بھی راہ راست پر رکھنے کے لئے بڑی توجہ کی ضرورت ہے۔

(225) تیسرے درجے سے تعلق رکھنے والے لوگ بعض خصوصیات کے حوالے سے جانوروں سے مشابہت تک پہنچ جاتے ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر قانع رہتے ہیں اور خاموش زندگی گزارتے ہیں جب تک کہ وہ اس سے بہتر چیز دوسروں کے پاس نہ دیکھ لیں یا انہیں دوسروں کی طرف سے کسی شرارت کا شبہ نہ ہو جائے۔ مختلف ترغیب سے متاثر ہو کر برائی کی طرف مائل

ہونے کا انسانی فطری رجحان ہمیشہ موضوع بحث رہا ہے اور اس پر بہت عرق ریزی کی گئی ہے اس طرح باپ خاندان کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے اپنے بچوں جبکہ قبیلے کا سردار، سربراہ ریاست یا کوئی گروپ لیڈر اپنے زیر اثر افراد کو جو کچھ ان کے پاس ہے اسی پر قناعت کرنے پر مجبور کرتا اور انہیں دوسروں کی جائز اور قانونی ملکیت چھیننے یا غصب کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ شاید انسانی معاشرے کا یہی مقصد ہے کہ ترغیب کے جال پھیلانے کو روکا جائے اور جو نقصان پہلے ہو چکا ہے اس کی تلافی کی جائے۔

تمام انسان حتیٰ کہ ایک ہی قوم کے تمام افراد ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ایک نیک فطرت شخص دوسرے کے لئے قربانی دینے اور ان کی ہر طرح سے مدد پر کمر بستہ رہتا ہے۔ ایک دور اندیش شخص نتائج پر بھی نظر رکھتا ہے اور اس طرح فوری فائدے کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو غلط کام سے بچاتا ہے۔ جہاں تک عام انسان کا تعلق ہے نہ صرف یہ خود خوشی سے قربانی پر آمادہ نہیں ہوتا بلکہ دوسروں کا حق مارنے سے بھی باز نہیں آتا سوائے اس کے کہ متاثرہ فریق، معاشرے یا پھر کسی دوسری زیادہ طاقتور پارٹی کی طرف سے انتہائی سخت اور فوری ردعمل کا خوف نہ ہو۔ لیکن ایسی روحیں بھی ہیں جنہیں کسی قسم کا خوف بھی برائی سے باز نہیں رکھ سکتا اور وہ اپنی مجرمانہ جبلت کے تحت، تمام رکاوٹوں کو پھلانگتے ہوئے جرائم کی راہ پر بگٹٹ بھاگتی چلی جاتی ہیں یہاں تک کہ معاشرہ انہیں کسی ایسی صورت حال سے دوچار کر دے کہ وہ بے بس ہو جائیں مثلاً انہیں سزائے موت دے دی جائے یا قید میں ڈال کر دوسرے انسانوں کو ان کی وحشت سے محفوظ بنا دیا جائے۔

(226) دنیا کے تمام قوانین، تمام مذاہب اور تمام نظریات عام انسانوں یعنی تیسرے درجے میں آنے والے لوگوں کو آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ شائستہ اطوار کا مظاہرہ کریں اور غریبوں، ضرورت مندوں اور محتاجوں کی مدد کے لئے رضا کارانہ قربانی دیں۔

اسلام کی امتیازی خصوصیات:

(227) اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ یہ نہ صرف مسلمانوں کا مذہبی عقیدہ بلکہ ان کے لئے سماجی زندگی کے ضوابط کا سرچشمہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام اپنے قوانین کے مکمل اطلاق پر اصرار کرتا ہے اور ہم اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اسلام اس دنیا کی زندگی کو زیادہ اہمیت دینے کی بجائے اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ یہ زندگی آخر کار ختم ہو جانے والی ہے جب کہ اس کے نزدیک

روح کو الگ کر کے انسانی زندگی کو محض جسم یعنی مادی ضروریات اور خواہشات تک محدود کرنا بھی ٹھیک نہیں، بلکہ اس کی تعلیمات کا زیادہ زور آخرت کی زندگی پر ہے۔ اس کا اصول جیسا کہ قرآن نے بیان کیا ہے: "في الدنيا حسنة و في الآخرة حسنة" (اس دنیا میں بھی اچھائی اور آخرت میں بھی اچھائی) اس طرح نہ صرف یہ کہ اسلام اچھائی کو سراہتا ہے بلکہ برائی کی مذمت بھی کرتا ہے اور روحانی اور مادی دونوں طرح سے انعامات بھی دیتا ہے اور سزائیں بھی۔ جہاں تک اسلام کے اندر اوامر ونواہی کا تعلق ہے۔ اسلام روح کے اندر تقویٰ نیز روز حساب اور دوزخ کے عذاب کا خوف سمو دیتا ہے لیکن اس سب کو کافی نہ سمجھتے ہوئے اسلام انسان کو ظلم، ناانصافی اور دوسروں کے حقوق سلب کرنے سے روکنے کے لئے مادی سزاؤں کی صورت میں بھی تمام ممکنہ اقدامات کرتا ہے۔ اور اس طرح کوئی بھی مومن جو نماز اور روزہ کا اہتمام کرتا ہے وہ کسی مجبوری یا جبر کے تحت نہیں کرتا اس کے علاوہ وہ ٹیکس (زکوٰۃ) بھی بخوشی ادا کرتا ہے چاہے حکومت اس کی شرح مقرر نہ کرے یا طاقت کے استعمال سے بھی وصول کرنے کے قابل نہ ہو۔

اخلاقیات کی بنیاد:

(228) اکثر وبیشتر ایسا ہوتا ہے کہ مختلف افعال کے پس پردہ مقاصد، ارادہ یا کارفرما حالات اس کے معانی اور مفہوم کو بالکل تبدیل کر دیتے ہیں حالانکہ بظاہر وہ افعال ایک جیسے معلوم ہوتے ہیں مثلاً کسی بدقماش شخص کے ہاتھوں کسی کا قتل۔ کسی شکاری کی غلطی سے جانور کی بجائے انسان کا مارا جانا۔ کسی ناسمجھ، کمسن لڑکے سے یا حق دفاع کے طور پر کسی کا قتل سرزد ہو جانا۔ عدالت سے ملنے والی سزائے موت پر عمل کرتے ہوئے جلاد کا کسی کو زندگی کی قید سے آزاد کرنا، بیرونی حملہ کے خلاف وطن کا دفاع کرتے ہوئے فوجی سپاہی کے ہاتھوں دشمن کی ہلاکت وغیرہ۔ ان تمام واقعات میں انسانی جان کے ضیاع پر ردعمل مختلف ہے۔ بعض اوقات قاتل کو معافی مل جاتی ہے تو بعض اوقات قتل کو معمول کی ڈیوٹی تصور کیا جاتا ہے اور اس پر نہ تحسین کی جاتی ہے نہ ہی مذمت جبکہ کبھی "قاتل" کو اعزاز سے بھی نوازا جاتا ہے۔ انسانی زندگی کے کم وبیش تمام افعال کے اچھے یا برے ہونے کا انحصار مختلف عوامل پر ہے۔ اسی حوالے سے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے "اعمال (کے اچھے یا برے ہونے) کا دارومدار نیتوں پر ہے۔"

(229) اسلام کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخصوص انسانوں پر وحی اتاری گئی۔ یہ انسان پیغمبر تھے جو خدا کے پیغام کو بندوں تک پہنچانے کا وسیلہ بنے۔ اس لئے اسلام کے قوانین اور نظام اخلاقیات حتیٰ کہ اس کے تمام عقائد کی بنیاد خدائی احکامات پر ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بیشتر صورتوں میں انسانی دانش بھی اسی نتیجے پر پہنچے مگر اصولی طور پر اس کے پیغام الٰہی ہونے کو اسلام میں فیصلہ کن اہمیت حاصل ہے۔ کسی فلاسفر، فقیہہ یا مصلح کی قوت استدلال کو اس میں کوئی دخل نہیں اور اسکی بڑی وجہ یہ ہے کہ مختلف افراد کی رائے مختلف ہوسکتی ہے اور ممکن ہے کہ ان کی آراء ایک دوسرے سے قطعی برعکس ہوں۔ بعض فرائض اور معمولات میں بین السطور کارفرما مقصد نظم وضبط کا ہوتا ہے جبکہ بظاہر معاملہ غیر ضروری نظر آتا ہے۔

(230) انسانی اعمال وافعال کے اچھے یا برے ہونے کی تقسیم امر اور نہی کی بنیاد پر کی جاتا ہے۔ جن کاموں سے بہرحال بچنا چاہیے انہیں بھی دو بڑے درجوں یا قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ایک وہ اعمال جن پر دنیا میں جسمانی اور مالی سزاؤں کے علاوہ یوم قیامت کو بھی احتساب ہوگا، دوسرے وہ جن کی مذمت تو کی گئی مگر اس کی کوئی سزا مقرر نہیں کی بلکہ اس کا حساب کتاب آخرت پر چھوڑ دیا گیا۔

(231) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک فرمان کے مطابق (جسے قاضی عیاض نے اپنے مجموعہ "شفا" کے باب 2 میں روایت کیا ہے) اسلام کے نزدیک زندگی گزارنے کا اسلوب اس طرح ہے:

> "ایک دن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے عمومی رویہ میں جن اصولوں کی پاسداری کرتے ہیں وہ کیا ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: علم میری دولت، معقولیت میرے مذہب کی بنیاد، محبت میری اصل، تمنا میری سواری، اللہ کا ذکر میرا دوست، اعتماد میرا خزانہ، (امت کیلئے) فکر مندی میری ساتھی، حکمت میرا ہتھیار، صبر میرا البادہ (چوغہ)، قناعت میرا مال غنیمت، اعتدال میرا فخر، لہو ولعب سے اعلان بریت میرا پیشہ، دیانت داری میری غذا،

سچائی میری سفارش، اطاعت میری کفالت، جدوجہد میری عادت اور
میرے دل کی خوشی میری نماز ہے۔"

(232) ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
"حکمت کا نچوڑ تقویٰ ہے۔"

اسلامی اخلاقیات کا آغاز اللہ کے سوا کسی اور کی پوجا سے بریت کے اعلان سے ہوتا ہے چاہے یہ پوجا اپنے نفس (انا پرستی) کی ہو یا ہمارے اپنے ہاتھ کی بنی ہوئی اشیاء کی (بت، اوہام پرستی وغیرہ) اس کے علاوہ ان تمام عقائد اور رویوں کو چھوڑ دینے سے جو انسان کو درجہ انسانیت سے گرا دیتے ہیں (کفر، ناانصافی وغیرہ)

(233) اسلام میں نسل، رنگ، زبان، جائے پیدائش کی بنیاد پر تمام امتیازات کا خاتمہ کرتے ہوئے قرار دیا گیا (اور کسی بھی دوسرے نظام سے زیادہ اس کا مظاہرہ بھی کیا) کہ برتری کی بنیاد اخلاق (پرہیزگاری) ہے۔ اور یہ وہ چیز ہے جس تک ہر کوئی بغیر استثنیٰ کے پہنچ سکتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے:

"لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں
اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو (اور) اللہ کے نزدیک تم
میں عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ
جاننے والا (اور) سب سے خبردار ہے۔"(13:49)

(234) قرآن مجید بڑے خوبصورت انداز میں امت مسلمہ کو 12 احکام پر مشتمل پیغام دیتا ہے۔ (39,23:17)

(1) اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔

(2) اور یہ کہ اپنے والدین سے بھلائی کرتے رہو، اگر ان میں ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو ان کو "اُف" بھی نہ کہو اور نہ انہیں پلٹ کر جواب دو بلکہ ان کے ساتھ ادب کے ساتھ بات کرو۔ اور ان کے روبرو عجز و نیاز کے ساتھ جھکے رہو اور ان کے حق میں دعا کرو۔"

"اے میرے پروردگار جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں (شفقت سے)
پرورش کیا ہے تو بھی ان (کے حال) پر رحمت فرما۔"

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تمہارا پروردگار اس سے بخوبی واقف ہے۔ اگر تم نیک ہو گے تو وہ رجوع لانے والوں کو بخش دینے والا ہے۔

(3) اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچ کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے پروردگار (کی نعمتوں) کا کفران کرنے والا (یعنی ناشکرا) ہے۔ اگر تم اپنے پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ دستی) کے انتظار میں جس کی تمہیں امید ہو ان (مستحقین) کی طرف توجہ نہ کر سکو تو ان سے نرمی کے ساتھ بات کہہ دیا کرو۔

(4) اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول ہی دو (کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ بے شک تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور (جس کی روزی چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں سے خبردار ہے اور (ان کو) دیکھ رہا ہے۔

(5) اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرنا (کیونکہ) ان کو اور تم کو ہم ہی رزق دیتے ہیں۔ کچھ شک نہیں کہ ان کا مار ڈالنا سخت گناہ ہے۔

(6) اور زنا کے پاس بھی نہ جانا کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔

(7) اور جس جاندار کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرنا مگر جائز طور پر (یعنی بہ فتوئ شریعت) اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے (کہ ظالم قاتل سے بدلہ لے) تو اس کو چاہیے کہ قتل (کے قصاص) میں زیادتی نہ کرے کہ وہ منصور و فتح یاب ہے۔

(8) اور یتیم کے مال کے پاس بھی نہ پھٹکنا مگر ایسے طریق سے کہ بہت بہتر ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائے۔

(9) اور عہد کو پورا کرو کہ عہد کے بارے میں ضرور پرسش ہو گی۔

(10) اور جب (کوئی چیز) ماپ کر دینے لگو تو پیمانہ پورا پورا بھرا کرو اور (جب تول کر دو تو) ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو۔ یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے۔

(11) اور (اے بندے) جس چیز کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ، کہ کان اور آنکھ اور دل ان سب سے ضرور باز پرس ہوگی۔

(12) اور زمین پر اکڑ کر (اور تن کر) مت چل کہ تو زمین کو پھاڑ تو نہیں ڈالے گا اور نہ لمبا ہو کر پہاڑوں (کی چوٹی) تک پہنچ جائے گا۔

ان سب (عادتوں) کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک بہت ناپسند ہے۔

(اے پیغمبرؐ!) یہ ان (ہدایتوں) میں سے ہیں جو اللہ نے دانائی کی باتیں تیری طرف وحی کی ہیں اور اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود نہ بنانا کہ (ایسا کرنے سے) ملامت زدہ اور (درگاہ الٰہی سے) راندہ بنا کر جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔"

یہ احکامات موسیٰ علیہ السلام پر نازل کئے گئے احکام کی نسبت زیادہ جامع ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر معراج کے دوران وحی ہوئے تھے۔

(235) تمام قرآنی آیات کے حوالے دینا طوالت کے سبب ممکن نہیں۔ تاہم ان چند آیات کا حوالہ ضروری ہے جس میں ایک عام آدمی کا سماجی رویہ کیا ہونا چاہیے اس بارے میں رہنمائی دی گئی ہے۔

"اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں اور رفقائے پہلو (یعنی پاس بیٹھنے والوں) اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو کہ اللہ (احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور) تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔

"جو خود بھی بخل کریں اور لوگوں کو بھی بخل سکھائیں اور جو (مال) اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا فرمایا ہے اسے چھپا چھپا کے رکھیں اور ہم نے ناشکروں کے لئے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

"اور خرچ بھی کریں تو (اللہ کے لئے نہیں بلکہ) لوگوں کے دکھانے کو۔ اور ایمان نہ اللہ پر لائیں اور نہ روز آخرت پر۔ (ایسے لوگوں کا ساتھی شیطان ہے) اور جس کا ساتھی شیطان ہو تو (کچھ شک نہیں کہ) وہ برا ساتھی ہے۔" (38-36:4)

(236) درج ذیل آیات میں مسلم معاشرے کی عکاسی کی گئی ہے:

"مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں میں صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔"

"مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر نہ کرے ممکن ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے (تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں اور اپنے (مومن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام رکھو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام (رکھنا) گناہ ہے اور جو توبہ نہ کریں ظالم ہیں۔"

"اے اہل ایمان! بہت گمان کرنے سے احتراز کرو کہ بعض گمان گناہ ہیں اور ایک دوسرے کے حال کا تجسس نہ کیا کرو اور نہ کوئی کسی کی غیبت کرے، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ اس سے تو تم ضرور نفرت کرو گے (تو غیبت نہ کرو) اور اللہ کا ڈر رکھو، بے شک اللہ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔"

(12-10:49)

گناہ اور اس کا کفارہ:

(237) مندرجہ بالا آیات میں جو اچھے مشورے دیئے گئے ہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا لیکن انسان میں بشری کمزوریاں ہیں۔ اس کی ساخت میں بیک وقت اچھائی اور برائی دونوں کے عناصر شامل ہیں۔ اس کی جبلی خامیوں میں یہ شامل ہے کہ وہ غصے میں آتا ہے۔ تراغیب کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور ان لوگوں کو نقصان پہنچانے پر تل جاتا ہے جو کمزور ہیں اور اپنے دفاع یا انتقام کی طاقت نہیں رکھتے۔ اسی طرح اس کی اچھائیوں میں یہ شامل ہے کہ وہ برا کام کرنے کے بعد اس پر پچھتاتا ہے اور احساس بڑھ جائے تو نقصان کے ازالے کی کوشش بھی کرتا ہے۔

(238) اسلام گناہوں کو دو درجوں میں تقسیم کرتا ہے:

(1) وہ گناہ جو اللہ کے حقوق کے خلاف کیے جائیں (کفر، نماز اور عبادات میں کوتاہی وغیرہ)۔

(2) وہ گناہ جو بندوں کی حق تلفی کی صورت میں کیے جائیں۔ یہ بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ دوسرے انسانوں کے خلاف کیے گئے جرائم معاف نہیں کرتا۔ صرف وہی شخص معاف کرسکتا ہے جس پر ظلم یا زیادتی ہوئی ہو۔ اگر کوئی انسان کسی دوسری مخلوق سے زیادتی کرتا ہے وہ انسان ہو، حیوان، یا کوئی اور ہو تو وہ دراصل دوہرے جرم کا ارتکاب کرتا ہے ایک تو متاثرہ پر ظلم کا جرم اور دوسرا خدا کے خلاف جرم، کیونکہ یہ گناہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔ اس طرح جب کسی دوسری مخلوق سے ناانصافی یا اس کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب ہوتا ہے تو مجرم کو نہ صرف متاثرہ شخص کے نقصان کا ازالہ کرنا ہوگا بلکہ خدا سے بھی معافی مانگنا ہوگا۔

ایک معروف حدیث میں فرمایا گیا ہے:

قیامت کے روز ایک عورت کو دوزخ میں جھونک دیا جائے گا۔ جس نے ایک بلی کو باندھ کر اسے بھوکا اور پیاسا رکھا یہاں تک کہ وہ مرگئی۔

ایک اور حدیث میں ان لوگوں کے لئے عذاب کی وعید دی گئی جو اپنے جانوروں کو پیٹ بھر چارہ نہیں دیتے اور ان پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلا ضرورت درخت کاٹ گرانے سے بھی منع فرمایا ہے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کی پیدا کی گئی چیزوں سے نفع ضرور اٹھانا چاہیے تاہم ایسا مناسب اور معقول طریقے سے ہونا چاہیے اور اس میں عیش پرستی اور ضیاع سے ہر ممکن گریز کرنا چاہیے۔

(239) جب کوئی شخص کسی دوسرے کو نقصان پہنچاتا ہے اور پھر اس کا ازالہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے کئی راستے ہیں۔ بعض اوقات صرف معافی مانگ لینے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات عملاً ان حقوق کو بحال کرنا پڑتا ہے جو چھینے گئے تھے اور اگر جو چیز چھینی گئی تھی وہ واپس کرنا ممکن نہ ہو تو اس کے متبادل کوئی چیز دینا پڑتی ہے۔

(240) دوسروں کے لئے رحم اور شفقت کا مظاہرہ کرنا اور معاف کر دینا بہت اچھا وصف ہے اور اسلام نے اس پر بہت زور دیا ہے، اسے قابل تعریف قرار دیتے ہوئے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''اور اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو (اللہ سے) ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔''

''جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور اللہ نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔''(134-133:3)

(241) معاف کر دینے کی توصیف کی گئی لیکن بدلہ یا قصاص لینے کی بھی اجازت دی گئی۔ اس حوالے سے قرآن میں ارشاد ہے:

''اور برائی کا بدلہ تو اس طرح کی برائی ہے مگر جو درگذر کرے اور (معاملے کو) درست کر دے تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے اس میں شک نہیں کہ وہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

''اور جس پر ظلم ہوا اگر وہ اس کے بعد انتقام لے تو ایسے لوگوں پر کچھ الزام نہیں۔''(41-40:42)

قرآن مجید میں اس جیسی متعدد دوسری آیات بھی ہیں۔

(242) اللہ تعالیٰ کی رحمت اور بخشش کا موازنہ انسانوں میں سب سے رحم دل شخص سے بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ کو جن ناموں سے پکارا جاتا ہے ان میں رحمان (سب سے زیادہ رحم کرنے والا) تواب (سب سے زیادہ توبہ قبول کرنے والا)، عفو (قصور سے درگزر کرنے والا)، غفار (سب سے زیادہ معاف کرنے والا) شامل ہیں۔

جو انسان اللہ تعالیٰ کے خلاف جرائم کا ارتکاب کرتے اور پھر نادم ہو کر اپنے پروردگار کے حضور معافی کی استدعا کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کو رحیم و کریم پاتے ہیں۔ قرآن مجید کی درج ذیل دو آیات میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے:

''اللہ اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا (اور گناہ) جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس نے اللہ کے ساتھ شریک بنایا وہ رستے سے دور جا پڑا۔''(116:4)

"اے پیغمبر! (میری طرف سے لوگوں کو) کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہونا، اللہ تو سب گناہوں کو بخش دیتا ہے (اور) وہ تو بخشنے والا مہربان ہے۔"

(53:39)

(243) جب بھی کوئی کفر سے تائب ہو کر اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے تو وہ اس کے کرم و رحمت کا امیدوار ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی بشری کمزوریوں کے سبب بار بار اپنے عہد توڑتا ہے لیکن ہر بار سچے دل سے توبہ کر کے پھر اللہ تعالیٰ کے دائرہ رحمت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے کوئی ایسی پابندی نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگنے کے لئے کسی اور کو درمیان میں وسیلہ یا سفارشی بنایا جائے بلکہ آنکھوں میں ندامت کے آنسو لئے اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں اور سچے دل سے اپنی کوتاہیوں کا اقرار کر کے اپنے پروردگار سے معافی اور بخشش کی بھیک مانگ لیں۔ کیونکہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے اس سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے ماں کی بچے کے لئے محبت سے 100 گنا زیادہ محبت ہے۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے رحم کو 100 حصوں میں تقسیم کیا اور 99 حصے اپنے پاس رکھ کر باقی ایک حصہ دنیا میں آباد تمام جانداروں میں تقسیم کر دیا۔ دنیا کی مخلوقات میں ایک دوسرے کے لئے موجود رحم اور محبت اسی ایک فیصد سے ان کو ملی ہے۔"

ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جو بندہ مجھ تک پہنچنے کے لئے ایک ہاتھ بڑھتا ہے تو میں اس کی طرف ایک قدم بڑھ جاتا ہوں اور جو میری طرف ایک قدم بڑھاتا ہے میں اس کی طرف دو قدم بڑھا دیتا ہوں جو میری طرف چل کر آتا ہے میں اسے ملنے کے لئے دوڑ کر جاتا ہوں۔"

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"......کچھ شک نہیں کہ نیکیاں گناہوں کو دور کر دیتی ہیں......"

(114:11)

خیرات وصدقات بلاشبہ گناہوں کا کفارہ ہے مگر صرف اس سے گناہ معاف نہیں ہوتے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ سے گناہوں کی معافی مانگنا پڑتی ہے اور اللہ کی رحمت بے پایاں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے احکام وفرامین:

(244) قرآن مجید عام طور پر نیکی اور بدی کا ذکر کرتے کے لئے دو اصطلاحیں استعمال کرتا ہے۔"معروف" (نیکی جو ہر ایک کو معلوم ہو کہ نیکی ہے) اور "منکر" (برائی جو سب کے علم میں ہو کہ برائی ہے) دوسرے لفظوں میں قرآن کو انسانی فطرت یعنی اس کی فہم وفراست پر اعتماد ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک معروف فرمان کا مفہوم اس طرح ہے:

"برائی کے حق میں رائے عامہ کبھی نہیں ہوسکتی چاہے چند لوگ اس پر مائل ہو بھی جائیں۔"

قرآن مسلمان کو "بہترین امت" قرار دیتا ہے۔(110:3) قرآن اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ یہ اعزاز انہیں اس لئے دیا گیا ہے کہ یہ "نیکی کی تلقین کرتے اور برائی سے روکتے، نیز ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں۔"

ایک اور آیت قرآنی میں اسے مزید واضح کر دیا گیا:

"......عصر کی قسم کہ انسان خسارے میں ہے، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور آپس میں حق (بات) کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔" (3-1:103)

(245) تاہم مخصوص برائیوں کے خلاف احکام بھی ہیں جیسا کہ پہلے بھی ذکر آ چکا ہے کہ بعض احکام میں واضح طور پر سرعام سزاؤں کا کہا گیا جبکہ بعض گناہوں پر آخرت میں سزا کی وعید دی گئی اور سوائے غیر معمولی سنگینی کے کیسوں کے حکام ان کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

(246) حج الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے تاریخ ساز خطبے میں قرار دیا کہ تم پر ایک دوسرے کی جان و مال اور آبرو حرام ہے اور حقیقت میں اسلام کے تعزیری قوانین کے مطابق تین بڑے جرائم یہ ہیں قتل، دوسرے کو جسمانی طور پر نقصان پہنچانا۔ زنا اور بدکاری، یہ تمام جرائم کسی انسان یعنی جان کے خلاف ہیں۔ چوری اور ڈکیتی (مال کے خلاف جرائم) کسی (خاتون کی) عزت پر تہمت اور شراب نوشی (آبرو کے خلاف جرائم) یہ تمام جرائم مستوجب سزا ہیں اور ان کی سزا اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہے۔

(247) جہاں تک کسی انسان کو نقصان پہنچانے کے جرم کا تعلق ہے تو اس کی سزا اصولاً قصاص ہے جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، دانت کے بدلے دانت، مگر سب سے پہلے کسی بھی فعل کے مقصد اور نیت یا ارادے کو دیکھنا ہوگا کہ آیا نقصان عمداً پہنچایا گیا یا اتفاقاً ایسا ہو گیا؟ اس کے بعد یہ حق متاثرہ شخص (یا متوفی کے ورثاء) کا ہے کہ وہ پہنچنے والے نقصان کے بدلے میں زرتلافی (دیت) قبول کر لے یا ملزم کو مکمل طور پر معاف ہی کر دے۔ اگر عدالتی طور پر ثابت ہو جائے کہ جرم کا ارتکاب عمداً کیا گیا تو اس کے بعد سرکاری حکام کا معاف کرنے کا حق ختم ہو جاتا ہے اب معاملہ متاثرین کے ہاتھ میں ہے کہ وہ فیصلہ کریں۔

(248) زنا اور بدکاری کا معاملہ اس سے قطعی مختلف ہے۔ اس قبیح فعل میں شریک دونوں فریقوں (مرد، عورت) کی رضامندی سے معاملے کی سنگینی کم نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کے اندر انصاف اور خود احتسابی کا تصور اس قدر پختہ کر دیا تھا کہ وہ آخرت کی سزا سے بچنے کے لئے دنیا میں ملنے والی سر عام سزا قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ وہ رضا کارانہ طور پر اپنے گناہ کا اعتراف کر کے اپنے آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روبرو پیش کر دیتے تاکہ وہ ان کو شریعت کے قانون کے مطابق سزا دے دیں۔ اعتراف جرم کے سوا فریقین کی رضامندی سے قائم ہونے والے ناجائز تعلقات کو عدالت میں ثابت کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے اس حوالے سے سازگار ماحول اور ترغیب کو کم کرنے کے لئے اسلام نے احتیاطی تدابیر اختیار کی ہیں۔ مخلوط مجالس کی حوصلہ شکنی، آشنائیوں کے تعلقات نیز نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان کھلے عام ملاقاتوں کی ممانعت کے علاوہ عورتوں کے گھر سے باہر جانے اور اجنبیوں سے گفتگو کرتے وقت چہرے کو نقاب سے ڈھانپنے کی تاکید جیسے احکام اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ کسی قسم کے انداز دلربائی سے اجنبی مردوں کے جذبات برانگیختہ کرنے کا تو اسلام میں تصور ہی

نہیں بلکہ مسلمان عورت کو سختی کے ساتھ پابند کیا گیا ہے کہ اپنے حسن وزیبائش کو صرف اپنے شوہر کے لئے مخصوص رکھے۔ نقاب یا حجاب کے عورت کے لئے دیگر فوائد بھی ہیں۔ مثلاً کھیتوں میں کام کرنے والی عورتوں اور گھر کے اندر رہنے والی عورتوں کے رنگ وروپ میں نمایاں فرق ہر کسی کو نظر آتا ہے۔

ایک اور مثال پرندوں کی ہے کہ ان کے بیرونی اور اندرونی پروں کی رنگت میں فرق پڑ جاتا ہے۔ دراصل حجاب جلد کی کشش اور تازگی کو زیادہ دیر تک محفوظ رکھتا ہے۔ ہاتھوں اور چہرے کی جلد کا اگر جسم کے ان حصوں کی جلد سے موازنہ کیا جائے جو عام طور پر ہمیشہ لباس کے اندر رہتے ہیں تو حجاب کی افادیت مزید واضح ہو جائے گی۔ حجاب کسی عورت کو الگ تھلگ کرنے کی علامت نہیں ہاں اجنبی مردوں کی نظر بد سے عورت کا تحفظ ضرور کرتا ہے۔ اس بات میں ہرگز کوئی وزن نہیں کہ حجاب تپ دق پیدا کرتا ہے۔ تازہ ترین تحقیق کے مطابق یہ بیماری ان عورتوں میں بھی عام ہے جو کبھی حجاب استعمال نہیں کرتیں۔ نہ صرف افریقہ بلکہ فن لینڈ سے لے کر اٹلی تک کے ترقی یافتہ معاشروں میں بھی یہ بیماری پائی جاتی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگر حجاب کے بارے میں قرآن میں کی گئی تاکید پر عمل میں غفلت کی جائے (یعنی کوئی عورت حجاب نہ پہنے یا اس انداز میں نہ پہنے جو اسلام کا منشا ہے) تو شریعت میں اس کی کوئی سزا مقرر نہیں ہے۔

(249) ہم یہاں چوری، ڈکیتی اور املاک کے حوالے سے دیگر جرائم سے متعلق احکام کو تفصیلاً زیر بحث لانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

(250) اسلام کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اس نے عورت کی عزت وعفت پر تہمت لگانے کی سزا مقرر کی ہے۔ اگر عام لوگوں کی اپنی ہمسائیگی میں رہنے والی یا دیگر عورتوں کے کردار کے بارے میں زبان درازی یا سنی سنائی باتوں پر دوستوں کی محفل میں بڑ مارنے کی عادت کو دیکھا جائے تو اسلام کی یہ پابندی معاشرے کے مفاد میں نعمت معلوم ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت پر الزام لگاتا ہے تو اسے عدالتی ثبوت پیش کرنا ہوں گے ورنہ کسی عورت کی عزت پر حرف گیری کی اسلام میں سخت سزا ہے۔

(251) شراب یعنی الکوحل ملے مشروبات کی ممانعت اسلام کی ایسی خصوصیت ہے جو سب کو معلوم ہے۔ اسلام نے اس پابندی کو مرحلہ وار نافذ کیا ہے۔ اس حوالے سے ارشاد ہے:

"اے پیغمبرؐ! لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں کہہ

دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لیئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کے نقصان فائدہ سے کہیں زیادہ ہیں......" (219:2)

"مومنو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو سمجھنے (نہ) لگو نماز کے پاس نہ جاؤ......" (43:4)

اور پھر درج ذیل آیت میں نازل ہونے والے حکم کے ذریعے شراب کی حرمت لاگو کر دی گئی۔

"اے ایمان والو! شراب اور جوا اور بت اور پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمال شیطان میں سے ہیں سو ان سے بچتے رہنا تا کہ نجات پاؤ۔"

"شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو (ان کاموں سے) باز رہنا چاہیے۔" (91-90:5)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مندرجہ بالا آیت (90:5) میں اللہ تعالیٰ نے شراب اور بت پرستی کو ایک ہی درجہ میں رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیات طیبہ میں شراب نوشی پر 40 کوڑوں کی سزا دیتے تھے۔ تاہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں سزا بڑھا کر 80 کوڑے کر دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ شراب کے نشے میں انسان بہک کر یاوہ گوئی کرتا ہے اور عورتوں پر تہمتیں لگاتا ہے جس کی سزا قرآن میں 80 کوڑے ہے (4:24) اس لئے شراب نوشی کی سزا بھی 80 کوڑے ہونی چاہیے۔ کتنے مالی ضیاع سے بچا جا سکتا ہے اور کتنے گھرانوں کا امن اور سکون لوٹ سکتا ہے اگر یہ شراب خانہ خراب جو صحت کی بھی دشمن ہے چھوڑ دی جائے۔

(252) جن افعال پر اسلام نے از خود کوئی سزا مقرر نہیں کی بلکہ یہ قاضی یا جج کی صوابدید پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ حالات و واقعات کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کر لیں۔ ان میں قسمت آزمائی کے کھیل (بشمول لاٹری، ریس کے نتائج پر جوا وغیرہ) شامل ہیں جوا خانوں میں کیسے کیسے المیے رونما ہوتے ہیں ان کے بارے میں کون نہیں جانتا۔ راتوں رات امیر ہونے کے لالچ میں کتنے گھرانے اجڑ جاتے ہیں اور جو لوگ اس رستے سے کماتے بھی ہیں تو حرام کی کمائی۔ قومی سطح پر لاٹریوں سے

بتدریج ملکی دولت کی منصفانہ تقسیم کا نظام درہم برہم ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ تمام معاشی بیماریوں کی جڑ ثابت ہوتا ہے۔ یہ راستے سیاست کو بھی متاثر کرتے ہیں۔

(253) معاشرے اور سب سے بڑھ کر سرکاری انتظامیہ کو بدعنوانیوں سے پاک رکھنے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کڑا انتظام قائم کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔''

ایک روز سرکاری محاصل جمع کرنے والے ایک اہلکار نے حساب پیش کرتے ہوئے کہا: یہ تو سرکاری محاصل ہیں اور یہ چیزیں مجھے تحفے میں ملی ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سن کر سخت آزردہ ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبویؐ میں اپنے منبر پر کھڑے ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ان ٹیکس وصول کرنے والوں سے کہیں کہ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں اور پھر دیکھیں کہ انہیں کتنے تحائف آتے ہیں۔''

ایک دفعہ خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ نے اپنے شوہر کے علم میں لائے بغیر رومی شہنشاہ کے دربار میں جانے والے مملکت اسلامیہ کے سفیر کے ہاتھ اس کی ملکہ کے لئے تحفہ بھیج دیا۔ جس نے جواب میں انتہائی بیش قیمت ہار آپؓ کی اہلیہ کے لئے بھیجا۔ جب یہ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علم میں آیا تو آپؓ نے یہ ہار اپنی اہلیہ سے لے کر بیت المال میں جمع کرا دیا اور اپنی اہلیہ کو ان کے اس تحفے کی قیمت ادا کر دی جو انہوں نے ملکہ کو بھیجا تھا۔ یہ واقعہ طبری نے روایت کیا ہے۔

(254) اُمّہ کی اخلاقی اصلاح کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''زمانے کو گالی مت دیا کرو کیونکہ اس طریقے سے تم لوگ خدا کو (نعوذ باللہ) گالی دیتے ہو کیونکہ رات اور دن کا آنا جانا اللہ کی جانب سے ہے۔''

یہ ایسی فہمائش ہے جس پر آج بھی ہمیں غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ہم ہر روز موسم کو کوستے رہتے ہیں۔

(255) اسلام کسی ناممکن کو زبردستی ممکن نہیں بناتا۔ اس کی کوشش صرف یہ ہوتی ہے کہ انسانی زندگی کے ہر شعبے میں انفرادی اور اجتماعی سطح پر مستقل نیک سیرتی لائی جائے تاہم ذمہ داری ہمیشہ

انفرادی طور پر لاگو ہوگی۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"...... (جو کوئی) اچھے کام کرے گا تو اس کا ان کو فائدہ ملے گا، برے کرے گا تو ان سے ان کا نقصان پہنچے گا......" (286:2)

ایک نیک طینت انسان کبھی اس بہانے کی آڑ میں برائی کے ارتکاب پر آمادہ نہیں ہوتا، کہ دوسرے بھی تو ایسا ہی کر رہے ہیں۔ اس لئے دوسروں کے برے کاموں کی تقلید کی بجائے اچھی مثالوں کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور صاحب کردار لوگوں کی پیروی کو دستور عمل بنانا چاہیے۔

(256) سماجی رویے اور لوگوں سے عمومی برتاؤ کے حوالے سے اسلام کی تعلیمات بہت واضح ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ہمسائیگی کے بارے میں فرمان ہے:

"جبریل علیہ السلام نے ہمسایوں کے حقوق کے بارے میں اتنی دفعہ اور اتنی زیادہ تاکید کی ہے کہ مجھے یہ گمان پیدا ہو گیا کہ وہ شاید ہمسایوں کو وراثت میں بھی حقدار بنانے والے ہیں۔"

بتایا جاتا ہے کہ مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہمسایہ ایک یہودی تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عملاً کر کے دکھایا کہ ایک مسلمان کو اپنے غیر مسلم ہمسایہ سے کیسا سلوک روا رکھنا چاہیے۔ روزمرہ کی ہلکی پھلکی نوازشات کے علاوہ اگر وہ کبھی بیمار پڑ جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عیادت کو بھی تشریف لے جاتے اور جہاں تک ممکن ہوتا اس کی مدد بھی فرماتے۔ دوسروں کے ساتھ روزمرہ کے تعلقات کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے بھائی (یعنی دوسرے مسلمان) کے لئے وہی چیز پسند نہ کرے جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

ایک اور حدیث پاک میں ارشاد ہے:

"تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو دوسروں سے بھلائی کرتا ہے۔"

قرآن مجید میں مدینہ کے ان اولین مسلمانوں کا ذکر ہے جنہوں نے مہاجرین مکہ کے لئے اپنے دلوں اور گھروں کے دروازے کھول دیئے تھے اور ان کے اس فعل (مواخات) کو اسلام کا عمی نمونہ قرار دیا ہے:

"......اور (انصار) ان (مہاجرین) کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو......" (9:59)

(257) موضوع کا اختتام قرآن مجید کی اس آیت سے کرتے ہیں:

"اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو اور اللہ کے لئے سچی گواہی دو خواہ (اس میں) تمہارا یا تمہارے ماں باپ اور رشتہ داروں کا نقصان ہی ہو، اگر کوئی امیر ہے یا فقیر تو اللہ ان کا خیر خواہ ہے تو تم خواہش نفس کے پیچھے چل کر عدل کو نہ چھوڑ دینا......" (135:4)

باب نمبر 8

اسلام کا سیاسی نظام

چوں کہ اسلام کا تصور حیات بدن اور روح کے امتزاج سے عبارت ہے اس لیے مذہب اور سیاست کے مابین یعنی مسجد اور قلعہ کے درمیان ایک قریبی تعلق قائم ہونا عین فطری ہے۔ سماجی حوالے سے اسلام باہم میل جول کا مذہب ہے۔ یہ ایک دوسرے سے رابطوں پر محیط اجتماعی نوعیت کی زندگی کو پسند کرتا ہے۔ یہ نماز باجماعت اور جمعہ کی نماز کا حکم دیتا ہے، جس میں ہر ایک کا رخ ایک ہی مرکز یعنی کعبہ کی طرف ہوتا ہے۔ رمضان المبارک کے دوران پوری دنیا میں بیک وقت مسلمان روزے رکھتے ہیں اور حج کے دوران جو اسلام کے چار بنیادی ارکان میں شامل ہے، دنیا کے کونے کونے سے مسلمان مرد عورتیں جمع ہو کر بیت اللہ کا طواف کرتے ہیں جہاں تک ذمہ داریوں اور فرائض کا تعلق ہے اس کا زور افراد پر ہوتا ہے کہ ہر کوئی اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ یہ افراد کی فلاح کو بھی فراموش نہیں کرتا اور تمام افراد کو وحدت کی لڑی میں پرو دیتا ہے یعنی عالمگیر سطح پر امت مسلمہ کی تشکیل کرتا ہے۔ ایک ہی قانون کے تحت سب کے معاملات نمٹتے ہیں چاہے کوئی بھی طبقہ ہو یا ملک اور جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ ایک ہی حاکم یعنی خلیفہ سے دنیا بھر کے مسلمان حلف وفاداری اٹھاتے ہیں۔

قومیت:

(259) انسانی معاشرے میں ہم ایک کے بعد دوسرے دو باہم متصادم رجحانات کا مشاہدہ کرتے ہیں مرکز خواہ اور مرکز گریز۔ ایک طرف نوع انسان کے کچھ افراد آپس میں شادیاں کر کے خاندان، قبیلے تشکیل دیتے اور شہری ریاستیں، حکومتیں اور پھر سلطنتیں قائم کرتے ہیں، بعض اوقات مرضی سے اور بعض اوقات جبر کے تحت، جب کہ دوسری طرف ایک ہی جوڑے اور آباؤ اجداد کی

اولاد بعض اوقات بڑے یونٹوں سے الگ ہو کر اپنے عزیز و اقارب کو چھوڑ کر دور جگہوں پر نکل جاتے ہیں تا کہ اپنی الگ خودمختارانہ زندگی گزار سکیں۔ اپنے آبائی علاقے چھوڑ کر دوسرے مقامات کی طرف نقل مکانی بعض اوقات ضروریات زندگی کے وسائل کی تلاش کے لیے ہوتی ہے کیونکہ اس علاقے میں خوراک کے ذرائع کم ہونے لگتے ہیں جن سے سب کی غذائی ضروریات پوری نہیں ہو سکتیں اس لیے رزق کی تلاش میں انسانی گروہ دیگر زرخیز علاقوں کا رخ کرتے ہیں، تاہم کبھی یہ نقل مکانی محبت، لڑائی، جھگڑے اور دوسرے مقاصد کے تحت بھی ہوتی ہے۔

(260) اس کم و بیش متفقہ نظریے کے باوجود کہ تمام انسانی نسلوں کی ایک ہی مشترکہ ابتداء ہے، دو عوامل نے باہم رابطوں کو گھٹانے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور یہ دو عوامل ہیں۔ موت اور دوری، انسان جبلی طور پر قریبی رشتہ داروں اور اپنے آباؤاجداد سے گہری وابستگی محسوس کرتا ہے لیکن مشترکہ والدین کے انتقال کے ساتھ ہی اس قوت کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو پسماندگان کو آپس میں جوڑے ہوئے تھی اور ان کے درمیان تعلق بتدریج کمزور اور غیر مؤثر ہوتا جاتا ہے۔ جہاں تک دوری کا تعلق ہے نہ صرف اس سے باہمی تعلق اور رشتے بھولنے لگتے ہیں بلکہ تاریخ بتاتی ہے کہ آپس میں ناقابل عبور رکاوٹیں کھڑی ہو جاتی ہیں اور اس طرح نہ صرف ان کی زبانیں بلکہ مفادات اور اقدار بھی مختلف ہو جاتی ہیں۔

(261) ساتویں صدی عیسوی میں ظہور اسلام کے وقت نسل، زبان، جنم بھومی اور بعض دوسری چیزوں کی بنیاد پر اختلاف اور تعصب کا دور دورہ تھا۔ ان امتیازات کی جڑیں بہت گہری تھیں اور کم و بیش فطری جذبہ کا درجہ انہیں حاصل ہو چکا تھا اور یہ صورتحال عرب، یورپ، افریقہ، ایشیا اور امریکہ سمیت دنیا میں ہر جگہ تھی۔ اسلام نے آ کر ان امتیازات کو انسانیت کی گراوٹ قرار دیا اور ان کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی۔

(262) ایک ایسی دنیا میں جہاں لالچ نے ہر شخص کو دوسرے کے خلاف صف آرا کر رکھا ہے، کنبہ، خاندان بلکہ قبیلے کو بھی متحد رکھنے والے عوامل اتنے کمزور ثابت ہوئے کہ اتحاد کو پارہ پارہ کرنے والے عوامل کا مقابلہ نہ کر سکے بلکہ بعض اوقات جنگجوؤں اور بادشاہوں نے طاقت کے زور پر قبائل سے بھی بڑے گروپ کھڑے کر لیے تاہم رعایا یا آبادی کی اجتماعیت میں اپنے مفادات کی کوئی شناخت مہیا کرنے میں ناکامی کے باعث یہ مصنوعی اتحاد شکست و ریخت کا شکار ہوتے رہے۔

(263) انسانی معاشرے کے اس پہلو کی ترقی کے لیے کئی ہزار سال کی تاریخ کا حوالہ دیے بغیر اس نکتہ کی وضاحت کے لیے دور حاضر میں رائج قومیت کے نظریہ کو ہی زیر غور لے آنا کافی ہوگا۔ اگر قومیت کی بنیاد زبان، نسل یا جنم بھومی کی شناخت پر رکھی جائے تو یہ امر مسلمہ ہے کہ غیر ملکیوں اور اجنبیوں کا مسئلہ مستقل موجود رہے گا اور اس قسم کی قومیت کا دائرہ بہت تنگ ہوگا، کبھی دنیا بھر کے باسیوں کو اس میں شامل نہیں کیا جا سکے گا اور اگر خارجیوں یا غیر ملکیوں کو (یعنی جو فرزند زمین نہیں ہیں) جذب نہ کیا گیا تو تصادم اور جنگ کے خدشات ہمیشہ برقرار رہیں گے۔ درحقیقت قومیت کا تعلق کوئی یقینی رشتہ نہیں ہے اس لیے کہ دو بھائی آپس میں دشمن بھی ہو سکتے ہیں جبکہ ایک ہی نظریے پر یقین رکھنے والے دو اجنبی دوست بھی ہو سکتے ہیں۔

(264) قرآن مجید نے زبان، رنگ یا فطرت کے دوسرے ناگزیر عوامل کی بنا پر ہر قسم کی فضیلت اور برتری کو مسترد کر دیا ہے بلکہ فضیلت کا واحد معیار خدا خوفی اور پرہیزگاری کو بنایا ہے۔ (13:49,22:30) مسلمانوں میں ''قومیت'' کی بنیاد مشترک نظریہ ہے اور یہ نظریہ اسلام کا ہے۔ عالمگیر مذاہب میں اسلام کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ یہ ترک دنیا کو مسترد کرتا ہے جبکہ بدن اور روح (دنیا اور دین) کے بیک وقت سرگرم عمل ہونے پر اصرار کرتا ہے۔ ماضی کا مشاہدہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں نے نسل اور علاقائی حد بندیوں سے آزاد ہو کر ایک عالمگیر اخوت کا اصول اپنایا اور یہ جذبہ آج بھی ان کے درمیان ایک زندۂ جاوید قوت کے طور پر موجزن ہے۔

(265) حقوق قومیت کو تمام اقوام میں تسلیم کیا جاتا ہے مگر کسی (اجنبی) کو جب کسی ملک کے حقوق شہریت حاصل ہوتے ہیں تو (مقامی لوگوں سے) مختلف رنگ اور نئی سرزمین میں جذب ہونا آسان نہیں جتنا ایک نئے نظریے سے وابستگی اختیار کرنا۔ دوسروں کے لیے قومیت بنیادی طور پر ایک ایسی چیز ہے جسے قدرت کا فیصلہ کہا جا سکتا ہے (یعنی قدرت نے اسے جہاں پیدا کیا وہی اس کی قومیت ہے) البتہ اسلام کی صورت حال مختلف ہے۔ اسلام میں قومیت کا انحصار فرد کی مرضی اور انتخاب پر ہے (یعنی وہ اپنی خوشی اور مرضی سے مسلمان ہو کر ایک عالمگیر قومیت کا رکن بن جاتا ہے)

عالمگیریت کے طریقے:

(266) ان طریقوں کے علاوہ جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی سب کے لیے ایک ہی کلمہ ایک ہی قبلہ رخ، حج بیت اللہ کا ایک ہی مقام، مسلمانوں کی عالمگیر خلافت کا تصور بھی خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔

(267) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجا (قرآن 28:34) اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے آخری رسول بھی ہیں۔ (قرآن 40:33) اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت تک کے لیے اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے نسل اور قوم کے ہر قسم کے امتیازات اور اونچ نیچ کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات روحانی اور مادی (مذہبی اور سیاسی) سمیت تمام اختیارات کا منبع تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلی مسلم ریاست میں جس کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بانی بھی تھے۔ دینی اور دنیاوی امور کے مدار المہام تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اختیارات آپؐ کے وصال کے بعد ورثے میں آپ کے سیاسی جانشینوں کو منتقل ہو گئے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین پیغمبر نہیں تھے اور اس لیے ان پر وحی کا نزول بھی نہیں ہوتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک منظم زندگی پر زور دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ "جو کوئی اس حالت میں مر گیا کہ اس کو علم ہی نہیں کہ اس کا امام (خلیفہ) کون ہے گویا وہ حالت کفر میں مرا۔" اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت مسلمہ کے اندر اتحاد اور یکجہتی کی بہت تاکید فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے "جو کوئی اس (امت مسلمہ) سے ناطہ توڑتا ہے وہ جہنم میں جائے گا۔"

(روایت مسلم، ترمذی)

(268) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارکہ میں بھی ایسے کچھ مسلمان تھے جو اِکّا دُکّا یا کہیں گروپوں کی صورت میں رضاکارانہ طور پر یا کسی مجبوری کے تحت اسلامی ریاست کی حدود سے باہر کے علاقوں میں مقیم تھے مثلاً حبشہ (اب اری ٹیریا) اور مکہ (فتح سے پہلے)۔ بعض غیر مسلم خطوں میں مذہبی برداشت اور رواداری نہیں تھی اور وہ مسلمانوں کو تعذیب کا نشانہ بناتے تھے (مثلاً

مکہ اور سلطنت روم) جب کہ بعض دوسرے ملکوں میں جیسے حبشہ میں رواداری تھی۔

(269) جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ خلیفہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوہرے اختیارات منتقل ہوئے یعنی مذہبی اور سیاسی امور دونوں کی سیادت انہیں حاصل تھی۔ خلیفہ وقت نماز کی امامت بھی کرواتے، مسجد کا خطبہ دیتے اور سربراہ ریاست (یا حکومت) کے فرائض بھی ادا کرتے تھے۔

(270) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی جاتی تھی اور خلیفہ کے انتخاب کے وقت بھی بیعت کا طریقہ کار ہی اپنایا جاتا تھا۔ ریاست کے نظم ونسق (یعنی حکومت) کی بنیاد حکمران اور شہریوں میں ایک معاہدے پر ہوتی ہے۔ عملاً ایسے افراد جنہیں آبادی کا سب سے زیادہ حق نمائندگی حاصل ہوتا ہے بیعت کرتے ہیں۔ اس معاہدے یا کنٹریکٹ میں یہ اصول مسلمہ ہے کہ نامزد کرنے والے نمائندے ہی حکمران کو معزول کرنے یا اس کے حق حکمرانی ختم کرنے کا اختیار بھی رکھتے ہیں۔

(271) محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی قوم کی قیادت کا اختیار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیغمبر ہونے کے ناطے حاصل تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو قوانین نافذ کیے اور بعد میں آنے والوں کے لیے چھوڑے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی روشنی میں وضع کیے گئے تھے۔ جہاں تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشینوں کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ تو بدستور ان کے دائرہ عمل میں جاری وساری تھی تاہم وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین تھے، مگر ان کے لیے وحی کے نزول کا سلسلہ موجود نہ تھا، اس لیے قانون سازی کے حوالے سے ان کے اختیارات محدود تھے اور وہ ان قوانین کو منسوخ نہیں کرسکتے تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم "خدائی قوانین" کے نام سے نافذ کرچکے تھے۔ تاہم وہ ان قوانین کی تشریح کرسکتے تھے اور جن معاملات پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نافذ کردہ قوانین خاموش تھے وہاں نئے قوانین بھی بناسکتے تھے۔ دوسرے لفظوں میں خلیفہ کو کم از کم قانون سازی میں مطلق العنان حکمران کے اختیارات حاصل نہیں تھے، وہ ریاست کے آئینی سربراہ ضرور تھے مگر ملکی قوانین کے سامنے ان کی حیثیت بھی مملکت کے دوسرے شہریوں کے برابر تھی۔ اور یہ روایت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قائم فرمائی کہ مسلم ریاست کا سربراہ قانون سے بالا نہیں ہوسکتا اور تاریخ میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب خلیفہ کے خلاف غریب ترین مسلمانوں بلکہ غیر مسلم

شہریوں نے بھی عدالتوں سے رجوع کیا اور طلب کرنے پر خلیفہ عدالتوں میں حاضر بھی ہوئے اور یہ روایات خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لے کر دور حاضر کے مسلم حکمرانوں تک میں چلی آتی ہے۔

(272) یہ بات اپنی جگہ ہے کہ مسلم معاشروں میں خلیفہ کے حوالے سے نظریاتی اور عملی صورت ہمیشہ یکساں نہیں رہی اس کی حقیقی صورتحال سمجھنے کے لیے اس کی تاریخ کا مختصر حوالہ سودمند ہوگا۔

خلافت:

(273) قرآن میں بادشاہوں کا تذکرہ موجود ہے جن میں اچھے بھی تھے اور برے بھی لیکن اس کے سوا کسی طرز حکومت مثلاً جمہوریت کا ذکر نہیں کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جانشینی کے معاملے پر جو اختلاف پیدا ہوا وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جانشینی کے بارے میں کوئی واضح وصیت نہیں چھوڑی تھی۔ اس موقع پر بعض افراد کی رائے تھی کہ یہاں اقتدار بھی وراثت کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کو ہی منتقل ہونا چاہیے اور چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عم زاد (اور داماد) حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ترین وارث اور جانشین ہو سکتے تھے۔ تاہم بعض حضرات کی رائے تھی کہ عبوری طور پر کسی کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جانشین چن لیا جائے مگر اس گروپ میں یہ اختلاف تھا کہ امیدوار کون ہو، لیکن صحابہؓ کی اکثریت (نامزدگی کی بجائے) الیکشن کے حق میں تھی۔ نظام حکومت کے لیے وراثتی بادشاہت اور جمہوریت کے درمیان کا راستہ تلاش کیا گیا یعنی خلیفہ ہوگا تو منتخب مگر وہ تاحیات حکمران ہوگا۔ اس طرح حکمران کے انتخاب میں تو جمہوری طرز ہی اپنایا گیا مگر اس کا دورانیہ ملوکیت سے مشابہ تھا۔

خلافت کے آغاز سے ہی ایسے لوگ سامنے آ گئے جو خلیفہ سے اختلاف رکھتے تھے بلکہ بعد میں بعض حریف بن کر ابھرے اور اس راستے میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں نے ایک دوسرے کا خون بھی بہایا اسی دوران عنان اقتدار پر ملوکیت کا غلبہ ہو گیا اور بنو امیہ قصر خلافت میں داخل ہو گئے۔ جن کے اقتدار کا خاتمہ کر کے عباسی برسر اقتدار آ گئے۔ تاہم عباسیوں کو سپین جیسے دور دراز صوبے کا خراج وصول کرنے کا اعزاز حاصل نہ ہو سکا۔ جہاں (امویوں کی نسل سے) خودمختار مسلم

حکمران عملاً خاندانی بادشاہت کا نظام اپنائے ہوئے تھے مگر انہیں ''خلیفہ'' کا لقب اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور یہ کہیں دو صدیوں بعد ہوا کہ مسلم دنیا میں کئی ''خلافتیں'' قائم ہو گئیں۔ اس طرح بغداد، قرطبہ (سپین) اور مصر (فاطمی حکمران) میں بیک وقت الگ الگ خلافتیں قائم ہو گئیں یعنی یہاں کے حکمرانوں نے خلیفہ کا لقب اختیار کر لیا۔

جب ترک مسلمان ہوئے تو وہ ایک نئی تبدیلی لے آئے۔ پہلے تو وہ حکمرانوں کو سپاہی مہیا کرنے لگے اور پھر کمانڈر جو بعد میں مملکت کے اندر اختیارات کے مرکز بن گئے۔ خلفا کے ساتھ ساتھ ایک ''امیر الامرا'' کا منصب سامنے آ گیا جو بعد میں ''سلطان'' بن گئے۔ اس طرح ریاستی اقتدار تقسیم ہو گیا اور ملکی نظم و نسق سلاطین کے ہاتھوں میں آ گیا جو خلیفہ کے نام پر حکمرانی کرنے لگے۔ اس صورتحال نے ہوس اقتدار اور حسد کو ہوا دی اور بہت سے صوبے خود مختار ہو گئے جہاں کے گورنروں نے ''خاندانی حکمرانی'' کی بنا ڈالی۔ ان کی جگہ لینے کے لیے کئی مہم جو کھڑے ہو گئے اور خلیفہ کے پاس سوائے اس کے کوئی راستہ باقی نہ رہا کہ صوبوں میں جو اقتدار پر قابض ہو جاتا اس کو سند عطا کر دی جاتی۔ اس سلسلے میں جب سے پہلے مصر کی فاطمی خلافت کا خاتمہ ہوا اور یہاں ترک، کرد حکمرانوں نے قیادت حاصل کر لی، جنہوں نے خلافت بغداد کی سرپرستی تسلیم کر لی۔ جب تاتاریوں نے اس ملک کو تاراج کیا تو خلافت ایک دفعہ پھر مصر میں منتقل ہو گئی۔ پھر جب عثمانی ترکوں نے مصر فتح کیا تو وہاں ''نئی'' عباسی خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد ہسپانیہ (سپین) کی خلافت نے عیسائی فاتحین کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے (اور سپین میں کم و بیش 8 سو سالہ مسلم اقتدار کا خاتمہ ہو گیا) اور وہاں سے نکلنے والوں نے مراکش میں خلافت قائم کر لی۔ قسطنطنیہ (استنبول) میں قائم عثمانی ترکوں اور ہندوستان میں مغل حکومت نے بھی خلافت کا دعویٰ کیا مگر وسیع و عریض سلطنتیں ہونے کے باوجود ان کی ''خلافت'' کو صرف ان کی حدود کے اندر ہی تسلیم کیا گیا۔ ان دو ''خلافتوں'' سے قبل خلیفہ کے لیے ضروری تھا کہ وہ کم از کم ''قریشی'' ضرور ہو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور کے مکی عربوں کی اولاد میں سے ہو، ترک اور مغل یہ شرط پوری نہیں کرتے تھے مگر اس نکتے پر ہم بعد میں بات کریں گے۔

مغلوں کو انگریزوں نے ہندوستان میں اقتدار سے باہر کر دیا اور ترک خلیفہ کو خود اس کے عوام نے تخت سے معزول کر دیا۔ جنہوں نے نہ صرف جمہوری نظام حکومت کا انتخاب کیا بلکہ

خلیفہ کو محض سربراہ ریاست کے طور پر بھی باقی رہنے کی اجازت نہیں دی۔ خلیفہ کے اختیارات اور مراعات گرینڈ نیشنل اسمبلی کو سونپ دی گئیں لیکن اس نے نہ کبھی انہیں اپنایا نہ ہی استعمال کیا۔ آخری ترک خلیفہ عبدالحمید دوم جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد 100 ویں ''خلیفہ'' تھے، جلاوطنی کے دوران پناہ گزین کی حیثیت سے پیرس میں انتقال کر گئے۔ اسی دوران مراکش میں قائم خلافت فرانس کی تحویل میں آ گئی۔

(274) اس سلسلے میں بعض مشاہدات خود ہی ایک تاریخ بیان کر رہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش گوئی فرمائی تھی کہ میرے بعد خلافت تیس سال قائم رہے گی اور اس کے بعد ایک ظالمانہ بادشاہت آ جائے گی (نہایہ، از ابن اثیر، ترمذی ابوداؤد)۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک اور فرمان بھی منسوب کیا جاتا ہے کہ خلافت کا حق قریش کا ہے، تاہم اس فرمان کا حوالہ دستیاب نہیں۔ مگر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی عمل سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہوسکی کہ حکمرانوں کا تعلق لازمی طور پر قریش سے ہونا چاہیے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ ہجرت کے بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریاست مدینہ کی بنیاد رکھی تو مختلف مواقع پر کم از کم 25 بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دارالحکومت سے باہر تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ غیر حاضری بعض اوقات جنگی مہمات پر روانگی کے باعث تھی اور متعدد بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امن کی کوششوں (مثلاً مختلف قبائل سے معاہدے کرنے یا پھر عمرہ اور حج وغیرہ) کے سلسلے میں بھی مدینہ سے باہر گئے۔ ان مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی غیر موجودگی میں کسی نہ کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کیا مگر یہ نہیں تھا کہ ہر بار ایک ہی شخصیت کا انتخاب کیا جاتا تھا بلکہ مختلف اوقات میں مختلف افراد کو یہ ذمہ داری سپرد کی گئی جن میں انصار، قریش، بنوکنانہ اور دوسرے قبائل کے لوگ بھی شامل تھے اور ایک بار ایک نابینا (ابن مکتوم) کو بھی اس منصب پر فائز فرمایا۔ اور یہ موقع حج الوداع کا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے پہلے اور آخری حج پر مکہ تشریف لے گئے اور اس کے لیے صرف تین ماہ بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے رب کا بلاوا آ گیا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد جب بار خلافت منتقل کرنے کے تنازعہ نے سر اٹھایا اور انصار اور مہاجرین دونوں خلافت پر حق جتلانے لگے تو ایک

تجویز سامنے آئی کہ بیک وقت دو خلفا مقرر کیے جائیں یعنی ایک مہاجروں کا نمائندہ اور ایک انصار کا مگر نا قابل عمل ہونے کی بناء پر یہ تجویز مسترد کر دی گئی۔ [1]

تاہم اس کے باوجود یہ مسلم حکومت کی ممکنہ شکل تھی جیسا کہ قرآن سے بھی ثابت ہے (32:20) کہ ہارون علیہ السلام کو موسیٰ علیہ السلام کے ریاستی اقتدار میں حصہ دار بنایا گیا تھا اور اس فارمولے کی تائید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک عمل سے بھی ہوئی جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمان کے مشترکہ حکمران بھائیوں جیفر اور عبد کو مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنے مناصب پر برقرار رکھا اور وہ مشترکہ طور پر حکومت چلاتے رہے۔ [2]

(275) عالمگیر خلافت کا آج کوئی تصور مسلمانوں میں موجود نہیں حالانکہ مسلمان بحیثیت مجموعی مسلسل اس کے خواہاں رہے ہیں۔ عالمگیر خلافت کی بحالی کے لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مسعود کی مثالوں کو اپنانا ہوگا تا کہ علاقائی رقابتوں اور شکوک وشبہات کا خاتمہ کیا جا سکے۔

---

1. یہ روایت ابن ھشام کی ہے لیکن ابن سعد (I/III، صفحہ 151) نے پوری تفصیل دی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل کا حوالہ بھی دیا ہے، وہ کہتے ہیں "ابوسعید الخدریؓ کی روایت ہے: جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا تو انصار کے بعض نمایاں افراد کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے اے مہاجر بھائیو! جب بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کو عامل (گورنر) مقرر فرماتے تو ہم میں سے کسی کو اس کے ساتھ منسلک کر دیتے اس لیے ہماری رائے یہ ہے کہ اس حکومت (خلافت) میں بھی دونوں کی شرکت ہو۔ ایک (خلیفہ) آپ میں سے ہو اور دوسرا (خلیفہ) ہم میں سے ہو۔"

دیار بکری کی روایت قدرے زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ ان کے مطابق (خمیس 169,168,12) انصار نے مہاجرین کو یہ تجویز دی تھی: "اگر آج آپ خلیفہ اپنے میں سے منتخب کرتے ہیں تو اس کی موت پر ہم انصار میں سے خلیفہ نامزد کیا جائے اور جب انصاری خلیفہ کا انتقال ہو جائے گا تو پھر مہاجر خلیفہ کا انتخاب ہوگا اور اس طرح باری باری خلیفہ منتخب کرنے کا یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک روئے زمین پر مسلمان موجود ہیں۔

2. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں بھائیوں کو خط روانہ فرمایا وہ محفوظ ہے۔ اس میں لکھا ہے:

"اگر آپ دونوں اسلام قبول کر لیں تو میں آپ دونوں کو بطور حکمران برقرار رکھوں گا
لیکن اگر آپ نے اسلام قبول نہ کیا تو آپ کی سلطنت ختم ہو جائے گی۔"

ایک خلافت کونسل بنائی جائے جو مسلم ریاستوں کے سربراہوں پر مشتمل ہو اور جس میں سنی اور شیعہ، قریشی اور غیر قریشی تمام شامل ہوں اور باری باری ہر رکن ایک سال کے لیے ہی سہی اس کونسل کی صدارت کرے۔

ریاست کے فرائض:

(276) ایک مسلم ریاست کی چار ذمہ داریاں نظر آتی ہیں:

(1) انتظامیہ (سول اور فوجی نظم و نسق کے لیے)۔

(2) مقننہ۔

(3) عدلیہ۔

(4) تہذیبی ذمہ داریاں۔

(277) انتظامیہ کی لمبی چوڑی وضاحت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ آپ اپنی تفصیل ہے۔ اقتدار اعلیٰ خدا کا ہے اور یہ ایک امانت ہے جس کی ذمہ داری انسان کے سپرد ہے جو وہ بلا امتیاز سب کی فلاح و بہبود کے لیے اٹھاتا ہے۔

(278) اسلامی معاشرے میں قانون سازی کے حوالے سے حدود کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔ کیونکہ قرآن قوانین کا سرچشمہ ہے اور اس میں زندگی کے تمام شعبوں چاہے دینی ہوں یا دنیاوی قوانین اور ضابطے موجود ہیں۔

(279) عدلیہ کے حوالے سے ہم پہلے نشاندہی کر چکے ہیں کہ اسلام کے قانون میں سب برابر ہیں۔ جس میں سربراہ مملکت اور حکومت کو شہریوں کی طرف سے کسی چارہ جوئی کے خلاف کسی قسم کا استثنیٰ یا تحفظ حاصل نہیں۔ قرآن نے ایک بہت اہم فیصلہ بھی دیا ہے کہ اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو عدالتی خودمختاری حاصل ہے۔ (66:5,50-42:5) اور ہر عقیدے کے لوگ اپنے قوانین کے مطابق اپنا الگ نظام عدل قائم کر سکتے ہیں جس میں تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات وہ اپنے قوانین کے مطابق نمٹانے میں آزاد ہیں۔ قرآن کے مطابق یہودی تورات اور مسیحی انجیل کے قوانین کے مطابق اپنے معاملات نمٹا سکتے ہیں۔ اس صورت میں کہ اگر مقدمہ میں دو مختلف مذاہب کے لوگ شامل ہوں تو قانون اور ججوں کے انتخاب کی کسوٹی خصوصی اہتمام کے تحت ہوگی اور یہ پرائیویٹ انٹرنیشنل لاء جیسی صورت ہوگی جو اس قسم کے مقدمات کا فیصلہ کرے گی۔

(280) تہذیبی ذمہ داری سے ہماری مراد ہے کہ جو اسلام کا مطلوب و مقصود ہے اسے مطمح نظر بنایا جائے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ پوری دنیا میں خدا کا قانون جاری و ساری ہو اس لیے یہ ہر مسلمان کی انفرادی ذمہ داری بھی ہے اور ہر مسلمان حکومت کا فرض ہے کہ نہ صرف روزمرہ کے معاملات میں خدائی قانون کی پابندی کی جائے بلکہ بیرونی ممالک میں مشن اور وفود روانہ کیے جائیں جو دوسرے لوگوں کو بتائیں کہ اسلام کا نصب العین کیا ہے۔ اس کا بنیادی اصول تو قرآن نے بیان کر دیا ہے کہ ''دین میں کوئی زبردستی نہیں'' (356:2) مگر اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ تبلیغ اسلام کے سلسلے میں لاپرواہی یا لاتعلقی کا رویہ اپنا لیا جائے بلکہ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے لیے اور دوسروں کو قبول اسلام پر آمادہ کرنے کے لیے مسلسل اور پورے جذبہ سے کوشش کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔

نظام حکومت:

(281) اسلام حکومت کے بیرونی نظام کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ نظام کوئی بھی ہو اس کا اطمینان اس بات میں ہے کہ اس میں بنی نوع انسان کی دین و دنیا کی بھلائی کو مدنظر رکھا گیا ہو اور خدا کے قانون کو لاگو کیا جائے۔ اس طرح آئینی سوال ثانوی حیثیت اختیار کر جاتا ہے اور جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ (ان خصوصیات کے ساتھ) جمہوری ''ملوکیت'' مشترکہ حکومت یا کوئی بھی دوسرا نظام اسلام کے لیے قابل قبول ہے۔

(282) اگر یہ مقصد فرد واحد کے بطور حاکم ہونے کی صورت میں پورا ہو جائے تو بھی یہ قابل قبول ہے تاہم اگر ایک مقررہ وقت میں، ایک مخصوص ماحول میں ''امیر المؤمنین'' یا خلیفہ کی مطلوبہ خصوصیات کسی ایک شخصیت میں اکٹھی نہیں ملتیں تو حکومت کے بطریق احسن چلانے کے لیے اقتدار کی تقسیم پر رضا کارانہ آمادگی کا اظہار ہونا چاہیے۔ یہاں ایک مشہور واقعہ کا حوالہ دینا مناسب ہوگا جس کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے۔ (47-246:2)

ایک پیغمبر کو ان کی قوم نے کہا کہ ان کے لیے ایک بادشاہ کا انتخاب کریں جو ان پیغمبر کے سوا کوئی شخصیت ہوتا کہ وہ اس کی قیادت میں دشمن سے جنگ کر سکیں جس نے انہیں بال بچوں سمیت ان کے گھروں سے نکال دیا تھا۔ ایک پیغمبر کی موجودگی میں بادشاہ کا انتخاب جس میں خود ان کی رائے بھی شامل ہو، یہ ظاہر کرتا ہے کہ دینی اور دنیاوی معاملات میں اختیارات کی تقسیم سے

دین کے معاملات متاثر نہیں ہوتے مگر مطلق العنانیت ان دونوں میں سے کسی کو عطا نہیں کی گئی۔ سیاست اور خود بادشاہ خدائی قانون کے اسی طرح تابع رہے جیسے دین اور پیغمبر خدائی قانون کے تابع رہے۔ دونوں کے اختیارات کا سرچشمہ اور ضابطہ قانون ایک ہی ہے۔ صرف قانون کے اطلاق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کا تعلق مختلف افراد سے ہے۔ یہ زندگی کے دو پہلوؤں کو ایک دوسرے سے الگ الگ کرنے سے زیادہ ''جس کا کام اسی کو ساجھے'' کا مسئلہ ہے۔

مشاورتی بحث وتمحیص:

(283) مشاورت کی اہمیت اور افادیت پر جتنی بھی بات کی جائے کم ہے۔ قرآن مجید میں (21:47,38:42,32:27,159:3) مسلمانوں کو بار بار حکم دیا گیا ہے کہ فیصلہ کرنے سے پہلے مشاورت کرو چاہے سرکاری معاملہ ہو یا نجی۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول بھی اس قرآنی حکم کی تائید کرتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کی شکل میں ملنے والی رہنمائی کے باوجود کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قبل صحابہ کرامؓ اور حلیف قبائل کے نمائندوں سے مشاورت کرتے تھے اور خلفائے راشدین بھی مشاورتی اداروں کے پرجوش حامی تھے۔

(284) اس حوالے سے بھی قرآن کوئی حتمی یا فوری طریقہ تجویز نہیں کرتا۔ یعنی منتخب ادارے کے ارکان کی تعداد، دورانیہ اور طریق انتخاب وغیرہ کے معاملات ہر دور اور ملک کے قائدین کی صوابدید پر چھوڑ دیئے گئے جو چیز اہمیت کی حامل ہے وہ یہ ہے کہ حکمران کے معاونین نمائندہ شخصیات ہوں جنہیں ان لوگوں کا اعتماد حاصل ہو، جن کی وہ نمائندگی کرتے ہیں اور اعلیٰ کردار کے مالک ہوں۔

(285) قرآن نے یک گونہ متناسب نمائندگی کی بات بھی کی ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اپنی قوم میں سے 70 افراد کو منتخب کر کے (کوہِ طور پر) خدا کے حضور لے جانے کا ذکر کیا۔ (155:7) اس کے علاوہ بنی اسرائیل کے (12) قبیلوں کے لیے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ صحرائے سینا میں مقیم تھے (12) چشمے مخصوص کرنے کے واقعہ سے بھی متناسب نمائندگی کا تاثر جھلکتا ہے (قرآن 166:7) بہرحال اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ نمائندگی کا مقصد یہ ہے کہ نمائندہ کا چناؤ بذریعہ انتخاب ہو یا نامزدگی مگر حکومت کو رائے عامہ کے ساتھ رابطے میں رہنا چاہیے اور اسلام میں اس مقصد کو باجماعت نماز کے ذریعے بطریق احسن پورا کیا گیا ہے۔

کیونکہ دن میں پانچ بار مسلمان اپنے علاقے کی مسجد میں نماز باجماعت کے لیے جمع ہوتے ہیں جبکہ جمعہ کے روز تمام مرد اور عورتیں مسجد جاتی ہیں اور اسلامی دستور کے مطابق علاقے کا ناظم اعلیٰ (اعلیٰ ترین سرکاری افسر) نماز کی امامت کرواتا ہے اور اہل علاقہ کو موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنے مسائل اور شکایات براہ راست حکومت کے مقامی نمائندے کے نوٹس میں لاسکتے ہیں اور اگر اس سطح پر اس کی شنوائی نہ ہو تو وہ اس سے بڑے حاکم کے پاس جاسکتا ہے۔ جس تک رسائی اسے اسی انداز میں نماز باجماعت کے موقع پر مل جائے گی کیونکہ وہ بڑا حاکم بھی کسی نہ کسی مسجد میں نماز کی امامت ضرور کرائے گا حتیٰ کہ اسی انداز میں سائل سربراہ حکومت تک بھی پہنچ سکتا ہے۔

خارجہ پالیسی:

(286) بیرونی ممالک سے تعلقات بین الاقوامی قوانین کے تحت استوار کیے جاتے ہیں اس سطح پر ضوابط کار قدرے مختلف ہوتے ہیں اور تعلقات میں پیش رفت دوستوں کے گروپ کے باہم روابط کی نسبت آہستہ روی سے ہوتی ہے۔ قبل از اسلام کے دور میں بین الاقوامی قانون کوئی علیحدہ وجود نہیں رکھتا تھا بلکہ یہ عمومی سیاست کا ایک حصہ ہی ہوتا تھا جس کا انحصار سربراہ ریاست کی مرضی اور خواہش پر تھا۔ بیرونی دوستوں کے حقوق کی کوئی مسلمہ صورت نہیں تھی اور دشمنوں کے لیے تو دائرہ اور بھی تنگ تھا۔

(287) یہ بات تاریخی حقائق سے ثابت ہے کہ یہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے دنیا کی تاریخ میں پہلی بار بین الاقوامی قانون کو ایک الگ صنف قانون کے طور پر وضع کیا بلکہ اسے (سیاست کی بجائے) قانون کا حصہ بنایا۔ انہوں نے "سِیَر" (حکمران کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے) کے عنوان سے اس موضوع پر خصوصی مضمون مرتب کیے اور انہوں نے قانون کی عمومی دستاویزات میں بھی اس کا تذکرہ کیا۔

جن لوگوں نے ان معاملات کے جائزے کا آغاز کیا (دوسری صدی ہجری / 8 ویں صدی عیسوی) انہوں نے جنگ کے معاملے کو تعزیری قانون کا حصہ بنایا۔ اس طرح مقامی لوگوں کی طرف سے قزاقی اور رہزنی کی وارداتوں کو زیر بحث لاتے ہوئے فقہاء نے غیر ملکیوں کی طرف سے ایسی کارروائیوں کا بھی تذکرہ کیا گو ان میں بڑی تعداد میں باقاعدہ فوجیں حصہ لیتی تھیں مگر جنگ کو تعزیری قوانین کے باب میں شامل کرنے کا واضح مطلب یہی ہے کہ اس معاملے

سے قانونی طور پر نمٹا جائے گا جس میں ملزم کو عدالتی ٹربیونل کے سامنے اپنا دفاع کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

(288) فقہاء کے الفاظ میں اسلام کے اندر بین الاقوامی تعلقات کے نظام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ''جہاں تک اس دنیا کے مسائل کا تعلق ہے مسلمان اور غیر مسلم برابر (سواء) ہیں۔''

دور قدیم میں یونانیوں کا تصور یہ تھا کہ ایک بین الاقوامی قانون ہے جو صرف یونانی شہری ریاستوں کے مابین تعلقات کو استوار کرتا ہے اور جہاں تک بربروں یعنی غیر یونانی لوگوں کا تعلق ہے، ارسطو کے الفاظ میں قدرت نے ان کے مقدر میں یونانیوں کا غلام بننا لکھ دیا تھا۔ اس طرح یہ ایک خود ساختہ طرز عمل تھا کوئی باضابطہ قانون نہیں۔ قدیم ہندوؤں کے ہاں بھی اسی قسم کا تصور تھا اور ان کی ذات پات کی تقسیم کے نظریہ میں شودروں کا درجہ سب سے چھوٹا تھا اور اس حوالے سے شکست خوردہ قوم کی حالت تو بہت ہی غیر یقینی اور قابل رحم تھی۔ رومن بیرونی دوستوں کے حوالے سے محض چند حقوق کو تسلیم کرتے تھے مگر باقی دنیا کے لیے مرضی کا قانون تھا جو ہر دور میں مختلف اور کمانڈروں کی صوابدید پر تھا۔ یہودی قانون یہ قرار دیتا تھا (نمبرز 31:8-9، 17-8 خمسہ موسیٰ Deauteronomy 16:20، I سموئیل 3:15) کہ خدا نے عمالقہ (فلسطینی عرب) کا خاتمہ فرض کر دیا ہے البتہ ان کے علاوہ باقی دنیا کو یہودیوں کے باجگزار اور غلام بن کر رہنے کی اجازت ہوگی۔ 1856ء تک اہل مغرب انٹرنیشنل لاء کا اطلاق صرف مسیحیوں تک محدود اور مخصوص قرار دیتے تھے اور اس وقت سے انہوں نے مہذب اور غیر مہذب اقوام کا امتیاز پیدا کر دیا جس میں مؤخر الذکر کو کوئی حقوق حاصل نہیں۔ بین الاقوامی قانون کی تاریخ میں مسلمان وہ پہلی اور اب تک واحد قوم ہیں جنہوں نے جنگ اور امن دونوں میں غیر ملکیوں کے حق کو تسلیم کیا۔

(289) پہلی مسلمان ریاست کے بانی اور حاکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ یہ مدینہ کی ریاست تھی۔ یہ خود مختار دیہات پر مشتمل ایک وفاقیہ تھی جس میں مسلمان، یہودی، مشرک عرب اور شاید تھوڑے بہت مسیحی بھی آباد تھے۔ اس ریاست کی ہیئت مذہبی برداشت کی متقاضی تھی جس کا باضابطہ اہتمام ''میثاق مدینہ'' میں کیا گیا تھا۔ یہ دستاویز اب تک محفوظ ہے۔ دفاعی اتحاد کے پہلے معاہدے غیر مسلموں کے ساتھ کیے گئے اور ان کی انتہائی ذمہ داری سے پابندی کی گئی۔ قرآن مجید میں انتہائی نیک نیتی کے ساتھ وعدوں اور عہد کی سختی سے پابندی کا حکم دیا گیا ہے (اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں آخرت میں سزا کی وعید بھی دی گئی ہے)۔

(290) بین الاقوامی ضوابط کار سے متعلق معلومات کا ذریعہ اندرونی قانون سازی کے علاوہ وہ معاہدے بھی تھے جو غیر ملکیوں سے کیے گئے۔

(291) فقہا نے عہد کی پابندی پر اس قدر اصرار کیا ہے اور یہاں تک کہا ہے کہ اگر کوئی غیر ملکی اجازت لے کر کسی مقررہ مدت کے لیے اسلامی علاقے میں آچکا ہو اور اسی دوران اسلامی حکومت اور اس غیر ملکی حکومت میں جنگ چھڑ جائے تو اس غیر ملکی کی حفاظت کے تقاضے متاثر نہیں ہونے چاہئیں اور اس کے ویزا کی مدت ختم ہونے تک اس کے پرامن قیام کو یقینی بنانا میزبان ملک کی ذمہ داری ہے اور اسے نہ صرف بحفاظت وطن واپسی بلکہ اپنے ساتھ اپنا سامان اور منافع وغیرہ سب کچھ لے جانے کا بھی حق حاصل ہے۔ اس کے علاوہ دوران قیام اسے وہی عدالتی تحفظ بھی حاصل رہے گا جو جنگ چھڑنے سے قبل حاصل تھا۔

(292) غیر ملکی سفیر کو چاہے وہ کتنا ہی ناخوشگوار پیغام کیوں نہ لے کر آئے مکمل تحفظ حاصل ہوتا ہے اسے میزبان ملک میں اپنے عقیدے پر عمل کی مکمل آزادی اور بحفاظت قیام اور واپسی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے۔

(293) دائرہ اختیار یا حکومتی حدود کا مسئلہ بھی کچھ منفرد خصوصیات کا حامل ہے۔ اسلامی علاقے میں آباد غیر ملکی (غیر مسلم) مسلم حکومت کے دائرہ اختیار میں شمار ہوں گے لیکن ان پر مسلم قوانین کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ اسلام اپنی حکومت میں (اسلام سے) مختلف قوانین کی موجودگی قبول کرتا ہے جس میں ہر مذہب کے لوگوں کے لیے الگ خود مختار عدلیہ بھی شامل ہے۔ اس طرح ایک اجنبی (غیر مسلم) اس عدالت سے اپنا فیصلہ کرانے کا حق رکھتا ہے جو اس کے کہنے کے مطابق اس کے عقیدے سے متعلق ہوگی۔ اگر وہ مسیحی، یہودی یا کسی دوسرے عقیدے کا پیروکار ہو اور دوسرے فریق کا تعلق بھی اسی عقیدے سے ہو تو چاہے وہ دوسرا مسلم ریاست کا شہری ہو یا باہر کا ہو، مقدمے کا فیصلہ اس عقیدے کی عدالت اپنے قوانین کے تحت کرے گی۔ عام طور پر اس حوالے سے دیوانی اور فوجداری مقدمات میں کوئی امتیاز نہیں۔

اس صورت میں کہ مقدمے کے فریق مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہوں تو یہ مسئلہ اوپر زیر بحث آچکا ہے۔ تاہم اسلامی قوانین کے تحت (قرآن مجید 5:42-50) غیر مسلموں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے عقیدے کے تحت قائم عدالت سے فیصلہ کرنے کے استحقاق سے دستبردار ہو کر اپنا مقدمہ اسلامی عدالت میں لے جائیں بشرطیکہ دوسرا فریق بھی رضامند ہو۔ ایسی صورت

میں اسلامی قانون کا اطلاق ہوگا۔ مسلم جج کو یہ اجازت ہے کہ وہ مقدمے کے فریقوں کے پرسنل لاء یعنی ان کے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کر سکتا ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے۔ بخاریؒ کی روایت ہے کہ بدکاری کے مرتکب دو یہودیوں کو ان کے ہم مذہب فیصلے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے آئے اور آپ نے ان کی مذہبی کتاب تورات کے مطابق یہودی قانون کے تحت ان کا فیصلہ فرمایا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلم فقہاء نے قانون کے تقاضے کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ انہوں نے یہ قرار دیا ہے کہ اگر کسی مسلمان ریاست کے مسلمان شہری کے خلاف غیر ملک میں اس ملک کے شہری سے کوئی جرم سرزد ہو جائے اور بعد میں اگر وہ غیر ملکی (غیر مسلم) معمول کے حالات میں مسلمان ریاست میں آ جائے تو بھی اس پر اسلامی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا جا سکتا کیونکہ اسے اپنی حدود سے باہر سرزد ہونے والے جرم کے مقدمہ کی سماعت کا اختیار نہیں ہے۔ اس بارے میں مسلم فقہاء میں مکمل اتفاق ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد محمد الشیبانی نے اس قانون کی تائید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ بھی بیان کی ہے:

> ''عطیہ ابن قیس الکلبی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر کوئی شخص قتل، زنا یا چوری کا ارتکاب کر کے دشمن ملک میں پناہ حاصل کر لیتا ہے اور پھر پروانہ راہداری حاصل کر کے واپس آ جاتا ہے تو اس پر اس جرم کا مقدمہ چلے گا جس سے بچنے کے لیے وہ بھاگا تھا لیکن اگر اس نے ان تمام جرائم کا ارتکاب دشمن کی سرزمین پر کیا اور پھر پروانہ راہداری لے کر اپنے وطن واپس آتا ہے تو وہ مستوجب سزا نہیں گردانا جائے گا۔'' (سرخسی 21: شرح السیر الکبیر 108.4)

(294) اسلامی قوانین کے تحت سربراہ حکومت یا ریاست کو کسی قسم کا استثناء حاصل نہیں اور اس پر بھی مملکت کے تمام دوسرے شہریوں کی مانند قانون کا اطلاق ہوگا۔ اگر مسلمان ریاست کا سربراہ اس قسم کے استحقاق (ناانصافی، طبقاتی امتیاز وغیرہ) سے فیض یاب نہیں ہوگا تو غیر ملکی حکام اور سفیر بھی کسی قسم کے استثناء کی توقع نہیں رکھیں گے۔ مہمان کی حیثیت سے ان کے احترام اور وقار کے تمام تقاضے ملحوظ رکھے جائیں گے مگر انہیں قانون اور انصاف سے بالاتر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

(295) مثالی ادوار کے کئی واقعات اسلامی انصاف کی منفرد تصویر پیش کرتے ہیں۔ معاہدوں پر عملدرآمد کو یقینی بنانے کے لیے ایک دوسرے کے افراد کو بطور یرغمال رکھنا روایات کا حصہ رہا ہے، جس میں یہ واضح شرط ہوتی تھی کہ اگر ایک فریق نے دوسرے کے اپنے زیر قبضہ افراد میں سے کسی کو قتل کر دیا تو دوسرے فریق کو اپنے زیر تحویل یرغمالیوں سے انتقام لینے کا حق ہوگا۔ ایسی صورتحال امیر معاویہ اور المنصور کے دور میں پیش آئی اور مسلمان فقہاء نے متفقہ طور پر قرار دیا گیا کہ دشمن کے یرغمالیوں کو قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ دھوکہ دہی اور غداری کا ارتکاب ان کے حاکموں نے کیا تھا نہ کہ ان یرغمالیوں نے۔ قرآن نے بھی کسی کے جرم کی سزا دوسرے کو دینے کی ممانعت کی ہے۔ (38:55,64:16)

(296) اسلام کے جنگی قوانین بھی انسان دوستی پر مبنی ہیں۔ اس میں بچوں، عورتوں، بوڑھے، بیمار، مذہبی پیشواؤں کے قتل کی اجازت نہیں۔ انتہائی ناگزیر کم سے کم حد سے اوپر قتل (یا املاک وغیرہ کی) تباہی کی سختی سے ممانعت ہے۔ قیدیوں سے بہت اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور ان کی جنگی سرگرمیوں میں شرکت کو جرم تصور نہیں کیا جاتا۔ فاتح سپاہیوں میں مال غنیمت کا لالچ کم کرنے کے لیے ضروری قرار دیا گیا کہ جو بھی غنیمت حاصل ہو اسے پہلے حکومت کے حوالے کیا جائے جو پانچواں حصہ سرکاری خزانے میں جمع کر کے باقی سپاہی کو واپس کر دیتی ہے۔ سپاہی اور سپہ سالار کا حصہ برابر ہوتا ہے۔

(297) قرآن مجید نے امن کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس حوالے سے حکم دیا کہ تم از خود کمزوری دکھا کر صلح کی کوشش نہ کرو۔

> ''تو تم ہمت نہ ہارو اور (دشمنوں کو) صلح کی طرف نہ بلاؤ اور تم تو غالب ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے، وہ ہرگز تمہارے اعمال کو کم (اور گم) نہیں کرے گا۔'' (35:48)

تاہم ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے کہ اگر دشمن صلح پر آمادہ ہو تو پھر تم بھی نرمی کا مظاہرہ کرو:

> ''اور اگر یہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' (61:8)

اور اس طرز عمل کا مظاہرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر کیا جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان عام فرمادیا کہ ''جاؤ تم آزاد ہو۔''

(298) قرآن مجید عہد کی پاسداری کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ اس کے بدلے میں مسلمانوں کے مادی مفادات بھی قربان کرنے پر تیار ہے۔(72:8)

اور اس کا سبق یہ ہے کہ اگر مذہب کی بنیاد پر ظلم بھی ہو رہا ہو تو بھی عہد کو نبھاؤ۔

''......اور جو لوگ ایمان تو لے آئے لیکن ہجرت نہیں کی تو جب تک وہ ہجرت نہ کریں تو تم کو ان کی رفاقت سے کوئی سروکار نہیں اور اگر وہ تم سے دین (کے معاملات) میں مدد طلب کریں تو تم کو مدد کرنی لازم ہے مگر ان لوگوں کے مقابلہ میں کہ تم میں اور ان میں (صلح کا) عہد ہو (مدد نہیں کرنی چاہیے) اور اللہ تمہارے سب کاموں کو دیکھ رہا ہے۔''(72:8)

خلاصہ:

(299) خلاصہ یہ ہے کہ اسلام ایک عالمگیر امہ کے قیام کا خواہاں ہے جس میں تمام لوگوں میں نسل، طبقہ یا ملک کے امتیاز سے بالا مکمل مساوات ہو اور اس کا سبق ہے کہ لوگوں کو دل سے قائل کر کے اسلام کی طرف مائل کرو سختی اور جبر کے ساتھ نہیں۔ ہر فرد اپنے طور پر اللہ کے سامنے جوابدہ ہے۔ اسلام کے نزدیک حکومت ایک امانت ہے جو عوام کی خدمت کا ذریعہ ہے اور سرکاری حکام عوام کے خادم ہیں۔ اسلام کا حکم ہے کہ ہر فرد نیکی کو عام کرنے اور بدی کو روکنے کے لیے تمام تر کوششیں کرے کیونکہ خود ہمیں ہمارے اعمال اور ارادوں کے حوالے سے دیکھتا ہے۔

باب نمبر 9

اسلام کا عدالتی نظام

مسلمانوں کا خصوصی کردار:

انسانی معاشرے میں قانون کا وجود زمانہ قبل از تاریخ سے موجود ہے۔ ہر نسل، ہر خطے اور انسانوں کے ہر گروپ نے اس شعبے میں کسی نہ کسی حد تک کردار ضرور ادا کیا ہے جبکہ مسلمانوں کا کردار انتہائی قابل قدر اور بھرپور ہے۔

قانون کا باضابطہ علم:

(301) زمانہ قدیم کے لوگوں کے اپنے مخصوص قوانین ضابطے اور روایات بہرحال موجود تھیں تاہم قانون کے باضابطہ علم کے بارے میں جو مروجہ قوانین اور ضابطوں سے منفرد اور واضح تھا۔ شافعی[1] (204.150 ہجری / 820.767 عیسوی) سے قبل کوئی تصور نہیں تھا۔ امام شافعی نے اپنی عظیم تخلیق رسالہ میں اصول الفقہ کے عنوان سے قانون کو ایک باضابطہ علم کے طور پر متعارف کرایا۔ اور اسی سرچشمے سے انسانی کردار و عمل کے تمام ضابطے پھوٹے۔ اسلامی علوم میں اصول الفقہ کو بڑا مرتبہ حاصل ہے اور یہ مجموعہ حکمت بیک وقت فلسفہ قانون اور ضوابط کا سرچشمہ ہے جبکہ قانون سازی کے اصول اور قانون کے متن کی تشریح اور اطلاق کے حوالے سے تمام تر رہنمائی اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ مؤخر الذکر یعنی قوانین اور ضابطے اس درخت کی فروع (شاخیں) کہلاتے ہیں۔ بظاہر ان مصنفین کی عظیم تخلیقات قرآن مجید کی اس آیت کا فیضان نظر آتا ہے۔

---

1. ان کا انتقال 204 ہجری / 820 میں ہوا، ان کے کچھ پیشروؤں نے بھی مثلاً ابوحنیفہؒ (وفات 767) نے کتاب الرائے اور ان کے شاگردوں محمد الشیبانیؒ اور ابویوسفؒ دونوں نے کتاب اصول الفقہ مرتب کیں مگر آج ان دونوں کی یہ تخلیقات موجود نہیں کہ ان کے مندرجات کی بنیاد پر ان کا جائزہ لیا جاسکے۔

”کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے بات کی کیسی مثال بیان فرمائی ہے (وہ ایسی ہے) جیسے پاکیزہ درخت جس کی جڑ مضبوط (یعنی زمین کو پکڑے ہوئے) ہو اور شاخیں آسمان میں ”اپنے پروردگار کے حکم سے ہر درخت پھل لاتا (اور میوے دیتا) ہو.....“ (14:24-25)

عمل میں ارادہ اور نیت کی اہمیت:

(302) قانون کے بنیادی اصولوں میں کسی بھی کام کے مقصد اور نیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس اصول کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس معروف حدیث پر ہے کہ ” اِنَّما الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات“ (اعمال (کو پرکھنے) کا دارومدار نیتوں پر ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کے بعد مسلمان قاضیوں نے کبھی بھی عمداً اور غیر ارادی طور پر سرزد ہونے والے جرائم کو ایک سطح پر رکھ کر فیصلے نہیں دیئے۔

ریاست کا تحریری آئین:

(303) یہ حقیقت بڑی دلچسپ اور خدائی حکمت کی حامل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جو سب سے پہلی وحی نازل ہوئی (القرآن 96:1-5) اس میں حصول علم کے لیے قلم کی اہمیت کو اُجاگر کیا گیا حالانکہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی تعلیمی ادارے سے باضابطہ علم حاصل نہیں کیا تھا۔ اور یہ بات حیران کن نہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی قوم کے لیے ایک ریاست کا ڈھانچہ کھڑا کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ریاست کا ایک تحریری آئین نافذ کیا۔ ابتداء میں یہ ریاست شہر مدینہ پر مشتمل ایک چھوٹی سی مملکت تھی مگر صرف دس سال بعد جب اس کے بانی اس دنیائے فانی سے رخصت ہو رہے تھے تو اس ریاست کی حدود سارے جزیرہ نما عرب کے علاوہ عراق اور فلسطین تک پھیل چکی تھیں[1]۔

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن فرماں رواؤں کو اسلام کی دعوت کے پیغامات بھیجے ان میں عراق کا علاقہ ساوہ بھی شامل تھا۔ جہاں تک فلسطین کا تعلق ہے، تبوک کی مہم میں ایلہ، جربہ اور اذروح کے علاقے بھی اسلامی سلطنت میں شامل ہو گئے تھے۔

جیسا کہ اگلے 15 برس کے دوران حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں مسلم فوجیں ایک طرف اندلس (سپین) پر یلغار کر رہی تھیں تو دوسری طرف چینی ترکستان ان کے حملوں کی زد میں تھا۔ جب کہ ان کے درمیان کے علاقوں پر وہ پہلے ہی قبضہ کر چکے تھے[1]۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تیار کردہ تحریری آئین مکمل طور پر محفوظ حالت میں موجود ہے (ابن ہشام کے حوالے سے) جس میں بہت سے معاملات زیرِ بحث لائے گئے ہیں مثلاً حکمران اور شہریوں کے حقوق، قانون سازی، فراہمی انصاف، نظام دفاع، غیر مسلم شہریوں سے سلوک، اس وقت کے تقاضوں کے مطابق سماجی تحفظ وغیرہ۔ اس آئین کے آغاز کی تاریخ 622ء ہے جو سال اول ہجری ہے۔

عالمگیر بین الاقوامی قانون:

(304) جنگ جو بدقسمتی سے انسانی معاشرے کا کم و بیش حصہ ہی بن گئی ہے، ایک ایسا وقت ہوتا ہے جب انسان کو معقولیت پسندی سے کوئی غرض ہوتی ہے اور نہ ہی اپنی یا دشمن کی پرواہ ہوتی ہے کیونکہ یہ زندگی یا موت کا معاملہ ہوتا ہے اور ہر ایک کی جان پر بنی ہوتی ہے کہ ایک چھوٹی سی غلطی یا کوتاہی انتہائی خطرناک نتائج کا موجب بھی بن سکتی ہے۔ اور بادشاہ یا سربراہ مملکت کا ہی حق سمجھا جاتا ہے کہ وہ جو چاہیں دشمن کے حوالے سے فیصلہ کریں۔ مطلق العنان حکمرانوں کی طرف سے اس حوالے سے سلوک اور رویہ کی مثالیں قدیم زمانے سے موجود ہیں مگر اس کا انحصار مکمل طور پر حکمرانوں کی مرضی پر تھا۔ مگر مسلمانوں نے پہلی بار اسے "بادشاہوں اور حکمرانوں نے جو منہ سے بول دیا وہی قانون ہے" کے دائرے سے نکل کر باقاعدہ قانون کی شکل دی، اس کے علاوہ انہوں نے اس بین الاقوامی قانون پر تفصیلی مواد آنے والوں کے لیے چھوڑا اور اسے ایک علیحدہ علم کے طور پر ترقی دی۔ اس حوالے سے جو معاہدے ہوئے ان کے راویوں میں ابوحنیفہ، مالک، الاوزاعی، ابو یوسف، محمد الشیبانی، زُفر، الواقدی رحمہ اللہ علیہم جیسے معتبر نام موجود ہیں۔ ان سب نے اس موضوع کو "سیئر" (طرزِ عمل، بادشاہوں کا) نام دیا ہے۔

1۔ 28 ہجری میں سپین کے بعض علاقوں کی فتح کے لیے حوالہ ملاحظہ ہو۔ طبری، بلاذری وغیرہ اور اسی سال چینی ترکستان کے علاقے Transoxiana کی فتح کے لیے ملاحظہ ہو بلاذری، چینی مؤرخوں نے بھی اس حقیقت کی تصدیق کی ہے۔

عمومی قوانین میں قدیم ترین تفصیلی مواد زید بن علیؒ کا مرتب کردہ ہے جن کا انتقال 120 یا 122 ہجری میں ہوا۔ جب کہ ان کے بعد کئی اور نام بھی آتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ شاہراہ پر ڈکیتی کے معاملے کے زیرِ بحث آنے کے ساتھ ہی ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا رہزنوں کے خلاف پولیس کی کارروائی کی بنیاد پر جنگ کا جواز بھی بنایا جاسکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ اسلامی عدالت میں متحارب فریقوں کے حقوق اور ذمہ داریاں دونوں کو تسلیم کیا جاتا ہے۔

اسلامی قوانین کی عمومی خصوصیات:

(305) اسلامی قوانین کا مطالعہ کرتے ہوئے جو پہلا خیال ذہن کے پردے سے ٹکراتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ قوانین انسانی زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہیں چاہے اس کا تعلق مادی یعنی دنیاوی معاملات سے ہو یا روحانی یعنی دین کے معاملات، اسلام، انسانی زندگی کے ہر پہلو کو ایک نظم میں لانا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے اس کے قوانین موجود ہیں۔ اسلامی قوانین کے مسودوں یا مجموعوں میں آغاز عام طور پر عقیدے یعنی مذہب کی عبادات اور رسوم سے ہوتا ہے اور اسی باب میں حکمران یا اقتدار اعلیٰ کے آئینی معاملات بھی زیرِ بحث آتے ہیں کیونکہ ''امام'' یعنی سربراہ مملکت بلحاظ عہدہ مسجد میں نمازوں کی امامت کا ذمہ دار بھی ہوتا ہے۔ (کتاب الام، باب صلوٰۃ از شافعیؒ)

اس لیے کتاب کے اس حصے میں زکوٰۃ کو بھی موضوع بحث بنانے پر حیرت نہیں ہونی چاہیے کیونکہ قرآن مجید میں اکثر نماز کے ساتھ ہی زکوٰۃ کی ادائیگی کی تاکید نظر آتی ہے کہ نماز بدنی عبادت ہے تو زکوٰۃ کو مالی عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے بعد مسودہ قانون میں ہر طرح کے معاہداتی تعلقات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے اور اس کے بعد جرائم اور سزاؤں کا باب ہے جس میں غیر ممالک کے ساتھ جنگ اور امن کے قوانین، یعنی بین الاقوامی قانون اور سفارت وغیرہ اور آخر میں وراثت اور وصیت کے معاملات کا تذکرہ ہے۔ انسان کے اجزائے ترکیبی میں بدن اور روح دونوں عناصر شامل ہیں۔ اگر حکومت اپنے بے پایاں وسائل کے ساتھ تمام توجہ مادی معاملات پر ہی مرکوز کردے تو روح بھوکی رہ جائے گی اور اپنے ذاتی وسائل پر قناعت پر مجبور ہوگی جو دنیاوی معاملات کے لیے دستیاب وسائل سے بہت کم ہوں گے۔ اس طرح روح اور بدن کی غیر مساوی نشو ونما انسان میں عدم توازن کو جنم دے گی جو بالآخر تہذیب کے لیے تباہ کن ثابت ہوگا۔ اس سارے معاملے یعنی روح اور بدن دونوں کے علاج کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی مبتدی مذہب کے

معاملات میں مہم جوئی کرے جیسے کہ ایک شاعر کو کسی مریض کا آپریشن کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ انسانی میدان عمل کی ہر سرگرمی کو اس کے ماہر کے ذریعے ہی چلایا جانا چاہیے۔

(306) اسلامی قانون کی ایک اور اہم خصوصیت حقوق اور ذمہ داریوں کو باہم لازم وملزوم کرنے پر زور دینا ہے۔ نہ صرف انسانوں کے باہمی تعلقات بلکہ بندے کے اپنے خالق کے ساتھ تعلقات میں بھی یہی اصول کارفرما ہے اور مذہب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی دنیاوی نعمتوں سے استفادہ کے بدلے میں اپنے اوپر عائد ہونے والی ذمہ داریوں کو بجالائے۔ جبکہ ذمہ داریوں، فرائض سے آزاد ہو کر صرف حقوق کی ہی بات کی جائے تو ایسے انسان اور وحشی درندے میں کوئی فرق نہیں، وہ بھیڑیا ہے یا شیطان۔

قانون کا فلسفہ:

(307) روایت پسند فقہا قوانین کی اچھائی یا برائی کی بنیاد پر درجہ بندی کرتے ہیں۔ مسلمان کو وہ کام کرنا چاہیے جو اچھا ہے اور اس کام سے بچنا چاہیے جو برا ہے۔ اچھائی یا برائی کبھی بالکل حتمی، واضح اور ظاہر ہوتی ہے اور بعض اوقات یہ دونوں خصوصیات کسی نسبت سے ہوتی ہیں۔ یہ صورتحال تمام عدالتی قوانین کی پانچ حصوں میں تقسیم پر منتج ہوتی ہے جس میں تمام اوامر اور نواہی شامل ہیں۔ اس طرح جو حتمی طور پر اچھائی ہے وہ یقیناً فرض ہوگا اور اس کی ادائیگی لازمی ہوگی۔ ہر وہ چیز جس میں اچھائی کا عنصر غالب ہو اس کی تاکید کی جاتی ہے اور اسے قابل تحسین اور مستوجب جزا تصور کیا جاتا ہے جبکہ ایسی چیزیں جن میں اچھائی اور برائی کے پہلو برابر ہوں یا دونوں خصوصیات نہ ہوں۔ انہیں انسانوں کی مرضی پر چھوڑ دیا جائے گا کہ وہ ان کا ارتکاب کریں یا باز رہیں۔ جو چیزیں مکمل طور پر بری ہیں ان کی قطعی طور پر ممانعت ہوگی اور جن میں برائی کا عنصر غالب ہوگا ان کا کرنا بھی قابل ملامت ہوگا اور اس کی حوصلہ شکنی کی جائے گی۔

افعال یا قواعد کی پانچ درجوں میں بنیادی تقسیم مزید ذیلی درجوں میں بھی تقسیم ممکن ہے۔

(308) اچھائی اور برائی کی شناخت اور تعریف کیسے ہو؟ قرآن مجید میں جو خدائی کلام پر مشتمل مسلمانوں کی متبرک کتاب ہے اس کا ذکر کئی مقامات پر ہوتا ہے اور اس کا حکم ہے کہ جو "معروف" ہے وہ کرو اور جو "منکر" ہے اس سے احتراز کرو، یعنی معروف کا مطلب اچھائی اور اچھائی ایک ایسی صفت ہے جس کو ہر کوئی جانتا ہے کہ یہ اچھائی ہے اس لیے اس کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور منکر

کا مطلب ایسی چیز جسے ہر کوئی برا کہے۔ برائی بھی ایسی چیز ہے جسے ہر کوئی پہچانتا ہے اور عقل سلیم کے مطابق جو چیز برائی ہے اس کے کرنے سے منع کیا جاتا ہے۔

اسلامی اخلاقیات کا ایک بڑا حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے اور ایسا شائد ہی ہوتا ہے کہ قرآن نے اگر کسی چیز کو برا کہہ کر اس کی ممانعت کی ہے تو رائے عامہ اس سے اختلاف کرے۔ مثلاً نشہ آور مشروبات یا جوا کی ممانعت کا معاملہ ہی دیکھ لیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس ممانعت کی حکمت بھی صاحب فہم لوگوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ درحقیقت یہ عظیم ترین قانون ساز کی حکمت اور دانائی پر اعتماد کا معاملہ ہے جس کے دوسرے تمام معاملات کے بارے میں احکام و فرامین کی افادیت اور حکمت عالمگیر سطح پر مسلمہ ہے۔

پابندیاں (نواہی):

(309) انسانوں میں مختلف مزاج اور طبیعتوں کے لوگ پائے جاتے ہیں اور ان کو تین بڑے درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: (1) جو (فطرتاً) اچھے ہیں اور برائی کی کوئی ترغیب انہیں ذرا سا بھی متزلزل نہیں کرسکتی۔ (2) وہ لوگ جو ردعمل کے خوف سے درست راستے پر چلتے رہتے ہیں مگر ترغیب کے سامنے ہتھیار بھی ڈال دیتے ہیں اور اگر پکڑے جانے کا ڈر نہ ہو تو برائی کا ارتکاب بھی کر گزرتے ہیں۔

بدقسمتی سے پہلے درجے میں آنے والے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے انہیں نہ تو کسی رہنما کی ضرورت ہے اور نہ قانون کی کسی خلاف ورزی سے روکنے کیلئے کسی قسم کی پابندی کی جبکہ دوسرے اور تیسرے درجے میں آنے والوں کو معاشرے کے مفاد میں روکنے کی ضرورت ہے۔ دوسروں کو اذیت یا نقصان پہنچانے کی عادت، بیماری ہوسکتی ہے یا حیوانی جبلت، بری تعلیم و تربیت کا نتیجہ یا پھر اس کی وجہ کوئی اور بھی ہوسکتی ہے۔ دوسرے درجہ میں آنے والے لوگوں کو قابو میں رکھنے اور ان سے دوسروں کو پہنچنے والے ممکنہ نقصان کو روکنے کے لیے کوششیں کی جاتی ہیں۔ خوش قسمتی سے ایسے افراد کی تعداد بھی بہت زیادہ نہیں ہے۔ اب رہ جاتے ہیں تیسرے درجے میں آنے والے لوگ جو دو طبقوں کے درمیان میں آتے ہیں اور انسانوں کی اکثریت کا تعلق اسی طبقے سے ہے۔ ان افراد کو سخت پابندیوں اور رکاوٹوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر کس قسم کی پابندیاں؟

(310) یہ حقیقت تو مسلمہ ہے کہ اگر کسی قوم یا قبیلے کا سردار ہی برے کردار کا حامل ہو تو وہ کسی دوسرے کو برے کام سے کیسے منع کر سکتا ہے اس لیے اسلام نے برائی کی جڑ پر ضرب لگائی اور سرچشمہ پر بند باندھا ہے اور یہ قرار دیا ہے کہ فرائض سے استثنیٰ کسی کو حاصل نہیں چاہے وہ بادشاہ ہے یا پیغمبر۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو روایات اپنے بعد آنے والوں کے لیے چھوڑیں اور جن پر انہوں نے عمل کیا، ان کے مطابق سربراہ ریاست کو عدالتوں میں طلب کیا جا سکتا ہے اور انہیں ذرا سی بھی پس و پیش کے بغیر عدالتوں میں پیش ہونا چاہیے۔ تاریخ کی گواہی موجود ہے کہ اسلامی ادوار میں اگر بادشاہ بھی ناانصافی کے مرتکب ہوئے تو قاضیوں نے ان کے خلاف بھی فیصلے سنائے۔

(311) اسلام اور تمام دوسری تہذیبوں میں موجود مادی پابندیوں کی پوری تفصیل دینے کی ضرورت نہیں۔ یعنی معاشرے میں امن و امان کا قیام۔ دن اور رات چوکی کا نظام، شہریوں کے مابین پر امن بقائے باہمی کے تعلقات کو یقینی بنانا وغیرہ اور اگر کوئی شہری کسی دوسرے کی زیادتی کا نشانہ بنتا ہے تو اسے حق ہے کہ وہ اس کی شکایت عدالت سے کرے اور پولیس ملزم کو پکڑ کر عدالت کے روبرو پیش کرے جس کے فیصلے پر عملدرآمد کر کے مظلوم کی حق رسی کی جائے۔

(312) پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو دین لے کر آئے اس نے ایک ایسا نظریہ متعارف کرایا جو برائی کے راستے کی تمام پابندیوں سے زیادہ مؤثر ہے۔ انصاف کی فراہمی کا پورا نظام قائم کرنے کے علاوہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کے ذہنوں میں "حیات بعد الموت"، یعنی آخرت میں خدائی انصاف، نجات یا پھر سزا کا جو تصور راسخ کیا ہے اس کے پیش نظر مومن یعنی سچا مسلمان اس وقت بھی اپنے فرائض بجا لاتا ہے جب اسے ان کی خلاف ورزی کے مواقع بھی حاصل ہوں اور سزا کا خوف بھی نہ ہو اور وہ دوسرے کو اذیت یا نقصان پہنچانے سے باز رہتا ہے چاہے ترغیب بھی ہوں اور کسی جوابی کارروائی کا بھی خطرہ موجود نہ ہو۔

(313) پابندیوں کا یہ تہرا نظام یعنی حکمرانوں پر بھی عام شہریوں کی طرح قانون کا اطلاق۔ مادی یا قانونی پابندیاں اور روحانی پابندی یعنی آخرت میں جوابدہی کا خوف اور جب کہ یہ تینوں عناصر ایک دوسرے کو مستحکم بھی کر رہے ہوں، اسلام میں قانون کی زیادہ سے زیادہ پابندی اور سب کے حقوق اور فرائض کا احساس اجاگر کرنے کا اہتمام ہے۔ یہ کسی بھی ایسے نظام سے زیادہ مؤثر ہے جس میں صرف پابندیوں اور سزاؤں سے نتائج حاصل کیے جاتے ہیں۔

قانون سازی:

(314) اس حقیقت کے اثرات اور ہمہ گیریت کی بہتر تفہیم کے لیے کہ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا قانون ساز ہے ہمیں اس معاملے کے مختلف پہلوؤں کو زیرِ غور لانا ہوگا۔

(315) اسلام ایک خدا یعنی توحید پر ایمان کا نام ہے جو نہ صرف کائنات کا خالق ہے بلکہ رب اور رزاق بھی ہے اور اس کائنات کا وجود اللہ تعالیٰ کی مرضی کا مرہونِ منت ہے اور جو کچھ اس نے تخلیق فرمایا ہے اس کی تخلیق کے بعد اسے طاقِ نسیاں کی زینت نہیں بنا دیا۔ اسلامی عقیدہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کی تجسیم یا تصور انسانی فکر کی بلندیوں سے ماورا ہے۔ وہ ہر جگہ موجود، ہر ضرورت سے بے نیاز، منصف اور مہربان ہے۔ اور یہ اس رحم و کرم کی انتہا ہے کہ اس نے انسان کو نہ صرف عقلِ سلیم عطا کی بلکہ ان کی ہدایت کے لیے نسلِ انسانی میں سے ہی کچھ افراد کو منتخب کر کے اپنے پیغام کے ساتھ مبعوث فرمایا۔ جنہوں نے اللہ کے بندوں کی انسانی معاشرے کے لیے سود مند راہوں کی جانب رہنمائی کی۔ اللہ تعالیٰ کی ذات چونکہ مادی خصوصیات سے ماورا ہے اس لیے اس نے اپنے رسولوں تک اپنا پیغام پہنچانے کے لیے فرشتوں کی شکل میں اپنے پیغام رساں متعین فرمائے۔

(316) اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات کامل اور ابدی ہے جبکہ اس کے برعکس انسانوں میں مستقل ارتقاء اور تبدیلی کا عمل جاری ہے اللہ تعالیٰ اپنے احکام اور آرا تبدیل نہیں کرتا مگر بندوں کی طرف سے اس پر جو عمل ہوتا ہے وہ وہی ہوتا ہے جو ان کی تفہیم کے مطابق درست ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام و فرامین کی تشریح و توضیح میں کبھی کبھی اس کے بندوں میں اختلاف ہوتا ہے اور ہر ایک کا دعویٰ یہی ہوتا ہے کہ اس کی تشریح عین وحی کے مطابق ہے۔ قانون سازی کے قاعدے کے مطابق نیا قانون پہلے قوانین کو منسوخ کر کے ان کی جگہ لے لیتا ہے اور اسی کلیہ کے تحت جب اللہ کی طرف سے نیا دین آتا ہے تو پہلے ادیان منسوخ قرار پا جاتے ہیں۔

(317) مسلمانوں کے لیے قرآن مجید جو عربی زبان میں ہے اللہ تعالیٰ کے پیغام پر مشتمل کتاب ہے جو پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کے ذریعے نازل ہوئی اور جس پر عمل کرنا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں پر لازمی ٹھہرا۔ اس کے علاوہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحیثیت رسول اور شارح، قرآن مجید کے متن کی تشریح اور اس حوالے سے مزید رہنمائی فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان فرامین اور حیات طیبہ کے معمولات کو احادیث کی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔

(318) یہ ایک طے شدہ اور مسلمہ حقیقت ہے کہ جو اتھارٹی یا ہیئت مقتدرہ کوئی قانون نافذ کرتی ہے تو اس کی تنسیخ کا اختیار خود اسے یا اس سے برتر کسی اتھارٹی کو ہی حاصل ہوتا ہے اس سے کم تر درجے کا کوئی شخص یا ادارہ اسے منسوخ کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ اسی اصول کے تحت کسی رسول کے احکام کو وہ خود یا پھر اللہ تعالیٰ ہی تبدیل کرسکتا ہے مگر پیغمبر کے کسی ساتھی یا پیروکار کو ان میں تبدیلی کا اختیار نہیں۔ البتہ اسلام نے اس حوالے سے خاصی لچک کا مظاہرہ کیا ہے۔ تاکہ لوگ حالات اور وقت کے تقاضوں کے ساتھ چل سکیں۔

(i) تمام اسلامی قوانین جن میں اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے احکام اور فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل ہیں عمل کے لیے یکساں سختی یا تاکید نہیں رکھتے۔ ان میں جو فرائض ہیں ان کی تعداد زیادہ نہیں جبکہ کچھ کے بارے میں محض نصیحت کی گئی اور باقی معاملات میں بڑی چھوٹ دی گئی ہے۔ اسلامی احکام کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے درجے یعنی فرائض کی تعداد محض چند ہے اور جن کی نصیحت کی گئی ان کی تعداد قدرے زیادہ البتہ وہ معاملات جن پر قرآن خاموش ہے ان کی تعداد ان گنت ہے۔

(ii) (اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے) کم تر درجے کی اتھارٹی (علماء، سکالر) قانون کو تبدیل نہیں کرسکتے البتہ اس کی تشریح کرسکتے ہیں۔ تشریح پر اسلام میں کسی ایک کی اجارہ داری نہیں، ہر شخص جس نے اسلام کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے ایسا کرسکتا ہے۔ کوئی بیمار شخص اپنے علاج کے لیے کبھی کسی شاعر کے پاس نہیں جاتا نہ ہی کوئی بڑا ادیب چاہے اس کو نوبل پرائز ہی کیوں نہ مل چکا ہو مکان تعمیر کرسکتا ہے، بیمار کا علاج ڈاکٹر، اور مکان کی تعمیر انجینئر کرے گا۔ اسی طرح قانونی معاملات نمٹانے کے لیے قانون کا مطالعہ کرنے اور اس موضوع پر ایک علمی مقام حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ کسی بھی شعبے کے بارے میں اس کے ماہر کے سوا کسی اور کی رائے کی کوئی وقعت اور حیثیت نہیں۔

خدائی احکام کی اس انداز میں تشریح کہ ان کے ساتھ دور حاضر کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے چلا جا سکے (اجتہاد) دینی علوم کے ماہر ہی کر سکتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ہر فانی انسان کی مانند اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں اور اب ہمارے درمیان موجود نہیں کہ خدائی احکام کی تشریح وتوضیح کے حوالے سے پیدا ہونے والے کسی اختلاف پر فیصلہ کے لیے اللہ سے براہ راست رہنمائی لے سکیں۔ اور کسی بھی معاملے پر اختلاف رائے تو عین ممکن ہے کیونکہ سب ہی انسان ایک ہی انداز سے نہیں سوچ سکتے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ جج یا قاضی، وکلاء، فقہا اور دوسرے ماہرین قانون آخرکار انسان ہیں ان میں اختلاف رائے ہو سکتا ہے۔ ایسی صورت میں لوگ اس کا نقطہ نظر تسلیم کرتے ہیں جو ان میں زیادہ صاحب علم ہو۔ عدالتی کارروائی کے دوران جج (یا قاضی) کا فیصلہ مانا جاتا ہے جبکہ دوسرے معاملات میں جو جس مسلک سے وابستہ ہو اس کو ترجیح دیتا ہے۔

(iii) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اصول بیان فرمایا تھا:

"میری امت کبھی غلط بات پر متفق نہیں ہوگی" (روایت ابن حنبل، ترمذی، ابن ماجہ اور دوسرے) اس منفی اجماع امت سے اس بات کا قوی احتمال بہرحال ہے کہ اسلامی قانون کو نئے قالب میں ڈھال کر اسے بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کر لیا جائے۔ تجسس اور تحقیق کا دروازہ تو کبھی بند نہیں ہو سکتا۔ مگر اس حدیث سے جو تاثر مستحکم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی رائے کو جو متفقہ طور پر مسترد نہ کر دیا جائے اسے ترک نہیں کیا جا سکتا۔

(iv) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کا ایک مشہور واقعہ قابل ذکر ہے جس کی روایت کئی ذرائع سے ہوئی ہے: معاذؓ بن جبل کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کا حاکم عدالت مقرر کیا۔ وہ منصب سنبھالنے کے لیے روانگی سے قبل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس موقع پر دونوں کے مابین یہ گفتگو ہوئی۔

☆ مقدمات کا فیصلہ کس بنیاد پر کرو گے؟"

"قرآن مجید کے مطابق۔"

☆ اور اگر اس معاملے کا قرآن میں ذکر نہ ہوا تو کس طرف رجوع کرو گے؟"

"پھر میں اللہ کے پیغمبر کی سیرت طیبہ کا حوالہ تلاش کروں گا۔"

☆ اور اگر وہاں سے بھی مطلوبہ حوالہ میسر نہ آیا تو؟

"پھر میں اپنی عقل استعمال کروں گا۔" (اجتہاد کروں گا)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس جواب سے اس قدر خوش ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بے حد تحسین فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"شکر ہے اس خدا کا جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو وہ طریقہ اختیار کرنے کی توفیق بخشی جو اس کے رسول کو پسند ہے۔"

(مسند احمد، ابوداود، ترمذی، ابن ماجہ)

ایک راست باز اور صاحب بصیرت شخص کی طرف سے اظہار رائے اور فہم وفراست کے مظاہرے کی انفرادی کوشش سے نہ صرف اجتہاد کا دروازہ کھلا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بھرپور پذیرائی بھی عطا ہوئی۔

(v) یہ بات قابل ذکر ہے کہ کسی نئے مسئلے پر قرآن مجید کی تعلیمات کی روشنی میں قانون سازی یا اجتہاد کے نتیجے میں بننے والے کسی بھی قانون کو چاہے اس پر اس دور کے علماء اور فقہاء کا اجماع ہی کیوں نہ ہو، کسی دوسرے دور کے علماء اور فقہاء ایک اور اجتہاد کے ذریعے تبدیل بھی کر سکتے ہیں۔ یعنی کسی ایک اتھارٹی کی رائے کو اس سے بڑی اتھارٹی اور ایک اجماع کو اس سے زیادہ وقیع اجماع کے ذریعے تبدیل کرنا ممکن ہے (بزدوی۔ اصول) تاہم یاد رہے کہ اس اصول کا اطلاق صرف فقہاء کی رائے پر ہے۔ قرآن اور صحیح احادیث کے فرامین سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے فرامین کو خود ہی منسوخ کر سکتا ہے اور کسی پیغمبر کے فرمودات کو بعد میں آنے والا کوئی پیغمبر یا پھر اللہ تعالیٰ منسوخ کر سکتے ہیں۔ کسی عالم یا فقیہہ کو اس میں ردوبدل یا تنسیخ کا اختیار نہیں۔

(319) تاریخ سے بات ثابت ہے کہ اسلام میں اجتہاد کا اختیار حکومتی اثر ورسوخ سے آزاد فقہاء اور اعلیٰ علمی مقام ومرتبے کی حامل شخصیات کو ہی دیا گیا ہے تاکہ ان اجتہادی قوانین پر روزمرہ کی سیاست کے کوئی اثرات پڑ سکیں نہ ہی ان میں کسی خاص شخصیت کے مفادات کو ملحوظ رکھا گیا ہو

چاہے وہ سربراہ مملکت ہی کیوں نہ ہو۔ اجتہاد میں شریک تمام فقہاء کا درجہ برابر ہوتا کہ وہ آزادانہ ایک دوسرے سے اختلاف کر سکیں اور اس طرح مسئلے کے تمام پہلو کھل کر زیر بحث آ سکیں اور یہ عمل ایک دور میں بھی ہو سکتا ہے اور بعد میں آنے والے ادوار میں بھی اور اس طرح ایک بہترین حل سامنے آ سکتا ہے۔

(320) اس طرح یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اسلام میں ایسا نہیں ہے کہ مذہبی قوانین کوئی انتہائی جامد شے ہیں۔ اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ قانون کے خدائی ہونے کی حیثیت سے اسے اسلام کے پیروکاروں کے دل میں رعب اور احترام کا مقام حاصل ہو اور وہ اس پر صدق دل اور ذمہ داری کے ساتھ عمل پیرا ہوں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ دور اول کے فقہا نے یہ متفقہ طور پر قرار دیا تھا کہ ''جس چیز کو مسلمان اچھا کہیں، اللہ کی نظر میں بھی وہ اچھا ہوتا ہے۔ گو اس قول کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث مبارکہ ہونا ثابت نہیں۔ (امام سرخسیؒ کے نزدیک یہ حدیث جبکہ امام ابن حنبلؒ اسے صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول قرار دیتے ہیں) اس بحث کے مطابق اجماع امت کے نتیجے میں سامنے آنے والی رائے خدا کی نظر میں بھی معتبر ہی قرار پاتی ہے چاہے اجماع میں شامل علماء وفقہاء کا تبحر علمی دور اول جیسا نہ ہو مگر اس کو عامۃ المسلمین میں خدائی قانون جیسا مقام ومرتبہ ہی حاصل ہوتا ہے۔ (اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حج کے موقع پر شیطان کو کنکریاں مارنے کے اوقات کے حوالے سے علماء نے اجتہاد کر کے قدیم روایت تبدیل کر دی ہے۔ مترجم)

انصاف کی فراہمی کا نظام:

(321) نظام انصاف کے حوالے سے قرآنی احکام یہ ہیں کہ اسلامی مملکت میں آباد تمام قومیتوں کو ان کے اپنے عقائد کے مطابق عدالتی خود مختاری حاصل ہو اور اسلام کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ قرآنی احکام عیسائیوں، یہودیوں، مجوسیوں یا دوسری غیر مسلم اقلیتوں پر ٹھونس دیئے جائیں بلکہ اس کے نزدیک احسن صورت یہ ہے کہ ان کی علیحدہ عدالتیں ہوں جن کے جج بھی انہی میں سے ہوں اور وہ اپنے تمام مقدمات چاہے وہ دیوانی ہوں یا فوجداری اپنی عدالتوں میں لے کر جائیں اور فیصلے حاصل کریں۔ اس صورت میں کہ کسی تنازعے کے فریقوں کا تعلق مختلف عقائد سے ہو تو مقدمہ کا فیصلہ ایک طرح کے بین الاقوامی قانون کے تحت ہوگا جس پر فریقین متفق ہو جائیں۔

اسلام مملکت کے ہر شہری پر "حکمران قومیت" کا قانون مسلط کرنے کی بجائے ان کو اپنے اپنے عقیدے کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دیتا ہے (اس حوالے سے مزید تفصیلات پیراگراف نمبر 293 میں گزر چکی ہیں۔)

(322) اسلام کا نظام انصاف پیچیدگیوں سے آزاد ہے۔ انصاف کی فراہمی بھی اس کی اہم خصوصیت ہے مگر اس کا قانون شہادت سخت اور غلطیوں سے پاک ہے۔ روایتی طور پر ہر علاقے کے عدالتی دفاتر میں (جیسے کہ ہمارے قانون میں تھانوں کے اندر مشتبہ وغیرہ لوگوں کا اندراج کیا جاتا ہے۔ مترجم) مقامی باشندوں کی عادات اور کردار کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے تاکہ بوقت ضرورت یہ معلوم ہو سکے کہ گواہ کی ساکھ کیسی ہے اور یہ کام فریق مخالف پر نہیں چھوڑا جاتا کہ وہ دوسرے کے گواہ کی ساکھ کو گھٹا کر پیش کرے۔ اس حوالے سے قرآن میں ارشاد ہے:

"اور جو لوگ پرہیزگار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی (80) درے مارو اور (آئندہ) کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہیں۔" (4:24)

یعنی غلط الزام لگانے والوں کو نہ صرف سزا دینے کا حکم ہے بلکہ انہیں عدالتوں میں گواہی دینے کے حق سے بھی ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا ہے۔

قانون کی اساس اور ترقی:

(323) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ماننے والوں کو اسلام کی بحیثیت مذہب تعلیم دی اور اس کے جزا اور سزا کے اصول و رموز سکھائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں زندگی کے ہر شعبے سے متعلق قوانین دیئے جو نہ صرف انفرادی بلکہ اجتماعی دنیوی اور دینی تمام پہلوؤں کے بارے میں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالکل اس کے مطابق ایک ریاست قائم کی اور اس کی انتظامیہ کھڑی کی۔ فوجیں تشکیل دیں جن کے سالار اور ریاست کے حاکم اعلیٰ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تھے۔ اپنی براہ راست نگرانی میں شعبہ سفارت قائم کیا اور دوسرے ممالک سے تعلقات کی بنا ڈالی۔

اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی "رعایا" میں مقدمہ بازی تک نوبت پہنچتی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جج کے فرائض بھی ادا کرتے۔ اس لیے اسلام کے قانون کی ابتداء کا مطالعہ

کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کے ایک ایسے خاندان میں جنم لیا جن کا پیشہ تجارت تھا اور جو تجارتی قافلوں کی قیادت کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اوائل جوانی میں یمن اور مشرقی عرب یعنی عمان (اومان) (بحوالہ ابن حنبل 206:4) اور فلسطین کے تجارتی میلوں اور مارکیٹوں کا سفر کر چکے تھے۔مکہ کے لوگ عراق، مصر اور حبشہ (ایبے سینیا) تک سامان تجارت لے کر جاتے تھے۔

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اعزاز نبوت سے سرفراز ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ کے حکم کے مطابق اس کا پیغام اس کے بندوں کو پہنچانا شروع کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم وطن غیض وغضب سے بھڑک اٹھے اور انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جس کے نتیجے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت پر مجبور ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نئی سرزمین مدینہ کو اپنا ٹھکانہ بنایا۔ جہاں کے مکینوں کی روزی کا بڑا وسیلہ کاشتکاری تھی۔ جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باضابطہ ریاست کی بنا ڈالی جس کا آغاز تو شہر مدینہ پر مشتمل ریاست سے ہوا مگر بتدریج اس نے ایک بڑی مملکت کی شکل اختیار کر لی اور جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے تو پورا جزیرہ عرب نما اس نئی ریاست کی حدود میں شامل ہو چکا تھا بلکہ جنوبی عراق اور فلسطین کے کچھ حصوں پر بھی مسلمانوں کا کنٹرول تھا۔ بین الاقوامی تجارتی قافلے پورے عرب میں گھومتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایرانیوں اور رومیوں نے عرب کے کچھ حصوں پر قبضہ کر رکھا تھا اور وہاں کے حاکموں کو بعض شرائط یا مراعات کے عوض ان کی سرپرستی حاصل تھی۔ ابن الکلبی اور المسعودی کے مطابق خصوصاً مشرقی عرب کے میلوں میں ہندوستان، چین اور ''مشرق'' اور ''مغرب'' سے تجارتی قافلے بڑے التزام سے شریک ہوتے۔ عرب میں نہ صرف خانہ بدوش لوگ رہتے تھے بلکہ شہری آبادیاں بھی تھیں جہاں یمنیوں اور لحنیوں (Lihyanites) نے ایک تہذیب پروان چڑھائی جس کی تاریخ ایتھنز اور روم کے شہروں کی تعمیر سے بھی قدیم تھی۔

(324) اسلام کی آمد کے بعد ملک کے رسوم ورواج پر مبنی قوانین تبدیل ہو گئے اور ان کی جگہ باقاعدہ ریاستی قوانین نے لے لی۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے نہ صرف اپنے پیروکاروں اور دوسرے شہریوں کے لیے پرانے قوانین کو بہتر بنایا جبکہ یکسر نئے قوانین بھی متعارف کرائے۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ہونے کی حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کو قوانین بنانے اور نافذ کرنے کا اختیار حاصل تھا اور نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروکاروں کے لیے زندگی کے ہر شعبے کے لیے قانون کا درجہ رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کسی فعل پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاموشی بھی اس کو قانون کا درجہ عطا کر دیتی تھی۔ اس طرح قانون سازی کے یہ تین سرچشمے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین جن کی بنیاد وحی الٰہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال یعنی سیرت طیبہ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے وہ معمولات جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نظروں کے سامنے رونما ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان پر کوئی اعتراض نہ کرتے، یہ فرمان اور مجموعہ ہائے احادیث کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران ہی قانون سازی کا ایک اور ذریعہ بھی ظہور پذیر ہو گیا کہ جن معاملات کے بارے میں ابھی تک کوئی قانون وضع نہیں ہوا تھا اس بارے میں دیگر موجود قوانین سے استنباط یا استفادہ کر کے قانون وضع کرنے کا رستہ نکل آیا اور ایسا بھی ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدم موجودگی میں فقہا نے اجتہاد کے ذریعہ مسئلے کا حل نکالا۔ اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران نہ صرف صوبائی صدر مراکز بلکہ دار الخلافہ مدینہ میں بھی قاضی اور قانون کے ماہر موجود تھے۔ یہ ذکر پہلے آ چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو یمن کا حاکم عدالت بنا کر بھیجا تو انہیں کیا ہدایات دی تھیں۔

بعض اوقات صوبائی دارالحکومتوں سے حل طلب معاملات میں مرکزی حکومت سے رہنمائی طلب کی جاتی تھی اور مرکزی حکومت دیگر علاقوں میں ماتحت حاکموں کی طرف سے غلط فیصلوں کا نوٹس لیتی اور ان کی اصلاح کی جاتی اور جب بھی مجاز اتھارٹی کے نوٹس میں ایسا کوئی معاملہ آتا تو فوری کارروائی ہوتی تھی۔ پرانے رسم و رواج اور معمولات کو تبدیل کر کے ان کی جگہ اسلام کے قوانین لاگو کرنے کا کام ملک بھر میں بتدریج مکمل ہوا کیونکہ جو قاضی مقرر کئے گئے تھے وہ صرف اسی صورت مداخلت کرتے تھے جب کوئی معاملہ ان کے نوٹس میں لایا جاتا تھا اور ایسے واقعات بھی بے شمار تھے جو اس بنا پر قاضیوں کے پاس نہ لائے گئے کہ کرنے والوں کو علم ہی نہ تھا کہ وہ کوئی غلط کام کر رہے ہیں مثلاً ایک شخص نے جو اسلام قبول کر چکا تھا اپنی سوتیلی بہن سے شادی

کر لی۔ جب یہ معاملہ خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علم میں آیا تو آپ نے اس شخص سے وضاحت طلب کی تو اس نے جواب دیا کہ اس کے علم میں نہ تھا کہ اس کی ممانعت کی جا چکی ہے۔ خلیفہ نے دونوں میں علیحدگی کروا دی اور اس شخص سے بہن کو زرتلافی دلوایا تاہم اسے زنا یا محرم سے ناجائز تعلق کی بناء پر کوئی سزا نہ دی۔

(325) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد وحی کا سلسلہ رک جانے سے قانون سازی کا سرچشمہ بند ہو گیا جس کے بعد مسلمانوں کے پاس پہلے سے موجود قوانین کے ساتھ کام چلانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں وضع ہو چکے تھے تاہم انہی قوانین میں اجتہاد کا راستہ موجود تھا۔ اجتہاد سے مراد پہلے سے موجود کسی قانون کی تنسیخ نہیں بلکہ صرف ان معاملات میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے جن کے بارے میں قرآن اور حدیث خاموش ہوں۔

(326) ان میں اہم ترین مثالیں درج ذیل ہیں۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر (مثلاً 1:5,24:4) کچھ ممنوعات کا ذکر کر کے باقی کے بارے میں واضح طور پر اجازت دے دی کہ وہ جائز ہیں (اس حوالے سے) اس طرح وہ تمام چیزیں جو پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وضع کردہ قانون کے منافی نہ ہوں جائز اور قانونی ہیں۔ غیر ملکی قوانین اور رسوم و روایات سے مسلمان فقہا نے ہمیشہ استفادہ کیا ہے اور ان میں وہ چیزیں جو خلاف اسلام ہیں حذف کر کے باقی اچھی چیزوں کو اپنا لینا اسلام میں جائز ہے۔ قانون سازی کا یہ ذریعہ دائمی ہے۔

(327) قانون سازی کا ایک اور ذریعہ جو بظاہر حیران کن بھی ہے۔ قرآن مجید کا یہ حکم ہے (90:6) کہ سابقہ پیغمبروں پر وحی نازل ہوتی رہی اس پر عمل بھی مسلمانوں کے لیے جائز ہے۔ قرآن مجید نے بہت سے ان پیغمبروں کے نام بھی لیے ہیں، ادریس، نوح، ابراہیم، موسیٰ، داؤد، سلیمان، عیسیٰ، یحییٰ (علیہم السلام) مگر یہ اجازت صرف احکام وحی تک محدود ہے جن کی صداقت بغیر کسی شک وشبہ کے ثابت ہو جائے یعنی ان کتابوں کے وہ حصے جن کی صداقت کی گواہی قرآن یا حدیث سے مل جائے۔ مثلاً تورات کے بدلہ کے قانون کا ذکر قرآن مجید میں موجود ہے (45:5) جس میں واضح طور پر کہا گیا کہ: اللہ نے اسے یہود پر فرض کر دیا تھا" یہاں یہ اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی" اور تم پر بھی (فرض کر دیا)۔ (آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان)

(328) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے صرف 15 برس بعد مسلمانوں کی حکمرانی کی حدود تین براعظموں تک پھیل چکی تھیں اور اس کی وسعت کے دائرے میں ایشیاء، افریقہ اور یورپ (اندلس) کے مقبوضات شامل تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی خلافت کے دوران عراق اور ایران میں ساسانیوں کا نظام مالیات درست قرار دے کر برقرار رکھا جبکہ شام اور مصر میں رومیوں کے نظام کو ظالمانہ قرار دے کر تبدیل کر دیا۔ اور اسی طرح انہوں نے زیر قبضہ نئے صوبوں کے کئی قوانین جو ٹھیک تھے بحال رکھے جبکہ جہاں غلطی پائی اسے درست کر دیا۔ اس طرح پہلی صدی ہجری کا پورا دورانیہ فتوحات، مقبوضہ علاقوں کو مستحکم کرنے اور ان کا نظم ونسق نئے سرے سے قائم کرنے میں گزر گیا۔ مصر میں دریافت ہونے والی ''کاغذی'' دستاویزات (قدیم مصری پیپرس نامی درخت کی چھال کی دبازت سے کاغذ تیار کرتے تھے) سے مصر میں رائج انتظامیہ کے مختلف پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں۔ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں ہمیں باقاعدہ مجموعہ ہائے قوانین کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے جو غیر سرکاری طور پر فقہا نے مرتب کئے تھے۔ اولین دور کے ان فقہا میں زید بن علیؒ کا نام کافی نمایاں ہے۔ جن کا انتقال 120 ہجری میں ہوا۔

(329) قدیم لوگ یمن کو اگر ''عرب کی جنت'' کا نام دیتے تھے تو یہ بلاوجہ نہیں تھا۔ زمانہ قبل مسیح میں یہ خطہ تہذیب وثقافت کا گہوارہ شمار ہوتا تھا اور اس کی طبعی اور دوسری خصوصیات کی بناء پر اسے عرب کے دوسرے خطوں میں قابل رشک برتری حاصل تھی۔ بائبل نے بھی تصدیق کی ہے کہ اس زمانے میں یمن کی دولت مندی ضرب المثل بنی ہوئی تھی اور یہ سلطنت طاقت اور عظمت کی علامت تھی۔ عیسوی صدی کے آغاز میں نقل مکانی کی ایک بڑی لہر کے دوران بعض یمنی قبائل سرزمین عراق میں وارد ہوئے اور انہوں نے حیرہ کی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ جو ظہور اسلام تک قائم رہی۔ اسی دوران یمن میں یہودی فرمانروا ذونواس کا تسلط قائم ہو گیا اور بعد ازاں حبشی عیسائیوں نے اسے نکال باہر کیا جن کا خاتمہ کر کے آتش پرست ایرانی آ گئے۔ جنہیں مسلمانوں نے شکست دے کر اپنی حکومت قائم کی۔ یمنی ان پے در پے حملوں اور شکستوں سے دل شکستہ تھے چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں انہوں نے ایک بار پھر ترک وطن کیا۔ اور عراق کا رخ کیا جہاں ان کی اکثریت نے کوفہ کو اپنا نیا وطن بنایا۔ کوفہ اس وقت ایک نیا شہر تھا جو حیرہ کے شہر کے قریب بسایا گیا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابن مسعودؓ کو جو صحابہ کرام میں فہم وبصیرت کے اعتبار سے نمایاں تھے، کوفہ بھیجا کہ وہاں ایک مدرسہ قائم کریں۔ اس مدرسے میں ان کے

جانشینوں میں علقمہ النخعی، ابراہیم النخعی، حماد، ابوحنیفہ رحمہ اللہ علیہم سب کا شمار اسلامی قانون کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ اسی اثناء میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو خود بڑے عالم اور فقیہہ تھے، اپنے دور میں دارالخلافہ مدینہ سے کوفہ منتقل کرلیا۔ اس تناظر میں یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ یہ شہر عظیم روایات کا حامل قرار پایا اور قانون شریعہ کے حوالے سے عالم اسلام میں اسے ایک قابل احترام اور معتبر مقام حاصل ہوا۔

(330) قاضیوں اور فقہا یعنی ماہرین قانون شریعہ کے معاملات میں حکومتی مداخلت کی روایت نہ ہونے سے ان اداروں کو بلاشبہ بڑی تیزی سے فروغ حاصل ہوا مگر اس میں بعض مشکلات بھی پیدا ہوئیں۔ دوسری صدی ہجری کے آغاز میں ابن المقفع جیسے تجربہ کار اور مقتدر منتظم نے اپنی تصنیف ''کتاب الصحابہ'' میں نظیری قانون شریعہ میں بڑے پیمانے پر اختلاف رائے کی شکایت کی اور ایسا فوجداری سمیت قانون کے مختلف شعبوں میں خصوصاً بصرہ اور کوفہ میں کھلے عام ہورہا تھا اور انہوں نے خلیفہ کو مشورہ دیا کہ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے ایک اعلیٰ ادارہ قائم کیا جائے جو عدالتی فیصلوں پر نظر ثانی کرے اور تمام سلطنت میں یکساں قانون کا نفاذ کیا جائے مگر ان کی یہ تجویز صدا بہ صحرا ثابت ہوئی۔

ان کے ہم عصر ابوحنیفہؒ جو علم قانون کے حوالے سے پائی جانے والی آزادروی سے نالاں تھے اور کوشاں تھے کہ اسے سیاست میں ہر آن ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات سے پاک رکھا جائے۔ انہوں نے پیشرفت کرتے ہوئے قانون کی ایک اکیڈمی قائم کی جس کے (40) ارکان تھے۔ ان میں سے ہر ایک قانون کے ایک شعبے کا ماہر تھا جیسے قرآن اور حدیث کی تشریح۔ منطق، لغت نویسی وغیرہ۔ اس ادارے نے اس دور کے نظیری قانون کی جانچ پرکھ اور قوانین کی تدوین کی ذمہ داری اٹھائی۔ انہوں نے مسلم لاء میں پائے جانے والے اس خلا کو بھی پُر کرنے کی کوشش کی جہاں بعض معاملات کے بارے میں نظیری قانون کے متن اور روایت میں کوئی تذکرہ اور رائے نہیں دی گئی تھی۔ ابوحنیفہؒ (وفات 150 ہجری) کے ایک سوانح نگار کا کہنا ہے کہ ''انہوں نے کوئی پانچ لاکھ ضوابط وضع کیے تھے۔ (الموفق: 137,11)

مدینہ میں مالکؒ اور شام میں اوزاعی بھی ایک ہی وقت میں یہی مشن سنبھالے ہوئے تھے مگر وہ اپنے ذاتی علم اور ذرائع پر انحصار کرتے تھے جبکہ (امام) ابوحنیفہؒ تمام قوانین کے سرچشمہ قرآن اور حدیث سے رجوع کرنے کے ساتھ ساتھ استدلال پر زور دیتے تھے جبکہ (امام) مالکؒ

مدینہ کے مکینوں کو حوالہ بنانے کو ترجیح دیتے۔ ایک شہر جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کا امین تھا اس سے نتیجہ اخذ کرتے۔

(331) قرآن کی ''اشاعت'' تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے چند ہی ماہ بعد شروع ہوگئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے معمولات یعنی سنت اور اپنے صحابہؓ کے معمولات اور روایات کی خاموش تائید (یعنی جن باتوں کو کرتے دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع نہیں فرمایا) پر مبنی مواد جسے احادیث نبوی کہا جاتا ہے، کے جمع کرنے کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی بعض صحابہؓ نے شروع کر دیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد کئی دوسرے لوگ بھی اس کار عظیم میں شامل ہوگئے۔ ایک لاکھ سے زیادہ صحابہ کرامؓ نے بعد میں آنے والوں کے لیے اس حوالے سے قابل قدر سرمایہ چھوڑا ہے۔ ایسے اصحابؓ کی تعداد 50 کے قریب ہے جنہوں نے احادیث کو تحریری شکل میں محفوظ کرلیا جبکہ باقی نے زبانی روایات سے انہیں آگے پہنچایا۔

یہ اہم قانونی مواد تین براعظموں میں پھیلا ہوا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں صحابہؓ جہاں گئے اپنے اس اثاثے کو ہمراہ لے گئے۔ بعد میں آنے والے محققین نے اس عظیم علمی خزانے کو تلاش کرکے اسے جمع کیا اور تبویب وتدوین کے ذریعے آئندہ نسلوں کی مشکلات آسان کردیں۔ اس مقصد کے لیے نہ صرف تحریری مواد سے استفادہ کیا گیا بلکہ ملکوں ملکوں پھر کر جہاں بھی کوئی حدیث اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کیے بیٹھا تھا اس سے حاصل کرکے مجموعے کا حصہ بنا دیا۔

(332) نظیری قانون کی جانچ پرکھ اور احادیث کی تدوین کا کام کم وبیش بیک وقت ہی مکمل ہوا جبکہ اس میں مصروف عمل ہر ایک نے دوسرے کے کام کو نظر انداز بھی کیا اور اسے شک وشبے کی نظر سے بھی دیکھا۔ (امام) شافعیؒ کی پیدائش اور (امام) ابوحنیفہؒ کی وفات ایک ہی سال میں ہوئی۔ باہمی اختلافات اور مناظروں سے فقہا کو صحیح احادیث تک پہنچنے اور احادیث کے ماہرین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال وفعال کا ریکارڈ مرتب کرنے میں بڑی مدد ملی اور وہ اس قابل ہوئے کہ وہ روایت حدیث کے ذرائع کی انفرادی ساکھ جانچ سکیں اور احادیث کے سیاق وسباق اور وقت کا بھی تعین کرسکیں تاکہ اس کی روشنی میں اسے قانون کی شکل دی جاسکے۔ (امام) شافعیؒ حدیث اور قانون دونوں میں اعلیٰ مقام کے حامل تھے اور ان کی خدا

داد علمی صلاحیتوں اور برسہا برس کی کاوشوں کا اعجاز ہے کہ ان دونوں شعبوں کا امتزاج سامنے آیا۔ امام شافعیؒ دنیا کی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم قانون کو آج مختلف ممالک میں نافذ قواعد اور قوانین کی شکل میں ڈھالا۔

(333) ایک اور بڑا مکتب فکر (امام) جعفر الصادقؒ نے قائم کیا جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے اور (امام) ابوحنیفہؒ کے ہم عصر تھے۔ اس مکتب فکر میں جو خاص انداز کی وراثت کی روایت چلی اس کی وجوہ قدرے سیاسی ہیں۔ ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور جعفر الصادق رحمۃ اللہ علیہم میں سے ہر ایک نے اپنے پیروکاروں کے لیے اپنا فکری اثاثہ چھوڑا ہے۔ دور حاضر میں ان مکاتب فکر کے ماننے والوں کے فرقے بن چکے ہیں تاہم ان کے مابین اختلاف رائے کے اثرات اس سے کہیں کم ہیں جو ان کے مکاتب میں بنیادی طور پر ہے۔ کئی صدیاں گزر جانے کے بعد اب یہ عام بات ہے کہ شافعیوں میں بعض نکات پر خود اپنے امام سے اختلاف پایا جاتا ہے اور وہ (امام) مالکؒ یا (امام) ابوحنیفہؒ کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں اور ایسی ہی صورتحال دوسرے مکاتب فکر میں ہے۔

(334) جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ مسلمانوں کی برق رفتار فتوحات کے نتیجے میں ان کی سلطنت کی حدود وسیع علاقوں تک پھیل گئیں جہاں حکومت چلانے کے مختلف قانونی نظام رائج تھے مثلاً ایرانی، چینی، ہندوستانی، رومی، گوتھک اور دوسرے جن میں عرب مسلمان فاتحین کا کچھ رنگ بھی شامل ہو گیا۔ اس لیے اسلامی قانون پر کسی ایک غیر ملکی قانونی نظام کے اثرات غالب ہونا تو خارج از امکان تھا۔ مختلف مکاتب فکر کے بانیوں میں ابوحنیفہؒ ایرانی النسل جبکہ مالکؒ، شافعیؒ اور جعفر الصادقؒ عرب تھے۔ عظیم سوانح نگار الذہبی لکھتے ہیں کہ اوزاعیؒ کا تعلق سندھ سے تھا۔ بعد میں جو مسلمان فقیہہ آسمان علم پر ابھرے ان کا تعلق مختلف نسلوں سے تھا۔ گویا اسلامی قوانین کی تشکیل و تکمیل ایک ''بین الاقوامی'' کاوش کے نتیجے میں ہوئی جس میں مختلف النسل مسلمان فقہا نے جن کی زبان روایات اور رسوم ورواج ایک دوسرے سے مختلف تھے حصہ لیا۔ اس میں عربوں کے علاوہ سپین، پرتگال اور سسلی سے تعلق رکھنے والے یورپی، چینی، حبشی، ہندوستانی، ایرانی، ترک مسلمان شامل تھے۔

(335) کم وبیش ہر ملک میں ایسی صورتحال ہوتی ہے کہ بعض کٹر روایت پسند اور تقلید کے خوگر لوگ کسی قدیم استاد کے چند الفاظ کو بھی حرز جاں بنائے رکھتے ہیں جبکہ باقی تقلید کی روش سے گریز

کی راہ اختیار کر کے کسی مہم جوئی میں پڑ جاتے ہیں۔ مگر اس اچھی روایت اور روش کو ہمیشہ جاری رہنا چاہیے۔ کسی احساس کہتری سے آزاد روح کو جو ضروری علوم سے بہرہ ور اور ایک باعمل مسلمان کے تقویٰ سے سرشار ہو (اسلامی قانون کی) قابل عمل تشریح ڈھونڈنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی جو اتنی معقول اور قابل قبول بھی ہوگی کہ پہلوں کی اختیار کردہ رائے کو تبدیل کرنے کی خصوصیات کی حامل بھی ہوگی اور دیکھیں کس اعتماد اور یقین کے ساتھ بزدوی جیسے عظیم فقیہہ ہمیں باور کراتے ہیں کہ قدما کی نہ صرف انفرادی آراء بلکہ اجماع کو بھی بعد کے کسی اجماع کے نتیجے میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ:

(336) اسلامی قانون کے مملکت اور حکمران طبقے کا قانون بننے کا آغاز اس وقت ہوا جب اسلامی سلطنت کی حدود پھیلنے لگیں اور اس کا دائرہ اقتدار اوقیانوس سے بحرالکاہل تک وسیع ہوگیا۔ قانون شریعہ میں ہر دور اور خطہ کے حالات سے ہم آہنگ ہونے کی فطری صلاحیت موجود ہے اور یہ قوت متحرکہ آج بھی بدرجہ اتم اس میں موجود ہے بلکہ فلاح و بہبود کے بہترین نظام کے طور پر اس کی پہچان بڑھتی جارہی ہے۔ خصوصاً ان مسلمان ممالک میں جو بیرونی استبداد کے غلام رہے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان کے عدالتی نظام کو اپنانے پر مجبور تھے وہاں اسلامی قانون کی اس عملی خصوصیت سے بھرپور استفادہ کرنے اور شریعت کو زندگی کے ہر شعبے میں لاگو کرنے کی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔

باب نمبر 10

اسلام کا معاشی نظام

اسلام اپنے پیروکاروں کو زندگی کے تمام مرحلوں اور سرگرمیوں کے حوالے سے مادی اور روحانی یعنی دنیاوی اور دینی معاملات میں رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ معاشیات سے متعلق اس کی بنیادی تعلیمات کا ذکر قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اسلام مادی خوشحالی کے خلاف نہیں۔ فرمان خداوندی ہے:

"......مال جسے اللہ نے تم لوگوں کے لیے سبب معیشت بنایا ہے......" (5:4)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

"......اور جو (مال) تم کو اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے آخرت (کی بھلائی) طلب کیجئے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلائے۔......" (77:28)

اس حوالے سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی دہری فطرت اور دو اقسام کا ذکر فرمایا:

"......اور بعض لوگ ایسے ہیں جو (اللہ سے) التجا کرتے ہیں کہ اے پروردگار ہم کو (جو دنیا ہے) دنیا ہی میں عنایت کر، ایسے لوگوں کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔"

"اور بعض ایسے ہیں کہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی، نعمت بخشیو اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔"

"یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کاموں کا حصہ (یعنی اجر نیک تیار) ہے اور اللہ جلد حساب لینے والا (اور جلد اجر دینے والا ہے)۔" (2.200:2)

بعض دوسری آیات میں ہم واضح طور پر ذکر پاتے ہیں کہ جو کچھ زمین، سمندر، حتیٰ کہ آسمانوں میں موجود ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے فائدے کے لیے پیدا کیا ہے اور اس کے علاوہ زمین، سمندر، آسمان، ستارے اور دوسری تمام اشیاء انسان کی مطیع کر دی گئی ہیں اور اب یہ انسان پر ہے کہ وہ اس چیز کا کھوج لگائے کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں سے کیسے فائدہ اٹھانا ہے اور یہ فائدہ مستقبل کو پیش نظر رکھ کر اس کی مناسبت سے اٹھانا چاہیے۔

(338) اسلام کی معاشی پالیسی قرآن مجید میں بہت واضح انداز میں بیان کر دی گئی ہے:

"......تاکہ جو لوگ تم میں دولت مند ہیں (مال) انہی کے ہاتھوں میں نہ پھرتا رہے۔" (7:59)

دولت اور فارغ البالی کے حوالے سے تمام انسانوں میں مساوات کا تصور بظاہر کتنا ہی آئیڈیل کیوں نہ ہو مگر انسانیت کے لیے مکمل سودمند ہونے کی ضمانت نہیں۔ ایک تو اس وجہ سے کہ فطری صلاحیتیں تمام انسانوں میں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ یہاں تک کہ اگر مکمل مساوات کے ساتھ کچھ لوگ زندگی کا آغاز کریں تو جلد ہی ان میں سے جو فضول خرچ ہوگا وہ کنگلا ہو کر مشکلات میں گھر جائے گا اور باقی مالکوں کے مال پر حریصانہ نظریں ڈالنے لگے گا۔ اس کے علاوہ فلسفیاتی اور نفسیاتی لحاظ سے بہتر صورت یہی سامنے آئی ہے کہ یہ انسانی معاشرے کے بہترین مفاد میں ہے کہ انسانوں کے مابین کوئی امیر ہو اور کوئی غریب، اس کے باعث جو غریب ہوں گے ان میں مزید محنت کر کے آگے بڑھنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔

اس کے علاوہ اگر ہر شخص کو یہ علم ہو جائے کہ اگر وہ اپنے ذمہ ڈیوٹی سے زائد کام کر بھی لے تو بھی اسے اس کا کوئی اضافی معاوضہ نہیں ملے گا بلکہ وہ انہی لوگوں کے برابر ہی رہے گا جو اپنے فرائض سے زیادہ کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو یقیناً اس میں آگے بڑھنے کی امنگ ختم ہو جائے گی۔ وہ کاہل اور لاپرواہ ہو جائے گا اور اس کی صلاحیتیں ضائع ہونے لگیں گی جو معاشرے کی بدقسمتی ہے۔

(338۔ الف) یہ بات ایک ظاہر حقیقت ہے کہ ہماری معاش یا معیار زندگی فروغ پذیر ہے۔ انسان مار دھاڑ کر کے اور اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ وسائل کو تصرف میں لا کر اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے مگر اس کے برعکس جانوروں کی بود و باش میں آغاز سے اب تک کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ماہرین حیاتیات کے نزدیک اس فرق کی وجہ انسانوں میں ایک معاشرہ کے

قیام کی ضرورت باہمی تعاون اور صحت مند مسابقت کی موجودگی ہے جب کہ جانوروں کی دنیا میں ان میں سے کسی کا وجود نہیں۔ مثلاً کتے، بلیاں اور سانپ ایک خاندان بنا کر نہیں رہتے۔ وہ اپنی نسل کا تسلسل ہر قسم کی ذمہ داریوں سے آزاد اور ایک "لمحاتی محبت" (جنسی ملاپ) کے ذریعے ممکن بناتے ہیں۔ جبکہ کوے، کبوتر اور بعض دوسرے پرندے جوڑے کی صورت میں اپنا خاندان ضرور بناتے ہیں اور اس میں بھی نر محض گھونسلہ بنانے میں مدد کرتا ہے مگر دونوں اپنے لیے خوراک کا بندوبست خود کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

جانوروں میں بہترین سماجی تعاون کی مثال شہد کی مکھی، چیونٹی اور دیمک میں پائی جاتی ہے۔ وہ اجتماعی طور پر زندگی گزارتی ہیں ان میں کوئی مسابقت کا تصور نہیں سب مل جل کر کھاتی اور ایک جیسا کھاتی ہیں اس لیے ان کے ہاں ایسی کوئی بات نہیں کہ کوئی زیادہ ذہین شہد کی مکھی زیادہ محنت سے اپنے لیے زیادہ آرام دہ زندگی کا اہتمام کرلے۔ اس وجہ سے ان کی زندگی میں کوئی بہتری آسکتی ہے نہ ہی تبدیلی جبکہ انسانوں کی صورتحال اس کے برعکس ہے انسانی تاریخ گواہ ہے کہ شاہراہ ترقی پر ہر اگلے قدم اور زندگی کو زیادہ سے زیادہ سہل اور آرام دہ بنانے کے لیے سامان آسائش کی تیاری کے پس پردہ جذبہ مسابقت اور بہتر تبدیلی کے لیے جدوجہد کارفرما ہے۔ اسکے علاوہ انسانوں میں مالی اونچ نیچ اور اس کے نتیجے میں قائم ہونے والے سماجی مراتب نے بھی انسانوں میں آگے بڑھنے کی خواہش بیدار کرنے کے لیے مہمیز کا کام کیا۔

ان خدشات کا ادراک کرتے ہوئے کہ اندھی مادہ پرستی سے مغلوب شیطان صفت لوگ ضرورت مندوں کا استحصال کریں گے اور انہیں رفتہ رفتہ غربت کے اندھیروں میں دھکیل دیں گے۔ یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ ہر نمو پذیر تہذیب اور صحت مند ثقافت کو متوازن رکھنے کے لیے اس کے افراد پر بعض ذمہ داریاں ڈال دی جائیں (مثلاً ٹیکس کی ادائیگی نیز ظلم و زیادتی اور دھوکہ دہی وغیرہ کی روک تھام کے لیے سزائیں) اور کچھ فرائض سے بڑھ کر بھی کرنے کی تلقین (اللہ کی راہ میں خرچ یعنی صدقات و خیرات وغیرہ) ان ذمہ داریوں کی بجا آوری کے بعد ہر فرد کو فکر و عمل کی آزادی ہے کہ وہ اپنی، اپنے خاندان، دوستوں اور معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے جو بھی کرنا چاہے کرے، یہ اسلام کی خصوصیت بلکہ تقاضا ہے جو فطرت سے ہم آہنگ بھی ہے۔

(339) یہ بنیادی اصول ہے جس پر اسلام نے اپنا معاشی نظام استوار کیا ہے۔ اگر یہ قلیل سے طبقہ امراء کو قبول کرتا ہے تو اس پر بھاری ذمہ داریاں بھی عائد کرتا ہے۔ انہیں غریبوں کو سہارا دینے

کے لیے ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔اس کے علاوہ ذخیرہ اندوزی، ارتکاز دولت سمیت استحصال کے غیر اخلاقی حربے استعمال کرنے کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔اس مقصد کے لیے کچھ احکام، اصول اور قابل تحسین اقدامات بھی بیان کر دیئے گئے ہیں یعنی ضرورت مندوں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے مال سے خرچ کرنا اور اپنی ضروریات کو محدود کر کے ناداروں کی بنیادی ضروریات کے لیے قربانی دینا، جس کے اجر کے لیے آخرت کا وعدہ کیا گیا ہے کہ یہ عمل دوسری دنیا میں درجات کی بلندی کا باعث بنے گا۔اس کے علاوہ ایک طرف اسلام نے کم از کم ضروریات اور قابل قبول افراط کی نشاندہی کر دی ہے اور دوسری طرف وہ احکام اور فرامین ہیں کہ جن پر عمل نہ کرنے پر سزاؤں سے بھی خبردار کیا گیا ہے جبکہ کچھ اعمال کی ترغیب دی گئی ہے کہ ان کا کرنا قابل تحسین ہے لیکن اگر نہ کئے جائیں تو گناہ نہیں ہوتا۔

(340) اسلامی معاشی نظام کے اخلاقی پہلو کی کچھ وضاحت کی ضرورت ہے تاکہ اس کو بہتر طریقے سے سمجھا جا سکے۔دوسروں سے خیرات مانگنے کو اسلام میں ناپسند کیا گیا ہے۔اور اس کے لیے سخت الفاظ استعمال کیے گئے ہیں کہ ایسا کرنا روز قیامت ان کے لیے شرم اور عار کا باعث ہوگا مگر اس کے ساتھ ساتھ محتاجوں کی مدد کو پہنچنے والوں کے لیے بے پایاں تحسین کی گئی ہے اور ان لوگوں کو بہترین انسانوں میں شمار کیا گیا ہے جو دوسروں کے لیے قربانی دیتے اور اپنے پر دوسروں کی ضروریات کو ترجیح دیتے ہیں۔اس طرح طمع، لالچ اور فضول خرچی کی بھی ممانعت کی گئی ہے۔

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کسی سرکاری مقصد کے لیے کثیر وسائل درکار تھے۔ایک صحابیؓ نے کچھ مال اپنی طرف سے لا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے استفسار پر عرض کیا: ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! گھر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے سوا کچھ نہیں چھوڑا ہے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ مبارک یہ سن کر خوشی سے دمک اٹھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی اس پر بے حد تحسین فرمائی۔ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک صحابی بیمار تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے بہت کچھ عطا کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اپنا سارا مال غریبوں کے لیے وقف کر دوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں، یہ زیادہ بہتر ہے کہ اپنے پس ماندگان کے لیے اتنا (ضرور) چھوڑ

کر جاؤ کہ وہ عزت کی روٹی کھا سکیں اور دوسروں سے مدد مانگنے پر مجبور نہ ہوں۔" مختلف مواقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال کے دو تہائی اور نصف کو اللہ کی راہ میں دینے کو بھی "حد سے زیادہ" قرار دیا۔ اور جب ایک تہائی کی تجویز دی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "ایک تہائی بھی زیادہ ہے۔" (بخاری)

ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو دیکھا کہ وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا سبب دریافت فرمایا تو انہوں نے جواب دیا: "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں غریب نہیں ہوں مگر میں چاہتا ہوں کہ اپنی ذات کی بجائے اپنا مال ضرورت مندوں پر خرچ کروں۔" آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "نہیں، تمہارا رب چاہتا ہے کہ اس نے اپنے بندے پر جو رحمت کی ہے وہ اس کا اظہار کرے۔" (ابوداؤد، ترمذی)

ان ہدایات میں کوئی تضاد نہیں۔ ان تمام کا تعلق مختلف پس منظر، مواقع اور افراد سے ہے۔ اس کے ذریعے یہ ہماری صوابدید پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ ہم معاشرے کے نادار افراد کی مدد کے لیے کم از کم فرائض سے بڑھ کر جو بھی کر سکیں کریں۔

وراثت:

(341) اپنے مال اور جائیداد کو مرضی سے بیچنے یا خریدنے کے حق اور ہر فرد کے مال پر اجتماعی حق دونوں کا ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔ اس حوالے سے کہ ہر فرد معاشرے کا رکن ہے۔ ہر فرد کا مزاج دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ بیماری اور بعض دوسرے حادثات بھی انسان کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اجتماعی مفاد کے لیے کچھ ضوابط کا اطلاق کیا جانا چاہیے۔

(342) اس طرح اسلام نے دو اقدامات کئے ہیں۔ پہلا کہ متوفی کا مال اس کے قریبی رشتہ داروں (ورثاء) میں تقسیم کر دیا جائے۔ اور دوسرا مرضی کی وصیت کے ذریعے ترکہ کی تقسیم کی ممانعت۔ قانونی ورثاء کو کسی قسم کے وصیت نامہ کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ مرحوم کا ترکہ انہیں قانون میں متعین تناسب سے از خود مل جاتا ہے۔ وصیت نامہ کی ضرورت ان لوگوں کے لیے ہوتی ہے جو مرحوم کے ترکہ میں سے حصہ لینے کا قانونی یا شرعی حق نہیں رکھتے۔

(343) والدین کے لیے ساری اولاد برابر ہوتی ہے۔ اس لیے کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ وہ کسی

ایک بیٹے کو دوسرے سے زیادہ دے دے چاہے کوئی چھوٹا ہے یا بڑا۔ متوفی کے مال میں سے سب سے پہلے اس کی تدفین کے اخراجات ادا کیے جائیں۔ اس کے بعد حق اس کے قرضداروں کا ہے کہ اس کے ذمے تمام قرضے ادا کیے جائیں۔ ان دو مدات پر خرچ کے بعد جو مال باقی بچ جائے اس پر وصیت (اگر ہے تو) کا اطلاق ہوگا مگر وصیت کا اطلاق باقی مال (تدفین اور قرض کی ادائیگی کے بعد) کے ایک تہائی سے زائد پر نہیں ہو سکتا (یعنی وصیت کے مندرجات پر عمل کرتے وقت یہ پابندی ضروری ہے کہ باقی مال کے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی کو ہی تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ باقی مال شریعت کے متعین کردہ حصوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔)

یہ تین معاملات نمٹانے کے بعد شرعی اور قانون ورثاء کا حق آتا ہے۔ شوہر یا بیوی، والدین اور اولاد (بیٹے اور بیٹیاں) پہلے نمبر پر وارث ہیں اور ان کو ہر حال میں وراثت سے حصہ ملتا ہے اور ان ورثاء کی عدم موجودگی میں بھائی اور بہنیں اور دوسرے رشتہ دار وراثت کے مالک ہوتے ہیں۔ دوسرے رشتہ داروں میں چچا، ماموں، پھوپھیاں، کزنز اور دیگر آتے ہیں۔

(344) تکنیکی تفصیلات کو چھوڑ کر چند بنیادی اصولوں کا ذکر مناسب ہے۔ قاتل کو اپنے مقتول کی وراثت سے حصہ نہیں مل سکتا، چاہے عدالت کا فیصلہ یہی ہو کہ یہ قتل عمداً نہیں بلکہ قتل سہو تھا، یہ اقدام اس لیے کیا گیا تا کہ کسی کو اپنے امیر رشتہ دار کو اس ارادے سے قتل کرنے کی ترغیب نہ ہو کہ اس کے مرنے کی صورت میں ورثہ اسے جلدی مل جائے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متوفی کے مذہب سے مختلف عقیدہ کے حامل وارث کو بھی شرعی وراثت سے محروم قرار دیا ہے چاہے ان کا تعلق میاں بیوی کا ہو، البتہ اس صورت میں تحفہ یا وصیت میں دی گئی روایت کے مطابق حصہ (غیر مسلم وارث کو) ملے گا اور مسلمان شوہر چاہے وہ بستر مرگ پر ہی ہو، اپنی غیر مسلم بیوی کے لیے جائیداد کے حصے کی وصیت کر سکتا ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ فقہاء اولیٰ نے اپنے ادوار کے عالمی اور سیاسی حالات کے دباؤ کے تحت ایک اور پابندی بھی عائد کی ہے کہ مختلف قومیت یا دوسرے ملک سے تعلق کی بناء پر بھی وارث ترکہ کے حصہ سے محروم رہے گا۔ تاہم بین المملکتی معاہدوں کے تحت دو طرفہ بنیادوں پر اس مسئلے کا حل نکالا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں مثلاً میاں بیوی (یا دوسرے ورثاء بھی) دونوں مختلف ممالک کے شہری ہوں تو ان میں سے کسی ایک کے انتقال پر وراثت میں دوسرے کو حصہ مل سکے۔

(345) ان ممالک میں جہاں اسلام کا قانون وراثت لاگو نہیں وہاں بھی وصیت کا حق بہر حال

تسلیم کیا جاتا ہے اس لیے ان ممالک کے مسلمان شہریوں کے لیے لازم ہے کہ وہ شرعی قانون کے مطابق وصیت تیار کروائیں تا کہ ان کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء کو شریعت کے مطابق اپنا حصہ مل سکے اور وہ اپنے شرعی فرض سے سبکدوش ہو سکیں۔

وصیت:

(346) یہ ذکر آ چکا ہے کہ وصیت کے ذریعے وراثت کے صرف تیسرے حصے کی تخصیص ممکن ہے جو ان لوگوں کے لیے کی جا سکتی ہے۔ جو قرض خواہوں اور شرعی ورثاء کے سوا ہوں۔ اس قانون کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں۔

(1) اسلامی قانون وراثت کے مطابق جن عزیزوں کو میراث سے حصہ نہیں ملتا ان میں جس کو یا جس جس کو وہ شخص مدد کا مستحق پاتا ہو اس کے لیے اپنے اختیار سے حصہ مقرر کر دے (مثلاً کوئی یتیم پوتا یا پوتی یا کسی بیٹے کی بیوی یا کوئی بیٹی، بہن یا بھاوج یا بھانجا، بھتیجا یا کوئی اور عزیز جو مدد کا محتاج ہو یا عمومی تحقیق یا رفاہ عامہ کے لیے)۔

(2) وصیت کے قانون کا دوسرا مقصد یہ بھی ہے کہ دولت اور مال کے چند ہاتھوں میں ارتکاز کو روکا جائے۔ اور ایسی صورت ممکن ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی وصیت میں کسی ایک شخص کو اپنی ساری جائیداد کا مالک بنا دے اور دوسرے تمام قریبی رشتہ داروں کو محروم کر دے۔ اسلام کا منشاء یہ ہے کہ دولت کی گردش زیادہ سے زیادہ ہاتھوں میں ہو جس میں خاندان کی فلاح کے پہلو کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔

سرکاری محاصل:

(347) ایک فرد پر معاشرے اور ریاست کے حوالے سے بھی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں یعنی جس طرح ایک بڑے خاندان کے ایک رکن پر عائد ہو سکتی ہیں۔ وہ ٹیکس ادا کرتا ہے جنہیں حکومت شہریوں کی اجتماعی فلاح و بہبود اور مفاد میں خرچ کرتی ہے۔

(348) ٹیکسوں کی شرح آمدنی کے مختلف ذرائع کے مطابق کم و بیش ہو سکتی ہے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن نے جس نے بجٹ اخراجات کے بارے میں واضح ہدایات دی ہیں، ریاست کی آمدنی کے بارے میں نہ تو کوئی قواعد و ضوابط بنائے اور نہ ہی شرح کا تعین کیا ہے۔

جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلفاء کے اس حوالے سے طرز عمل اور معمولات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس معاملے پر قرآن کی خاموشی کا مقصد یہ ہے کہ حکومت کو یہ اختیار حاصل رہے کہ عوام کے مفاد میں صورتحال کے مطابق ٹیکسوں کی شرح میں کمی و بیشی کی جا سکتی ہے۔

(349) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مسعود میں زرعی ٹیکس نافذ تھا اور کاشتکار پیداوار کا دس فیصد حکومت کے حوالے کرتے تھے۔ بشرطیکہ پیداوار چھوٹ کی حد سے زیادہ ہوتی اور ذریعہ آبپاشی بارش یا پھر چشمہ کا پانی ہوتا اور اگر کنویں کے پانی سے آبپاشی ہوتی تو پھر پیداوار کا 20 واں حصہ ٹیکس ریاست کے سپرد کرنا پڑتا تھا۔ تجارت اور کانکنی سے ہونے والی آمدنی پر اڑھائی فیصد کی شرح سے ٹیکس وصول کیا جاتا۔ بیرون ملک سے آنے والے تجارتی قافلوں سے درآمدی ڈیوٹی وصول کی جاتی تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اس کی شرح 10 فیصد تھی (سامان کا 10 واں حصہ) تاہم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں بعض اشیاء خوردنی پر کسٹم ڈیوٹی کی یہ شرح گھٹا کر اس سے نصف کر دی۔ (روایت ابوعبید) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اقدام سے اسلام کے اس بارے میں اصول پر واضح روشنی پڑتی ہے۔ اس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں سرکاری چراگاہوں پر پلنے والے اونٹوں، بکریوں اور بھیڑوں اور بیلوں کے ریوڑوں پر بھی ٹیکس لگتا تھا تاہم ایک مخصوص تعداد تک ٹیکس کی چھوٹ بھی تھی جبکہ باربرداری، ہل چلانے اور کنوؤں سے پانی کھینچنے والے جانور بھی ٹیکس سے مستثنیٰ تھے۔

(350) ہر قسم کے اخراجات کے بعد بچ رہنے والی رقوم کے علاوہ سونے اور چاندی پر اڑھائی فیصد ٹیکس عائد تھا۔ اس سے لوگوں کو اپنا مال بڑھانے کی ترغیب ملتی تھی کہ وہ ذخیرہ اندوزی کی بجائے تجارت کر کے منافع کمائیں۔

ریاست کے سرکاری اخراجات:

(351) قرآن مجید نے اسلام میں ریاست کے سرکاری اخراجات کی مدات کے اصولوں کا تعین کر دیا ہے:

"صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنوں کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد

کرانے میں اور قرض داروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہیے، یہ حقوق) اللہ کی طرف سے مقرر کردیئے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا ہے۔" (60:9)

اخراجات کی ان آٹھ مدوں میں تمام اجتماعی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں۔ ان کی وضاحت سے ان کے دائرہ عمل اور استعمال کا بہتر ادراک ہو سکے گا۔

(352) صدقات کی اصطلاح سے مراد جس کا ترجمہ "مسلمانوں پر ریاستی ٹیکس" کیا جاتا ہے اور جو زکوٰۃ کے ہم معنی ہیں وہ تمام ٹیکس ہیں جو مسلمان معمول کے حالات میں اپنی حکومت کو ادا کرتے ہیں۔ یعنی زراعت، کانکنی، تجارت، صنعت، چراگاہوں پر پلنے والے ریوڑ، بچتیں اور اسی طرح دوسری مدات، ان میں وہ عبوری ٹیکس شامل نہیں، جو مخصوص حالات میں عائد کیے جاتے ہیں اور اپنے غیر مسلم شہریوں یا غیر ملکیوں پر لاگو ٹیکس بھی ان کے علاوہ ہیں۔ اس کے علاوہ رضا کارانہ عطیات کی مد بھی ہے۔ احادیث اور دور اول کی فقہی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات بغیر کسی شک وشبے کے ثابت ہو جاتی ہے کہ صدقات کا یہی مفہوم ہے۔ اس سے خیرات ہرگز مراد نہیں ہے، جو نہ تو رضا کارانہ ہے اور نہ ہی اس کی شرح متعین کی گئی ہے۔ خیرات یعنی اللہ کے راستے میں رضا کارانہ یا حصول ثواب کے لیے اخراجات کے لیے قرآن مجید میں لفظ "انفاق فی سبیل اللّٰہ" ہے۔

(353) ضرورت مندوں کے پہلے دو درجوں یعنی فقرا اور مساکین کی جو کم و بیش ہم معنیٰ ہیں، وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمائی۔ اس مسئلے پر کچھ اختلاف رائے بھی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فرامین اور آپ کے معمول کے مطابق (بہ روایت امام ابو یوسف "کتاب الخراج"، ابن ابی شیبہ، مصنف) فقرا سے مراد غریب مسلمان اور مساکین سے مراد اسلامی حکومت کے نادار غیر مسلم شہری ہیں مثلاً یہود، بلاذری نے "فتوح البلدان" میں خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک اور روایت کا تذکرہ کیا ہے جب انہوں نے جبیبیہ (شام) کے نادار مسیحیوں کے لیے صدقات یعنی زکوٰۃ کے محاصل میں وظیفہ مقرر کر دیا۔ شافعیؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ دونوں اصطلاحات بالکل ہم معنیٰ ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کرم و رحمت کے باعث ان کا دوبار

تذکرہ کردیا تاکہ زیادہ مال اس مد میں فراہم ہوسکے۔ شافعیؒ کی اس توجیہہ کی رو سے قرآن میں مذکور اخراجات کی آٹھ مدات میں سے ہر ایک کو ریاستی آمدن کا آٹھواں حصہ ملے گا، مگر ضرورت مند لوگ دو مدات کی رقوم حاصل کرسکیں گے۔ مگر کچھ بھی ہو ریاست کی پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائے کہ اسلامی مملکت میں کوئی بھی شہری بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہے۔ جن میں خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ شامل ہیں۔

(354) اگلی مد سرکاری اہلکاروں یعنی محاصل کے جمع کرنے والوں، دفتری عملہ، سرکاری اخراجات کے نگران، محاسب وغیرہ کی تنخواہوں کی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس درجہ میں تمام انتظامیہ بشمول سول، فوجی اور سفارتی ملازمین آجاتے ہیں۔ بلاذری نے اپنی کتاب ''الانساب'' میں ایک دستاویز محفوظ کی جو خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گورنر شام کے نام ایک خط تھا جس میں انہیں ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کسی ماہر یونانی حساب دان کی خدمات مدینہ کو فراہم کریں جو محاصل کا ریکارڈ مرتب کرے۔

اس روایت کے بعد اس امر کو مسلمہ تصور کیا جانا چاہیے کہ غیر مسلموں کو نہ صرف اسلامی حکومت میں ملازم رکھا جاسکتا ہے بلکہ صدقات میں انہیں تنخواہ بھی دی جاسکتی ہے جو صرف مسلمانوں پر عائد ٹیکس ہے۔

(355) ''جن لوگوں کے دل مائل کیے جانے مطلوب ہوں'' کے درجہ میں آنے والے لوگوں کو آج کی اصطلاح میں ''سیکرٹ فنڈ'' کے حوالے سے آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔ ابویعلیٰ الفرا نے اپنی تحقیق ''احکام السلطانیہ'' میں لکھا ہے: ''جن لوگوں کے دل مائل کیے جانے مطلوب ہوں'' کے درجہ میں چار قسم کے لوگ آتے ہیں:

(1) مسلمانوں کی عملی مدد کے لیے جن کی ہمدردیاں حاصل کی جاسکیں ان پر اس مد سے رقم خرچ ہوسکتی ہے۔

(2) مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں لوگوں کو اس سے باز رکھنے کے لیے۔

(3) قبول اسلام کی طرف راغب کرنے کے لیے۔

(4) جن کے ذریعے ان کے اہل خانہ اور خاندان کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی جاسکے۔ ان تمام لوگوں پر اس مد سے رقوم خرچ کی جاسکتی ہیں چاہے وہ غیر مسلم ہوں یا مشرک۔

(356) ''گردنیں چھڑانے'' یا غلام آزاد کرانے کے حوالے سے ہمیشہ دو ہی قسم کے اخراجات سمجھے گئے ہیں:

(1) غلاموں کو خرید کر آزاد کر دینا۔

(2) دشمن کے قبضہ سے اپنے جنگی قیدی چھڑوانے کے لیے تاوان یا معاوضہ ادا کرنا۔

قانون شریعت کے مطابق (قرآن 33:24) ہر غلام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مالک کو اپنی قیمت دے کر آزادی حاصل کر سکتا ہے اور یہ رقم جمع کرنے کے لیے وہ اپنے مالک سے کہہ سکتا ہے کہ اسے کام کرنے کے لیے سہولت فراہم کی جائے۔ اس کے علاوہ ابھی ہم نے دیکھا کہ اسلامی مملکت کے بجٹ میں ہر سال غلام آزاد کرانے کے لیے رقم مخصوص کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور ایسا کرنا حکومت پر فرض ہے۔ اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور کی ایک دستاویز (روایت ابن سعد) کے مطابق اس رقم کو ریاست اپنے غیر مسلم قیدی بھی چھڑوانے کے لیے خرچ کر سکتی ہے۔

(357) ''مقروضوں کے قرض ادا کرنے'' کے درجہ کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ ادوار اولیٰ میں سیلاب، زلزلہ اور دوسری آفات ارضی وسماوی کے متاثرین کی بھی مدد اس مد سے کی جاتی ہے اور اس میں غریبوں کا حوالہ نہیں دیا گیا کیونکہ ان کا ذکر پہلے آ چکا ہے بلکہ مالی طور پر خوشحال لوگ بھی شامل تھے جو مخصوص حالات کا نشانہ بن جاتے تھے۔ خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سرکاری خزانے سے ایک خصوصی فنڈ قائم کیا تھا جس سے عارضی ضرورت مندوں کو مناسب ضمانت کے عوض سود سے پاک قرضے فراہم کئے جاتے تھے، کیونکہ اسلام میں سود کی ممانعت کے بعد سود سے پاک قرضے فراہم کرنا ایک طرح سے حکومت کی ہی ذمہ داری بن چکا تھا۔ خلیفہؓ بھی اپنی ذاتی ضرورت کے لیے اس فنڈ سے استفادہ کرتے تھے۔ خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے دور میں سرکاری خزانے سے تاجروں کو مخصوص مدت کے لیے قرضے دیئے جاتے تھے اور پھر ریاست شرح منافع سے ایک حصہ وصول کرتی تھی تاہم یہ حصہ داری نقصان میں بھی ہوتی تھی اس مد سے ایک اور مقصد پر بھی رقم خرچ کی جاتی تھی جو ایک طرح کا ''سماجی بیمہ'' تھا۔ بعض اوقات سہواً کوئی شخص ارتکاب قتل کا جرم کر بیٹھتا مگر غربت کے باعث خون بہا ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہوتا تو ریاست اس کی مدد کو پہنچتی۔ ایسے کئی واقعات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بھی ہوئے جن کا تذکرہ بعد میں الگ سے ہوگا۔

(358) ''اللہ کی راہ میں خرچ'' کی اصطلاح سے مراد بظاہر دفاع بشمول فوج کی افرادی قوت اور سامان حرب پر ہونے والے اخراجات ہیں لیکن اس اصطلاح کا اطلاق تمام فلاحی کاموں مثلاً طالب علموں کی مدد اور مذہبی مقاصد مثلاً مساجد کی تعمیر وغیرہ پر ہونے والے اخراجات پر بھی ہوتا ہے۔

(359) اس آخری مد کے دائرہ عمل میں مواصلات اور وسیع تر معنوں میں سیاحت کے سفر، پلوں، سڑکوں، ریستورانوں، راستوں کی حفاظت (بشمول پولیس) صحت عامہ کے انتظامات، پبلک ٹرانسپورٹ اور دوسرے ملک یا شہر سے آنے والوں کو سہولتوں کی مفت فراہمی پر ہونے والے اخراجات بھی شامل ہیں۔ عام طور پر مفت کی یہ سہولت تین روز کے لیے فراہم کی جاتی تھی۔

(360) ان قرآنی ہدایات کی افادیت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ بات یاد رہے کہ یہ 14 سو سال پہلے اسلام کے آغاز کا زمانہ تھا لیکن ان مدات میں کوئی اضافہ کئے بغیر یہ آج بھی ایک ترقی پسند اور فلاحی ریاست کے لیے قابل عمل ہیں۔ جو اپنے شہریوں کی فلاح و بہبود کے لیے فکر مند ہو۔

اضافی ٹیکس:

(361) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین کے ادوار میں صدقات ہی واحد سرکاری ٹیکس تھا، بعد میں غیر معمولی حالات پیدا ہونے کی صورت میں فقہاء نے اضافی ٹیکس کے قانونی جواز کو تسلیم کیا ہے تاہم اس کی حیثیت محض عارضی اور وقتی ہوگی اور ایسا صرف ہنگامی صورتحال میں ہی جائز ہوگا۔ اس قسم کے ٹیکس کو نوائب (ناگہانی آفات) کہا جاتا تھا۔

سماجی تحفظ کی ضمانت:

(362) بھاری نقصان کے خدشات ہی سماجی تحفظ کی ضمانت (بیمہ) کی ضرورت کی بنیاد بنتے ہیں اور وقت اور معاشرتی حالات کے تقاضوں کے مطابق اس کی شکل تبدیل ہوتی رہی۔ ظہور اسلام کے وقت عربوں میں چھوٹی چھوٹی بیماریاں ناپید تھیں اور علاج پر ہونے والے اخراجات عملاً نہ ہونے کے برابر تھے۔ عام آدمی اپنا گھر خود تعمیر کر لیتا تھا اور بیشتر تعمیراتی سامان بلا قیمت میسر تھا۔ اس لیے یہ بات آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے کہ ان ایام میں بیماری، آتشزدگی وغیرہ کے نقصانات کے ازالہ کے لیے تحفظ کے نظام (بیمہ) کی ضرورت کیوں محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس غلامی اور قتل کے خلاف تحفظ ایک حقیقی ضرورت تھا۔

قبل ازیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت میں اس معاملے نے توجہ مبذول کرائی تھی اور اس حوالے سے کچھ پیش رفت ہوئی تھی جس میں حالات کے مطابق ردوبدل کی بھی گنجائش تھی۔ اس طرح ہجرت کے بعد ریاست مدینہ قائم ہوئی جس کے آئین میں یہ نظام معاقل کے نام سے مذکور ہے۔ اس کا طریقہ کار اس طرح تھا: اگر کوئی فرد دشمن کے پاس جنگی قیدی بن جاتا تھا تو اسے چھڑوانے کے لیے وسائل کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس طرح جسمانی گزند اور قابل مواخذہ قتل کے بدلے میں معاوضہ اور دیت کی ادائیگی کے لیے رقم درکار ہوتی جو اکثر اوقات ملوث شخص، قیدی یا مجرم کے وسائل سے زیادہ ہوتی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دوسرے سے تعاون کی بنیاد پر ''بیمہ'' کا ایک نظام قائم کیا۔ اس نظام میں ایک قبیلے کے ارکان اپنے مرکزی خزانے پر انحصار کرتے تھے جس میں ہر فرد اپنے وسائل کے مطابق حصہ ڈالتا تھا تاہم اگر کسی قبیلے کے وسائل ناکافی ہوتے تو ہمسایہ یا تعلقدار قبیلہ اس کی مدد کرنے کا ذمہ دار تھا۔ اس نظام میں مہاجرین، انصار، حبشی یا عرب کے دوسرے علاقوں سے آ کر مدینہ آباد ہونے والوں کو ایک نئے سماجی نظام میں پرو دیا گیا، جس کے مطابق مہاجرین اپنی سابقہ روایت کے مطابق آپس میں دیت کی ادائیگی کریں گے اور انصار کے تمام قبائل اپنی سابقہ حالت کے مطابق باہم دیت دیں گے اور ان کا ہر گروہ معروف طریقے پر اہل ایمان کے درمیان انصاف کے ساتھ اپنے قیدی کا فدیہ ادا کرے گا۔

(363) بعد میں خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں اس نظام کو پیشوں یعنی سول اور فوجی انتظامیہ یا پھر مختلف خطوں کی بنیاد پر قائم کر دیا گیا، جب بھی ضرورت ہوتی مرکزی یا صوبائی حکومت ان اکائیوں کی مدد کو آ جاتی۔ جس کا ذکر ریاستی اخراجات کے ضمن میں پہلے آ چکا ہے۔

(364) معاشرتی بیمہ کے اس نظام کا بنیادی مقصد کسی فرد کے بوجھ کو زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم کرنا تھا تاکہ انفرادی بوجھ کو ہلکا کیا جا سکے اور اس مقصد کے لیے بیمہ کی سرمایہ دارانہ کمپنیوں کی بجائے اسلام نے ایک دوسرے کی مدد اور باہم تعاون کی بنیاد پر ایک نظام قائم کیا جسے درجہ بدرجہ یونٹوں کی اعانت حاصل تھی اور جو اوپر جا کر مرکزی حکومت پر ختم ہوتا تھا۔

(365) ان یونٹوں کو یہ اختیار تھا کہ وہ اپنے خزانے کی غیر استعمال شدہ رقوم کو تجارتی مقاصد کے لیے استعمال کر کے مزید فنڈ جمع کر لیں اور بعض اوقات اس طریقے سے اتنا سرمایہ اکٹھا ہو جاتا کہ ارکان کو نہ صرف اپنا حصہ ادا کرنے کی ضرورت ہی نہ رہتی بلکہ بعض اوقات انہیں اس میں سے

منافع بھی ادا کیا جاتا۔ باہمی تعاون اور امداد سے قائم یہ اکائیاں ٹریفک حادثات، آتشزدگی کے نتیجے میں عارضی قیام کے دوران کسی نقصان کی صورت میں ازالہ کا اہتمام کرتی تھیں۔

(366) تکنیکی تفصیلات میں جائے بغیر یہ وضاحت ضروری ہے کہ اسلام میں سرمایہ دارانہ بیمہ کی اجازت نہیں جس میں بیمہ شدہ شخص کمپنی کے منافع میں اس تناسب سے شریک نہیں ہوتا جتنی وہ ادائیگی کرتا ہے کیونکہ اس قسم کا بیمہ ایک قسم کا ''چانس کا کھیل'' بن جاتا ہے۔

(367) برسبیل تذکرہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں قائم ہونے والے ایک اور سماجی ادارے کا بھی بیان ہو جائے۔ انہوں نے ملک بھر کے تمام شہریوں کے لیے ایک پنشن سکیم شروع کی تھی اور ابن زنجویہ کی کتاب الاموال اور الجاحز کے رسالہ العثمانیہ کے مطابق غیر مسلم شہری بھی اس وظیفہ کے حقدار تھے۔ بلکہ یہاں تک کہ بچہ کے پیدا ہوتے ہی بیت المال سے اس کے لیے وظیفہ جاری ہو جاتا تھا۔ نابالغوں کو جو وظیفہ ملتا تھا اس کی مالیت اتنی تھی کہ اس سے اس کی کم از کم ضروریات پوری ہو جاتی تھیں۔ اس سکیم کے آغاز کے وقت شہریوں کی درجہ بندی کی گئی اور اگر ایک شہری کو ایک (دینار یا درہم) ملتا تھا تو بعض شہریوں کو 40 (دینار یا درہم) ملتے تھے (شائد افراد خانہ کی تعداد اس فرق کا باعث ہو۔ مترجم) تاہم شہادت سے کچھ عرصہ قبل انہوں نے یہ معمول ترک کر کے سب کے وظائف یکساں کر دینے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر اچانک انتقال کے باعث اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ مل سکا۔ ایسے شواہد بھی ہیں کہ یہ نظام جسے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دیوان کا نام دیا تھا، دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقت سے ہی شروع تھا۔ اس حوالے سے ایک روایت پیش ہے:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محمیہ بن جاز کو بنو مصطلق سے حاصل ہونے والے مال غنیمت میں سے سرکاری خمس کا انچارج مقرر کیا تھا۔ محمیہ دراصل مختلف مہمات سے حاصل ہونے والے مال غنیمت کے خمس کے انچارج تھے۔ صدقات (زکوۃ ٹیکس) کا نظم ونسق الگ تھا اور اس کے علیحدہ اہلکار تھے۔ دشمن سے امن کے معاہدوں کے تحت حاصل ہونے والے محاصل (فے) کی انتظامیہ بھی الگ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صدقات کو یتیموں،

ناداروں اور کمزور معاشی حیثیت کے حامل لوگوں پر خرچ کرتے تھے۔ اگر یتیم بالغ ہو کر فوجی خدمات میں آ جاتا تو اسے صدقات کی فہرست سے نکال کر "فے" میں رکھ دیا جاتا۔ تاہم اگر وہ فوجی خدمات سے انکار کر دیتا تو اس کا وظیفہ بند کر کے اسے خود کمانے کے لیے کہہ دیا جاتا۔

(سرخسی، شرح سیر الکبیر)

پانسے کے کھیل:

(368) پانسے کے کھیلوں (جو، قسمت آزمائی وغیرہ) کی ممانعت کرتے ہوئے قرآن نے انہیں اعمال شیطان قرار دیا ہے۔ (90:5) اور اس کی معقول وجوہ ہیں: یہ امر مسلمہ ہے کہ بیشتر سماجی برائیوں کی جڑ قومی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم ہے۔ بعض لوگ اس کے نتیجے میں بہت امیر اور بعض بہت غریب ہو جاتے ہیں، جو عام طور پر طبقہ امراء کے استحصال کا نشانہ بنتے ہیں۔ لاٹریوں اور قسمت آزمائی کے دوسرے طریقوں سے راتوں رات امیر ہو جانا بہت سحر انگیز ہے مگر بغیر محنت کے جو پیسہ ہاتھ آتا ہے اس کے نتائج معاشرے کے لیے برے نکلتے ہیں۔ مثلاً گھڑ دوڑوں (ریس) اور لاٹریوں کے ذریعے جیت کر ایک ملک کے لوگ ہفتے میں 3 کروڑ پاؤنڈ خرچ کرتے ہیں جیسا کہ بعض ممالک کا معمول ہے۔ اس طرح گویا 10 سال کے عرصے میں ایک ارب، 56 کروڑ پاؤنڈز کی خطیر رقم شہریوں کی ایک کثیر تعداد کے ہاتھوں سے نکل کر جیتنے والے چند لوگوں کو منتقل ہو جائے گی۔ یعنی یہ عملاً 99 فیصد لوگوں کو محروم کر کے ایک فیصد کو نوازے جانے کی صورت ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک فیصد لکھ پتی پیدا کرنے کے لیے بڑے منظم طریقے سے 99 فیصد کو تباہ کیا جا رہا ہے۔ چاہے یہ لاٹری سکیمیں سرکاری ہوں یا پرائیویٹ، دولت کو اکثریت سے چھین کر چند ہاتھوں میں مرتکز کرنے کا کام زور و شور سے جاری ہے۔ انہی قباحتوں کے باعث پانسے کے کھیلوں یعنی قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات وغیرہ دینے، جوا اور لاٹری کی اسلام میں ممانعت کی گئی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کی انشورنس سکیموں میں صرف یکطرفہ رسک کو ہی سامنے رکھا جاتا ہے۔

سودی قرضے:

(369) دنیا میں شاید کوئی بھی مذہب ایسا نہیں جس نے سود کی ممانعت نہ کی ہو۔ اسلام کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے صرف اس کی ممانعت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انسانی معاشرے میں اس لعنت کو جنم دینے والے حالات کی اصلاح کا نظام بھی پیش کیا ہے۔

(370) کوئی بھی قرضے پر سود خوشی سے ادا نہیں کرتا۔ وہ یہ ادائیگی مجبوراً کرتا ہے کیونکہ اسے رقم کی ضرورت پڑتی ہے اور سود سے پاک سرمایہ حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ میسر نہیں آتا۔

(371) اسلام نے تجارتی منافع اور قرضوں پر سود کے مابین واضح خط امتیاز کھینچ دیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''...... اور نفع (تجارت) کو اس نے حلال کیا اور سود کو حرام ......''

(275:2)

اس کے بعد دوسری آیت (279:2) میں ارشاد ہے:

''اگر ایسا نہ کرو گے (سود فوری ترک نہ کرو گے) تو خبردار ہو جاؤ (کہ تم) اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے کے لیے (تیار ہوتے ہو) اور اگر توبہ کرلو گے (اور سود چھوڑ دو گے) تو تم کو اپنی اصلی رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان اور نہ تمہارا نقصان۔''

(372) سود کی ممانعت کی بنیاد بھی اس میں رسک کا یکطرفہ ہونا ہے کیونکہ جب کوئی کاروباری منافع کمانے کی غرض سے قرض حاصل کرتا ہے تو عین ممکن ہے کہ کاروباری حالات اتنے سازگار نہ رہیں اور وہ اتنا منافع نہ کما سکے کہ قرض بمعہ سود لوٹا سکے مگر قرض خواہ تو بہر صورت طے شدہ سود وصول کرنے پر مصر ہوتا ہے گویا وہ صرف منافع میں حصہ دار ہے، نقصان میں نہیں۔

(373) کسی بھی فرد کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنی رقم بلا سود قرضے دے کر ضائع کرنے کا خطرہ مول لے۔ اوپر ذکر آ چکا ہے کہ اسلام نے حکم دیا ہے کہ سرکاری محاصل کا ایک حصہ بھاری قرضے کے بوجھ تلے دبے لوگوں کو آزاد کرنے میں صرف کیا جائے۔ اس طرح سرکاری خزانے سے لوگوں کو سود سے پاک قرضے دینے کا راستہ نکالا گیا ہے اور اس کے برعکس اسی مد سے ایسے مخیّر حضرات اور تنظیموں کو رقم بھی فراہم کی جائے جو ضرورت مندوں کو قرضے فراہم

کرتے ہوں یا انہیں قرضے کے بوجھ سے نجات دلانے کے لیے کام کر رہے ہوں، یہ تعاون اور امداد باہمی کی صورت ہے۔

(374) تجارتی قرضوں کے معاملے میں مضاربہ کا نظام موجود ہے جس میں قرض دینے والا نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے۔ مثلاً دو افراد مل کر ایک کمپنی بناتے ہیں اور اگر دونوں سرمایہ اور محنت میں برابر کے حصہ دار ہیں تو منافع کی تقسیم مشکل نہیں، تاہم اگر ایک فریق سرمایہ اور دوسرا محنت فراہم کرے یا دونوں فریق سرمایہ تو فراہم کریں مگر کاروبار کو صرف ایک فریق سنبھالے یعنی دونوں فریق کسی نہ کسی طور برابر کے حصہ دار نہ ہوں تو اس صورت میں منافع کی تقسیم پہلے سے طے شدہ شرائط کے تحت ہوتی ہے جس میں بہر حال نقصان سے بچنے کے لیے تمام تر ممکنہ احتیاطیں ملحوظ رکھی جاتی ہیں تاہم اسلام کا تقاضا ہے کہ ایسے کاروبار میں جس کی نوعیت معاہداتی ہو اس میں تمام فریق نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہونے چاہئیں۔

(375) جہاں تک بینکوں کا تعلق ہے ان کی سرگرمیاں بنیادی طور پر تین طرح کی ہوتی ہیں۔ بینک اپنے کھاتہ داروں کی رقوم کے تحفظ کو یقینی بنا کر سرمایہ کا لین دین کرتے ہیں، دوسروں کو رقوم صرف منافع پر قرض دیتے ہیں۔ اخراجات ان افراد کو برداشت کرنا پڑتے ہیں جو بینک کی سہولتیں استعمال کرتے ہیں، جبکہ تجارت، صنعت اور دوسرے کاروباری مقاصد کے لیے قرضوں کا معاملہ یہ ہے کہ اگر بینک قرض داروں کے منافع کے ساتھ نقصان کے خطرات میں بھی شریک ہو تو اسلام ایسی بینکنگ کی اجازت دیتا ہے ورنہ نہیں۔

(376) اعتماد سے اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ اگر حکومت کے سیونگ بینک سال کے شروع کی بجائے آخر پر اعلان کریں کہ وہ کھاتہ داروں کو فلاں شرح سے منافع دینے کے قابل ہیں تو ایسا کرنا اسلام کی رو سے جائز ہے۔ جب یہ روایت شروع ہو جائے گی تو عام لوگوں کو پہلے سے شرح منافع کا تعین نہ ہونے کے باوجود رقوم جمع کرانے میں تامل نہ ہوگا کیونکہ لوگ سرکاری مالیاتی اداروں پر اعتماد کرتے ہیں۔

اعداد و شمار:

(378) ہر قسم کی منصوبہ بندی میں دستیاب وسائل کا اندازہ ہونا ضروری ہے۔ بخاری کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں مسلمانوں کی مردم شماری کروائی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں مویشیوں، پھل دار درختوں اور دوسرے

مال واسباب کا شمار کروایا، اور نئے مفتوحہ صوبوں میں قابل کاشت زمینوں کی پیمائش کروائی گئی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عام شہریوں کی فلاح و بہبود کا اس قدر خیال تھا کہ مختلف صوبوں سے محاصل کی وصولی کے بعد آپؓ وہاں کے ہر شعبہ کے نمائندہ افراد کو دارالحکومت مدعو کرتے تاکہ یہ جان سکیں کہ آیا محاصل جمع کرنے والوں اور دیگر حکام کے رویہ سے انہیں کوئی شکایت تو نہیں؟

روزمرہ کی زندگی:

(379) اس موضوع پر مختصراً اظہار خیال کے اختتام سے قبل قابل ذکر اہمیت کے دو ممانعات کا ذکر ضروری ہے۔ جو درحقیقت ایک مسلمان کی روزمرہ زندگی کی حقیقی تصویر کو سامنے لاتی ہیں اور یہ دو اشیاء ہیں پانسے کا کھیل، یعنی لاٹریاں وغیرہ اور نشہ آور مشروبات، قسمت آزمائی کے چکر میں لوگ سارا سال بار بار رقمیں ضائع کرتے رہتے ہیں لیکن ان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا جب کہ اس چکر میں پہلے سے غریب لوگ مزید مالی بدحالی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جہاں تک نشہ آور مشروبات کا تعلق ہے تو اس کے کم مقدار میں استعمال سے طبیعت میں فرحت پیدا ہوتی ہے مگر مزید نہ پینے کا عزم کمزور ہو جاتا ہے جب کہ زیادہ پینے والے کو اپنے افعال پر کوئی کنٹرول نہیں رہتا اور وہ رقم کو بلا سوچے سمجھے لٹانا شروع کر دیتا ہے جب کہ صحت پر جو خراب اثرات مرتب ہوتے ہیں وہ آگے بچوں کو بھی منتقل ہو جاتے ہیں۔ قرآن میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں آیا ہے:

> ”(اے پیغمبر!) لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں،
> کہہ دو کہ ان میں نقصان بڑے ہیں اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی
> ہیں مگر ان کے نقصان فائدوں سے کہیں زیادہ ہیں۔“ (219:2)

قرآن نے الکوحل کے استعمال کے فوائد سے انکار نہیں کیا مگر اس کے باوجود اسے معاشرے، اس کی اپنی ذات حتیٰ کہ خود اللہ تعالیٰ کے خلاف گناہ قرار دیا ہے۔ ایک اور آیت میں (90:5) اسے بت پرستی کے مترادف اور کار شیطان قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اگر کوئی چاہتا ہے کہ وہ اس دنیا میں بھی خوش رہے اور دوسری دنیا میں بھی تو اسے چاہیے کہ وہ شراب اور جواء سے دور رہے۔

باب نمبر 11

مسلمان عورت

اسلام میں عورت کے بنیادی حقوق اور فرائض کا مطالعہ کرتے وقت ابتداء میں ہی اس امر کی نشاندہی ہو جانی چاہیے کہ اسلامی قانون میں حالات کے تقاضوں کے مطابق ڈھل جانے کی گنجائش ہونے کے باوجود عورت کی اس بے مہار آزادی کا اسلام میں کوئی تصور نہیں جس کا اظہار آج مغرب کے معاشروں میں ہو رہا ہے۔ اسلام عورت کو ایک اوسط درجے کے طرز عمل کے ساتھ زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے وہ اس سے فرشتہ بن جانے کا تقاضا کرتا ہے نہ ہی شیطان کی راہ اختیار کرنے کو قبول کرتا ہے۔ اسلام میں عورت کے مقام کا دوسری تہذیبوں یا نظاموں میں اسے حاصل حیثیت سے تقابل کرتے وقت تمام متعلقہ حقائق پیش نظر رکھنے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ اس کی اِکا دُکا روایات اور معمولات کو ہی موضوع بحث بنالیا جائے۔ درحقیقت اخلاقیات کے بعض پہلوؤں کے حوالے سے اسلام آج کے بعض دوسرے نظاموں کے مقابلے میں بے لچک اور روایت پسند ہے۔

عمومی صورت حال:

(381) اسلام میں ماں کو بلند درجہ عطا کیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں تک فرمایا ہے کہ: "جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے" بخاریؒ کی روایت ہے کہ کسی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ وہ کون سا عمل ہے جو خدا کی سب سے زیادہ خوشنودی کا باعث بنتا ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نماز مقررہ وقت پر ادا کرنا۔"

"اور اس کے بعد؟" (کون سا عمل اللہ کو محبوب ہے)

"اپنے ماں باپ سے حسن سلوک کرنا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قرآن مجید میں متعدد بار یہ ذکر آیا ہے اور انسان کو یاد دلایا گیا کہ اسے اس کی ماں نے اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے۔ اور اس عمل کے دوران بڑی تکالیف برداشت کی ہیں اور دن رات محبت اور قربانیوں سے اسے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔

(382) جہاں تک عورت کے بحیثیت بیوی ہونے کا تعلق ہے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے:

"تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہے۔" حج الوداع کے موقع پر اپنے خطبہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کا ذکر تفصیل سے فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ملاحظہ ہو:

"ہاں: عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کیونکہ تم نے انہیں اللہ کی امانت کے ساتھ لیا ہے، اور اللہ کے حکم کے ذریعے حلال کیا ہے۔ ان کے حقوق تم پر ہیں اور تمہارے حقوق ان پر ہیں۔ ان پر تمہارا حق یہ ہے کہ وہ تمہارے بستر پر کسی دوسرے کو نہ آنے دیں اور نہ اپنے گھروں میں کسی ایسے شخص کو داخل ہونے کی اجازت دیں جن کی آمد تم کو پسند نہیں۔ انہیں بے حیائی کے کاموں کا ارتکاب نہیں کرنا چاہیے اگر وہ باز نہ آئیں تو پھر اللہ نے آپ کو (مردوں کو) حق دیا ہے کہ ان کی سرزنش کرو (اور پھر بھی باز نہ آئیں تو) ان کے بستر اپنے سے الگ کر دو (اور پھر بھی باز نہ رہیں تو) تو انہیں مار بھی سکتے ہو مگر ہلکی مار مارنا۔ اس کے بعد اگر وہ (اپنی حرکتوں سے) باز آجائیں اور تمہاری فرماں بردار بن جائیں تو پھر حسب دستور انہیں نان ونفقہ دو اور میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ عورتوں سے حسن سلوک کے ساتھ پیش آؤ۔ کیونکہ وہ گھروں میں تمہاری دست نگر ہیں اور ان کے پاس اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ گواہ رہنا کہ میں نے ان تک سب کچھ پہنچا دیا۔" (ابن ہشام)

(383) جہاں تک عورت کے بحیثیت بیٹی ہونے کا تعلق ہے اس حوالے سے اسلام کے رویہ کا اندازہ قرآن کی اس سرزنش سے لگایا جا سکتا ہے جو کافروں کو قبل از اسلام کے بیٹیوں سے ان کے سلوک پر کی گئی۔ قرآن کی سورہ النحل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور یہ لوگ اللہ کے لیے تو بیٹیاں تجویز کرتے ہیں (اور) وہ ان سے پاک ہے اور اپنے لیے (بیٹے) جو (دل پسند) ہیں۔"

''حالانکہ جب ان میں سے کسی کو بیٹی (کے پیدا ہونے) کی خبر ملتی ہے تو اس کا منہ (غم کے سبب) کالا پڑ جاتا ہے اور (اس کے دل کو دیکھو تو) وہ اندوہ ناک ہو جاتا ہے۔''

''اور اس خبر بد سے (جو وہ سنتا ہے) لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے (اور) سوچتا ہے کہ آیا ذلت برداشت کر کے لڑکی کو زندہ رہنے دے یا زمین میں گاڑ دے۔ دیکھو یہ جو تجویز کرتے ہیں بہت بری ہے۔'' (59-57:16)

قرآن مجید میں جگہ جگہ یاد دلایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کے جوڑے جوڑے پیدا کیے ہیں اور افزائش نسل کے لیے نر اور مادہ دونوں جنسوں کی موجودگی ضروری ہے جو اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ قرآن مجید کی سورۃ النسا میں ارشاد ہے:

''......مردوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے اور عورتوں کو ان کاموں کا ثواب ہے جو انہوں نے کیے۔......'' (32:4)

(384) فطرت کاملہ نے اس حکمت کے تحت کہ کوئی بھی تخلیق غیر ضروری یا فالتو محسوس نہ ہو، نر اور مادہ کو مکمل ایک جیسا نہیں بنایا بلکہ ان کے کردار و عمل کو باہم لازم و ملزوم کر دیا۔ مثلاً مرد کے لیے ممکن نہیں ہے کہ وہ بچے جنم دے سکے۔ اور اسی طرح مرد کے لیے مخصوص کردار عورت نہیں نبھا سکتی۔ اس کی جسمانی ساخت میں فطرت نے نازکی اور نزاکت بھر دی ہے اور اس کا دماغ اور ہڈیاں بھی ان اثرات سے مبرا نہیں۔ اس طرح اس کی دلچسپیاں اور معمولات ایسے ہوں گے جو اس کی جسمانی نزاکت کے تقاضے نبھا سکیں۔ مرد کو عورت کی نسبت مضبوط قویٰ کا حامل بنایا گیا ہے اور اسے حالات کے تلاطم اور تھپیڑوں سے بہتر طور پر نبرد آزما ہونے کی صلاحیت عطا کی گئی ہے۔ زندگی کے تمام معاملات مرد اور عورت میں اس طرح تقسیم کر دیے گئے ہیں کہ وہ ہر دو کی ضرورت اور صلاحیت کے مطابق ہیں۔

(385) مرد اور عورت میں بعض فطری امتیازات ضرور ہیں لیکن زندگی کے بہت سے معاملات میں وہ یکساں ہیں اس لیے ان معاملات میں ان کے حقوق اور فرائض بھی ایک جیسے ہیں۔

(386) اس طرح اس میں عورت کے بارے میں اسلامی تعلیمات کا بھی نچوڑ مل گیا ہے کہ بعض معاملات میں وہ مرد کے برابر ہے اور بعض میں نہیں۔ عورت کے حقوق اور ذمہ داریوں کے تفصیلی تذکرے سے اس کو بہتر انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

عورت کے فرائض:

(387) مذہبی معاملات میں اس کا اولین فرض اللہ کی وحدانیت پر ایمان رکھنا ہے اور یہی فرض مرد کا بھی ہے اور یہی آخرت میں نجات کا واحد راستہ ہے۔ یہ بات سب کے علم میں ہے کہ اسلام نے کسی کو بھی جبراً دین میں داخل کرنے کی باضابطہ ممانعت کی ہے اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ کسی مسلمان کی غیر مسلم بیوی کو اپنے مذہب پر کاربند رہنے اور اس کے مطابق عبادت کرنے کی مکمل آزادی ہے۔ جب کہ یہ بات بھی سب کے علم میں ہے کہ مسلمان کی زندگی ایک کڑے نظم وضبط کی متقاضی ہوتی ہے جس میں ارتداد قابل سزا جرم ہے تاہم خلافت راشدہ کے دوران ایسی مثالیں ہیں کہ عورتوں کے لیے مرتد ہونے کی سزا مردوں کی نسبت کم ہے۔

(388) جہاں تک عبادات کا تعلق ہے نماز مرد عورت پر یکساں فرض ہے مگر چند رعایتوں کے ساتھ، ماہانہ ایام (پیریڈز) میں عورت کو نماز کی ادائیگی سے استثناء حاصل ہے جبکہ نماز جمعہ مرد پر فرض اور عورت کے لیے اختیاری ہے کہ چاہے تو مسجد میں جا کر ادا کرے اور چاہے تو گھر کے اندر نماز ادا کرے۔ رمضان کے روزوں میں بھی اس پر بوجھ کم رکھا گیا ہے کہ ماہانہ پیریڈز اور بچے کی پیدائش کے دنوں میں اسے روزے مؤخر کر دینے کی اجازت ہے کہ معمول کے ایام میں وہ ان کی قضا ادا کر سکتی ہے۔ فریضہ حج کے بعض ارکان میں بھی اسے مخصوص نسوانی وجوہ کی بنیاد پر استثناء حاصل ہے۔ مختصراً یہ کہ اسلام عورت کے حوالے سے لچک دار اور نرم رویہ ظاہر کرتا ہے۔

اسلام کے چار بنیادی ارکان میں سے آخری یعنی ادائیگی زکوٰۃ میں دونوں برابر ہیں تاہم شافعی فقہ میں اسے قدرے رعایت دی جاتی ہے۔ زکوٰۃ سالانہ بچت پر عائد ہوتی ہے مگر عورت اس بچت سے اپنے ذاتی استعمال کے لیے زیورات خریدے تو اس پر زکوٰۃ کی چھوٹ حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اگرچہ اسلام دولت کی مسلسل گردش کی حوصلہ افزائی اور جمع کرنے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے حالانکہ جمع شدہ دولت پر ٹیکس (زکوٰۃ) کا فائدہ بھی ہے مگر وہ سرمایہ کی گردش کے حق میں ہے تاکہ اس میں اضافہ ہو اور لوگوں کو روزگار کے زیادہ مواقع حاصل ہوں تاہم عورت کے لیے نرم گوشے کے اظہار کے طور پر اور اس کے شوق کی تسکین کے لیے اسے سونے کی شکل میں سرمایہ جمع کرنے کی اجازت دی ہے۔

(389) کچھ سماجی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ قومی دولت کی منصفانہ تقسیم کے لیے ارتکاز دولت کا باعث بننے والے حربوں کی ممانعت کر دی گئی ہے مثلاً سود اور جوا وغیرہ۔ اس حوالے سے مسلمان عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں اور ان پابندیوں کا اطلاق دونوں پر ایک جیسا ہوگا۔ لاٹریاں اور ریس وغیرہ پر شرطیں لگانا معاشرے کے اقتصادی توازن کے لیے نقصان دہ ہے اس لیے یہ مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں ممنوع ہیں۔

(390) لامتناہی تباہی اور بدنصیبی کا ایک اور ذریعہ نشہ آور اشیاء ہیں اور یہ ہر مسلمان کا مسلمہ فرض ہے کہ ان خبائث سے اجتناب کرے۔ قرآن نے اسے کار شیطان قرار دیا ہے۔ (90:5) صحت، معاش اور اخلاق پر مرتب ہونے والے بد اثرات کے علاوہ بھی نشہ آور اشیاء کے بہت سے نقصانات ہیں جو سب کو معلوم ہیں۔ شراب کے عورتوں پر اثرات خاص طور پر دوررس ہیں۔ عورت اپنے بچے کو پیٹ میں خون سے پالتی ہے اور بعد از پیدائش اسے دودھ پلاتی ہے اور اس طرح اس کی صحت اور بیماری کے اثرات براہ راست بچے کو منتقل ہوتے ہیں گویا وہ اس حوالے سے اچھائی یا برائی نئی نسل کو اور انسانیت کے مستقبل کو منتقل کر رہی ہے۔

(391) ایک بہت جامع فرض اخلاقیات کا ہے۔ اگر اپنے خالق سے ہمارے تعلقات کے حوالے سے ہمارا فرض روحانیت ہے تو اخلاقیات کو بندوں کے باہمی تعلقات کے حوالے سے وہی مقام حاصل ہے۔ اسلام برائی کے سرچشموں کو ہدف بنانے کا حامی ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے بعض اقدامات بطور قانون لاگو کر دیئے جبکہ بعض اعمال کے بارے میں پسندیدگی کا اظہار کیا اور بعض کی حوصلہ افزائی کی جن کے اثرات بعض اوقات حیران کن ہوتے ہیں۔

زنا اور بدکاری کو تمام مذاہب جرم قرار دیتے ہیں مگر اسلام اس سے آگے جا کر ایسے اقدامات تجویز کرتا ہے جن سے اس کی ترغیب کے مواقع کم سے کم پیدا ہوتے ہیں۔ یہ تصور کر لینا یا امید رکھنا بہت آسان ہے کہ ہر کوئی اپنے اندر اخلاقی جذبہ اتنا قوی کرے کہ اس میں ترغیب کی مزاحمت کی قوت پیدا ہو جائے لیکن بہترین حکمت یہ ہے کہ ایسے مواقع ہی نہ پیدا ہونے دیئے جائیں جن میں کمزور کردار کے انسان جن کی کہ معاشرے میں اکثریت ہے ایک ایسی جنگ میں الجھ جائیں جس میں ہارنا گزیر ہوتی ہے۔

(392) قرآن میں عورتوں کو حکم دیا گیا ہے کہ (59:33) باہر نکلتے وقت ''جلابیب'' پہن لیا کرو (سر سے لے کر پاؤں تک عورت کے جسم کو چھپانے والا پہناوا، چوغہ، اوور آل)
مولانا فتح محمد جالندھری نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے:

''اے پیغمبر اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے (مونہوں) پر چادر لٹکا (کر گھونگھٹ نکال) لیا کریں۔......''

تاہم سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید شبیر احمد نے ترجمے میں یہ تخصیص نہیں کی کہ منہ کا گھونگھٹ نکال لیا کریں اور سیدھا ترجمہ کیا ہے کہ اپنے اوپر اپنی چادر کے پلو لٹکا لیا کریں مگر تشریح میں اصرار کیا ہے کہ اس سے مراد یہ تھی کہ غیر محرموں سے چہرے کو چھپایا جائے۔ مترجم)

اس پہناوے کا مقصد عورت کی کشش کو خبیث مردوں کی نظروں سے بچا کر انہیں ان کی بیمار ذہنیت سے محفوظ رکھنا ہے جس کی وضاحت اس آیت میں موجود ہے۔ پھر آیت نازل ہوئی (31-30:24) جو مردوں اور خواتین کے طرز عمل اور عورتوں کی گھر کی چار دیواری کے اندر کی زندگی کے بارے میں ہے:

''اے نبی، مومن مردوں سے کہو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں، یہ ان کے لیے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اس سے باخبر رہتا ہے۔''

''اور اے نبی، مومن عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں بچا کر رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنا بناؤ سنگھار نہ دکھائیں بجز اس کے جو خود ظاہر ہو جائے اور اپنے سینوں پر اپنی اوڑھنیوں کے آنچل ڈالے رہیں۔......''

(31-30:24۔ترجمہ تفہیم القرآن: ابوالاعلیٰ مودودی)

اسلام کی پوری تاریخ کے دوران جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پورا دور مسعود بھی شامل ہے مسلمان عورت ہر اس شعبے میں سرگرم رہی، جو اس کے لیے موزوں تھا، وہ نرس اور معلمہ کی حیثیت سے کام کرتی تھی حتیٰ کہ ضرورت کے وقت میدان جنگ میں مردوں کے شانہ بشانہ جوہر شجاعت بھی دکھاتی تھی۔ اس کے علاوہ مغنیہ خواتین اور آرائش گیسو کی ماہر (ہیئر ڈریسر) بھی تھیں۔

(ڈاکٹر صاحب کو وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ مغنیہ سے ان کی مراد کون سی خواتین ہیں کیونکہ مسلمان عورت کے بارے میں ایسا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اسے کھلے عام گلوکاری کا سرٹیفکیٹ حاصل ہے۔ یقیناً اس سے مراد گھریلو مجالس میں خواتین کا حمد و نعت یا ہلکے پھلکے رزمیہ یا روحانی گیت گانا ہوگا۔ مترجم)

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دور خلافت میں ایک خاتون شفاء بنت عبداللہ کو دارالحکومت مدینہ میں مارکیٹ انسپکٹر مقرر کیا تھا (روایت ابن حجر، اصابہ) اسی خاتون نے اُم المؤمنین حضرت حفصہؓ کو لکھنا پڑھنا بھی سکھایا تھا۔ فقہا خواتین کے عدالتوں میں جج مقرر کرنے کے امکان کو بھی تسلیم کرتے ہیں اور اس کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ مختصر یہ کہ ایک مسلمان معاشرے میں عورتوں کو بوجھ بننے کی بجائے مردوں کے ساتھ مل کر کمانے اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا حق حاصل ہے۔

(393) قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔۔۔۔۔۔" (21:30)

"۔۔۔۔۔۔ وہ (بیویاں) تمہاری پوشاک ہیں اور تم (شوہر) ان کی پوشاک ہو۔۔۔۔۔۔" (187:2)

اس لیے دونوں کو اپنے اپنے مفاد کے لیے دوسرے کے لیے اپنے دل میں جگہ پیدا کرنی چاہیے۔ دو افراد ایک دوسرے کے ساتھ سو فیصد معاملات میں متفق نہیں ہو سکتے لیکن گھر کے اندر خوشگوار اور مفاہمانہ ماحول کے لیے ایک دوسرے کے لیے درگزر کا رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ قرآن مجید میں عورتوں سے برتاؤ کے حوالے سے شوہروں کو جو مشورہ دیا گیا ہے وہ غور و فکر کا متقاضی ہے۔

"۔۔۔۔۔۔ اور ان (بیویوں) کے ساتھ اچھی طرح سے رہو سہو۔ اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو عجب نہیں کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں سے بہت سی بھلائی پیدا کر دے۔" (19:4)

(394) شادی کے لیے ہمیشہ اس فرد کا انتخاب کیا جاتا ہے جس سے اسے محبت ہوتی ہے مگر مردوں کی دنیا میں محبت کی تاریخ اتنی خوشگوار نہیں۔ محبت کا آغاز خصوصاً نوجوانوں میں بہت پر جوش انداز میں ہوتا ہے۔ ایک میٹھی آواز، دلفریب مسکراہٹ، خوبصورت آنکھیں، چاند رنگت، بل کھاتے بالوں کی چوٹی، نوجوان کھنچے چلے جاتے ہیں مگر بہت جلد محبت کا یہ بھوت اتر جاتا ہے۔ کامیاب ازدواجی زندگی کا نسخہ یہ نہیں بلکہ اور ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ضمن میں ہمیں بہت قیمتی مشورہ دیا ہے:

"خوبصورتی کی خاطر شادی مت کرو، شائد خوبصورتی اخلاقی گراوٹ کی وجہ نہ بن جائے۔ دولت کے لیے شادی نہ کرو کہ ممکن ہے یہ (بیوی کی) نافرمانی کی وجہ بن جائے، بلکہ دین سے تعلق کی بناء پر شادی کرو۔" (یعنی بیوی کے طور پر ایسی عورت کا انتخاب کرو جس کی وابستگی دین اسلام سے مسلمہ ہو) (ابن ماجہ حدیث 1859)

چوں کہ اسلام زندگی کے تمام شعبوں کو ایک نظم کے تحت لے آتا ہے اس لیے جو (عورت) دین اسلام کی سچے دل سے پیروکار ہوگی وہ گھر کو امن اور راحت کا گہوارہ بنا دے گی۔ ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"یہ دنیا عارضی چیز ہے جس سے ہمیں وقتی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور دنیاوی اشیاء میں نیک بیوی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں۔" (ابن ماجہ، حدیث 1855)

ترمذی اور نسائی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"کامل مومن وہ ہے جس کا کردار اچھا ہو اور جو اپنی بیوی کے ساتھ حسن سلوک کرے۔"

(395) جیسا کہ پہلے ذکر آ چکا ہے کہ اسلام اخلاقیات (پاکیزہ اطواری) کو بے حد اہمیت دیتا ہے اس لیے بے حیائی کے کاموں کو ہر طریقے سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: (34:4)

"کہ اگر تم کو اپنی بیوی سے سرکشی یعنی غیر اخلاقی رویہ (نشوز) کا اندیشہ ہو تو پہلے اسے اچھے طریقے سے سمجھاؤ، پھر بھی باز نہ آئے تو اظہار ناراضگی کے لیے اس سے اپنا بستر الگ کردو، اور اگر اس کے بعد بھی وہ اپنی روش

ترک کرنے پر آمادہ نہ ہو تو تھوڑا بہت مار بھی سکتے ہو مگر سخت مار مارنے کی اجازت نہیں۔" (اس سے قبل پیراگراف نمبر 382 میں یہ ذکر آ چکا ہے)

جب اصلاح کی تمام کوششیں ناکام ہو جائیں تو پھر علیحدگی یعنی طلاق کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ طلاق اسلام میں پسندیدہ چیز نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے "جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ چیز" قرار دیا ہے اس کی اجازت مجبوری کے تحت دی گئی جب مصالحت کا کوئی بھی نسخہ کارگر نہ رہا ہو۔

پاک دامنی کی ذمہ داری عورت اور مرد دونوں پر ہے۔ مندرجہ بالا آیت سے ذرا آگے قرآن نے اس معاملے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ (4:128-130) جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر عورت کو شوہر کی طرف سے بدسلوکی، بے رخی (نشوز) کا اندیشہ ہو تو اسے پہلے تو چاہیے کہ معاملات درست کرنے کی کوشش کرے تاہم اگر کوئی طریقہ کارگر نہ ہو سکے تو اسے بھی خلع یعنی عدالتی طلاق لینے کا حق حاصل ہے۔

(395۔الف) میاں بیوی کے مابین اچھے تعلقات کے لیے ضروری ہے کہ ان میں خیالات و نظریات کی ہم آہنگی ہو اور اگر ایسا نہیں ہوتا تو پھر کسی ایک کو اپنے نظریات یا رائے کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ لیکن اگر قربانی دینے کی ذمہ داری کسی ایک فریق پر ہی ڈال دی جائے تو گاڑی زیادہ دیر تک نہیں چلتی، کیونکہ لچک کا مظاہرہ دونوں طرف سے ہو تو پھر ہی معاملات چلتے ہیں۔ اسلام نے بہر حال اس کے لیے بھی راستہ نکالا ہے اور حیرت نہیں ہونی چاہیے کہ قرآن (8:29) اور حدیث میں یہ فرمان موجود ہے کہ مخلوق میں سے کسی کی نافرمانی خالق کی نافرمانی نہیں۔ یہ جائز ہے کہ آپ محبت، مصلحت یا مجبوری کے تحت جہاں تک ممکن ہو کسی کو رعایت دیتے جائیں بشرطیکہ یہ اسلام کے احکام سے متصادم نہ ہو۔

(395۔ب) ایک چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت ناپسند تھی اور اس کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مرتبہ تذکرہ فرمایا کہ مرد عورتوں کی نقالی سے گریز کریں اور اسی طرح عورتیں لباس اور وضع قطع مردوں سے مشابہ نہ بنائیں اور ہر مرد اور عورت کو اپنی فطرت (صنف) کے مطابق اپنے طور اطوار ڈھالنے چاہئیں۔ اس کے خلاف نہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایسے مرد اور عورت پر اللہ کی لعنت برستی ہے جو اپنی فطرت کے برعکس وضع قطع اپناتے ہیں۔

خواتین کے حقوق:

(396) زمانہ قبل از اسلام کے عرب معاشرے میں عورتوں کو مردوں کے مقابلے میں بہت کم تر حیثیت حاصل تھی یہاں تک کہ اگر قصور وار مرد ہوتا اور عورت اس کے ظلم کا نشانہ بنتی تو قصاص واجب نہیں تھا مگر اسلام نے یہ امتیاز ختم کر دیا اور جان مال اور عزت کے حوالے سے جرائم پر کارروائی مرد اور عورت کے لیے یکساں کر دی بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ بعض معاملات میں عورتوں کے حقوق مردوں سے بھی بڑھ کر ہیں مثلاً قرآن مجید کے ارشاد (5-4:24) کے مطابق اگر کوئی مرد کسی عورت پر بدکاری کا الزام لگاتا ہے اور اس کا ثبوت بہم نہیں پہنچا تا تو اسے نہ صرف بہتان کے لیے مقرر سزا بھگتنا پڑے گی بلکہ وہ عدالت میں گواہی دینے کے حق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا۔ (آخرت میں اللہ کی طرف سے ملنے والی سزا اس کے علاوہ ہوگی۔ تاہم توبہ سے یہ سزا معاف ہو سکتی ہے) اور اس بات پر فقہا کا اتفاق ہے کہ توبہ کے باوجود گواہی کے حق سے ابدی محرومی کی سزا برقرار رہتی ہے کیونکہ توبہ سے صرف اس کی آخرت کی سزا معاف ہوگی۔ قرآن کا منشا یہ ہے کہ معاشرے کو غیر محتاط زبان درازی کی لعنت سے پاک رکھا جائے خصوصاً ان معاملات میں جہاں زخم لگانا آسان مگر اس کا مداوا مشکل ہو۔

(397) مال اور جائیداد کے معاملات میں عورت کی مکمل خودمختار حیثیت اور انفرادی تشخص بالکل واضح ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے عورت کو اپنے مال و جائیداد پر مکمل تصرف حاصل ہے اور اگر وہ بلوغت کی عمر کو پہنچ چکی ہے تو اسے اپنی جائیداد کی مرضی سے خرید و فروخت کا مکمل اختیار دیا گیا ہے، جس میں کسی مرد کی مداخلت ضروری نہیں چاہے وہ اس کا باپ ہو، بھائی، شوہر، بیٹا یا کوئی اور ہو۔ اس معاملے میں اسلام کی نظر میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں۔ کسی عورت کے شوہر یا باپ کے قرضے کے عوض اس کی جائیداد کو چھوا بھی نہیں جا سکتا۔ اسی طرح مقروض عورت کے قرضوں کی ادائیگی اس کے مذکورہ رشتہ داروں پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ مرد کی طرح عورت کو بھی جائیداد حاصل کرنے یا رکھنے کی مکمل آزادی ہے چاہے اسے ورثہ میں ملے یا کہیں سے تحفہ یا عطیہ ملے اور چاہے اس نے اپنی محنت سے مال کمایا ہو، وہ مکمل طور پر اس کی اپنی ملکیت ہے۔ وہ اس مال یا جائیداد کو بیچنے، کسی کو تحفہ میں دے دینے یا اس کا کوئی بھی قانونی مصرف اختیار کرنے میں مکمل طور پر خودمختار اور آزاد ہے۔ یہ تمام حقوق عورت کو ہمیشہ کے لیے دے دیئے گئے ہیں۔ اس کے لیے شوہر یا کسی دوسرے سے معاہدہ یا سمجھوتہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

(398) حق وراثت کی کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔ قبل از اسلام کی عرب عورت کو وراثت کا حق حاصل نہیں تھا، نہ ہی باپ کے ورثہ سے اسے کچھ ملتا تھا اور نہ ہی شوہر سے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت کے پہلے پندرہ سال میں اس معاملے کی طرف توجہ کی فرصت ہی نہ ملی۔ روایات کے مطابق ہجرت کے تین سال بعد مدینہ کے ایک رئیس اوسؓ بن ثابت انتقال کر گئے اور پسماندگان میں ایک بیوہ اور چار نوعمر صاحبزادیوں کو چھوڑا۔ مدنی رواج کے مطابق ورثاء میں سے صرف بالغ مرد جو جنگ میں حصہ لینے کے قابل تھے وراثت کے حق دار تھے۔ حتیٰ کہ کمسن بیٹے کو بھی متوفی باپ کی وراثت سے کچھ نہیں ملتا تھا، چنانچہ اوس کے چچازاد بھائیوں نے پوری جائیداد قبضے میں لے لی جبکہ اوس کی بیوی اور بیٹیاں راتوں رات امیر سے فقیر ہو گئیں۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآنی آیات نازل ہوئیں اور وراثت کے اسلامی احکام آ گئے اور یہی اسلامی قانون وراثت ہے جس پر آج تک عمل کیا جاتا ہے جبکہ خطہ لاوند (LEVANT) یعنی بحیرہ روم کے مشرقی نصف ممالک (شام، اسرائیل، لبنان، مراکش وغیرہ) کے مسیحیوں کے ہاں بھی یہی قانون وراثت رائج ہے۔

اسلامی قانون کے مطابق (بحوالہ القرآن: 176:4,12-7:4) مردوں کی وراثت سے بیوی، بیٹی، ماں، بہن اور دوسری رشتہ دار عورتوں کو حق دے دیا گیا۔ اسلام نے وراثت میں منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد میں بھی کوئی امتیاز نہیں رکھا بلکہ حکم دیا ہے کہ وراثتی جائیداد کی ہر چیز قانونی وارثوں میں تقسیم کر دی جائے۔ ایسی وصیت کو بھی اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے جس میں مالک نے اپنی جائیداد کسی ترنگ میں آ کر اجنبیوں کو دیکر جائز وارثوں کو محروم کر دیا ہو۔ بلکہ قانونی ورثاء کے لیے وصیت کی ضرورت ہی نہیں، انہیں خود بخود وراثت کا حق حاصل ہو جاتا ہے کسی بھی وصیت کے ذریعے ورثاء کے مقرر حصے میں ردوبدل نہیں کیا جا سکتا۔ وصیت صرف ان رشتہ داروں کے حق میں کی جا سکتی ہے جنہیں قانونی طریقے سے وراثت سے حصہ نہ مل سکتا ہو اور اس کی بھی اسلام نے حد مقرر کر دی ہے کہ اس سے زیادہ کی وصیت نہیں کی جا سکتی اور یہ حد ساری جائیداد کا ایک تہائی ہے۔ باقی دو تہائی جائیداد بہرصورت وراثت ہے جو اس کے جائز حقداروں میں تقسیم ہوگی۔ ایک تہائی سے زیادہ جائیداد کی وصیت صرف اس صورت میں قابل عمل ہے جب ورثا متفقہ طور پر اس پر رضامندی ظاہر کر دیں۔

(399) وراثت کا قانون کافی پیچیدہ ہے کیونکہ مختلف ورثاء کے حصوں میں حالات کے مطابق کمی بیشی بھی ہو جاتی ہے۔ اکلوتی بیٹی یا ایک بیٹے کی موجودگی میں صرف والدہ یا والد کی موجودگی

میں، بچوں کے ساتھ یا بچوں کے بغیر، اکلوتی بہن یا بھائی کی موجودگی میں، متوفی کا والد یا بچے، ان تمام صورتوں میں ورثاء کے حصے کی نوعیت مختلف ہو جاتی ہے تاہم اس کو تفصیلات کے ساتھ بیان کرنے کی گنجائش یہاں نہیں ہے لیکن خواتین کے حصے کا تذکرہ موضوع کی مناسبت سے ضروری ہے۔ متوفی کا اگر بچہ بھی ہو تو بیوی کو شوہر کی جائیداد سے آٹھواں حصہ ملتا ہے۔ بچہ نہ ہونے کی صورت میں وہ چوتھے حصے کی حقدار ہوتی ہے۔ اکلوتی بیٹی کو متوفی باپ کی نصف جائیداد ملتی ہے اور اگر بیٹیاں زیادہ ہوں تو دو تہائی جائیداد ان میں برابر کے حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر ان کا بھائی نہ ہو تو، لیکن اگر متوفی کا بیٹا بھی موجود ہو تو پھر بیٹی کو بیٹے کی نسبت نصف وراثت ملتی ہے۔ اگر متوفی کی صرف والدہ زندہ ہو تو اسے بیٹے کے ورثہ کا ایک تہائی ملتا ہے جبکہ باپ، بچے یا بھائی اور بیٹوں کی موجودگی کی صورت میں ماں چھٹے حصے کی حقدار ہوتی ہے۔ متوفی کا وارث بیٹا موجود ہو تو بہن کو حصہ نہیں ملتا، البتہ بیٹا نہ ہو تو بہن نصف ترکہ کی وارث ہوتی ہے اور دو یا زیادہ بہنوں کی صورت میں دو تہائی ترکہ ان میں برابر تقسیم ہوتا ہے۔ اکلوتی بیٹی کے ساتھ بہن کو چھٹا حصہ اور اگر ایک بھائی بھی ہو تو اسے بھائی سے نصف ترکہ ملے گا۔ اسی طرح حقیقی بہنوں، ایک باپ اور والدہ مختلف ہونے کی صورت میں بہنوں جبکہ ایک ماں اور باپ مختلف ہونے کی صورت میں بہنوں کے حصے مختلف ہوں گے۔

(400) یہ ضروری ہے کہ بہن اور بھائی، ماں اور باپ اور بیٹی اور بیٹے کے مابین ترکہ کے حصوں میں جو عدم مساوات ہے اس حوالے سے اسلامی قانون وراثت کی وضاحت کر دی جائے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قانون ساز حقیقی نے خواتین کے حقوق کا تعین مجموعی حوالے سے کیا ہے اس حقیقت کے ساتھ کہ قوانین عام طور پر معمول کے حالات کے مطابق بنائے جاتے ہیں اور مستثنیات کو اس مرحلے پر پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ (تاہم بعد میں خلاف معمول معاملات سامنے آنے پر ان کا حل بھی پیش کر دیا جاتا ہے)

پہلے یہ ذکر آ چکا ہے کہ عورت اپنی جائیداد اور املاک کی بلا شرکت غیرے مالک ہوتی ہے اور اس میں باپ، شوہر یا کسی اور رشتہ دار کا کوئی حق نہیں ہوتا۔ اس ملکیت کے علاوہ عورت نان ونفقہ کی الگ سے حقدار ہوتی ہے یعنی شادی سے قبل اس کی ضروریات کی تکمیل باپ اور شادی کے بعد شوہر کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور عدالت باپ، شوہر یا بیٹے کو پابند کرتی ہے کہ وہ عورت کی جملہ ضروریات کی کفالت کریں۔ اس کے بعد عورت شادی کے موقع پر شوہر سے مہر کی صورت میں بھی

رقم وصول کرتی ہے جو قبل از اسلام عورت کے باپ کو ملتا تھا مگر اسلام نے اسے ہر لحاظ سے عورت کا حق قرار دیا۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ مہر اور جہیز میں فرق ہے۔ مہر لازمی ہے جس کے بغیر شادی مکمل نہیں ہوتی جب کہ جہیز لازمی نہیں۔ اس طرح یہ دیکھنا ہوگا کہ (اتنا کچھ حاصل کرنے کے بعد) عورت کی مالی ذمہ داریاں مرد کی نسبت بہت کم ہیں کہ اس کے اپنے اخراجات تو مرد کی ذمہ داری ہیں اور اس کے ذاتی اخراجات بھی کم ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ بات قابل فہم نظر آتی ہے کہ چونکہ مرد کی مالی ذمہ داریاں عورت کی نسبت بہت زیادہ ہیں اس لیے اسے ترکہ میں سے زیادہ حصہ ملنا قرین انصاف ہے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگرچہ عورت کے تمام تر اخراجات دوسروں کی ذمہ داری ہیں مگر اس کے باوجود اسلام نے اسے مزید نوازنے کے لیے وراثت میں بھی حصہ دار بنایا ہے۔

جہاں تک ایک گھر کے چلانے کا تعلق ہے تو اس کے لیے باہمی تعاون کی ضرورت ہے اور عورت بھی گھر کی آمدنی میں اضافہ کے لیے کام کرتی ہے یا اگر کام نہیں کرتی اور سلیقے سے اخراجات کم کر کے گھر چلا کر تعاون کرتی ہے مگر یہاں موضوع عورت کے حقوق کا ہے، سماجی روایات اور معمولات نہیں جو ہر گھر اور فرد کے الگ ہوتے ہیں۔ عورت کی ضروریات کے حوالے سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسلام کے قانون کے مطابق عورت پر یہ پابندی بھی نہیں ہے کہ وہ لازمی اپنے بچے کو اپنا دودھ پلائے بلکہ اگر ماں بچے کو دودھ پلانے پر آمادہ نہیں تو یہ ذمہ داری بھی مرد کی ہے کہ وہ بچے کے لیے اپنے اخراجات پر رضاعی ماں کی خدمات حاصل کرے۔

شادی:

(401) اب کچھ ذکر شادی (نکاح) کا ہو جائے جس کے بارے میں بہت سے سوالات اٹھائے جاتے ہیں۔ اسلام میں شادی ایک دوطرفہ معاہدہ ہے جس میں دونوں فریقوں کی مکمل قلبی رضامندی ضروری ہے۔ والدین یقیناً اپنی اولاد کے لیے اپنے تجربے کی روشنی میں بہتر شریک حیات کی تلاش میں مشورہ دے کر مدد کرتے ہیں تاہم حتمی ''ہاں'' کا حق رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے جوڑے کو حاصل ہے اور اسلام کے قانون میں یہ حق مرد اور عورت کا برابر ہے۔ مختلف خطوں اور طبقوں میں خلاف اسلام رسم ورواج کسی نہ کسی درجہ میں پائے جاتے ہیں مگر جہاں تک اسلامی قانون کا تعلق ہے وہ لڑکے اور لڑکی کی رضامندی کے خلاف شادی کے کسی معاہدے کو تسلیم نہیں کرتا۔

(402) یہ درست ہے کہ اسلام ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت دیتا ہے مگر اس بارے میں اسلامی قانون ان نظام ہائے قوانین کی نسبت زیادہ لچکدار اور معاشرتی ضروریات سے زیادہ ہم آہنگ ہے جہاں ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہیں۔ فرض کیجئے ایک عورت جس کے بچے ابھی کمسن ہیں کسی لاعلاج بیماری میں مبتلا ہو کر گھر کے کام کاج سے معذور ہو جاتی ہے اور شوہر کے پاس اس قدر وسائل نہیں ہیں کہ وہ ایک ملازمہ رکھنے کے اخراجات برداشت کر سکے۔ باقی ازدواجی فطری تقاضے تو الگ رہے، یہ بھی فرض کریں کہ بیمار بیوی شوہر کے دوسری بیوی لانے پر رضامند ہو جاتی ہے اور ایسی عورت بھی مل جاتی ہے جو ان حالات میں ایسے مرد سے شادی پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ مغربی قانون یہ اجازت تو دے دے گا کہ مرد اپنی بیوی سے چوری گرل فرینڈ رکھ کر بدکاری کا ارتکاب کرتا رہے مگر یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ قانونی طور پر ایک اور بیوی کو گھر لا کر نہ صرف ویران گھر کو پھر سے آباد کرے بلکہ جائز طور پر ازدواجی زندگی کے مفادات بھی حاصل کرے۔

(403) حقیقت یہ ہے کہ اس حوالے سے اسلامی قانون معقولیت اور عملیت پسندی کا نمونہ ہے کیونکہ اس شادی کے لیے بھی عورت کی رضامندی ضروری ہے۔ تعدد ازدواج یا ایک سے زیادہ شادی جبراً نہیں کی جا سکتی۔ اس کی اجازت مخصوص حالات سے منسلک ہے۔ اس میں موجودہ بیوی اور نئی آنے والی بیوی دونوں کی رضامندی سے ہی کام ہوتا ہے۔ اگر دوسری عورت شادی شدہ مرد سے نکاح کرنے سے انکار کر دے تو اسے اس کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر کوئی عورت ''شریک بیوی'' بننے کے لیے تیار ہے تو اس میں قانون کو ظالم و ناانصاف یا مردوں کا طرفدار قرار دینے کا کوئی جواز نہیں۔

دوسری شادی کا انحصار پہلی بیوی پر ہی ہے کہ وہ نکاح کے موقع پر یہ مطالبہ کر سکتی ہے کہ شوہر نکاح نامے میں یہ لکھ کر دے کہ وہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔ یہ شق بھی اس طرح لاگو ہو گی جس طرح نکاح کی دستاویز میں لکھی گئی دوسری شرائط قابل عمل ہوتی ہیں اور اگر وہ ایسی کوئی شرط عائد نہیں کرنا چاہتی تو قانون اسے ایسا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ ہم نے ابھی مستثنیات کا ذکر کیا ہے اور ایسی صورت میں قانون کے اندر معاملات سلجھانے کے راستے موجود ہوتے ہیں۔ تعدد ازدواج یا ایک سے زیادہ شادی لازمی نہیں محض ایک استثنا ہے یعنی حالات کے تقاضے کے تحت ایک راستہ یا سہولت۔ اس استثناء کے فوائد مسلمہ اور بے شمار ہیں۔ سماجی بھی اور دوسرے بھی، جس

کی تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں تاہم یہ اسلامی قانون اس حوالے سے باعث فخر ہے۔

(404) تاریخی طور پر کسی بھی مذہب کے قوانین میں بیویوں کی تعداد پر کہیں پابندی نہیں لگائی گئی۔ بائبل میں مذکور تمام پیغمبروں کی ایک سے زیادہ بیویاں تھیں حتیٰ کہ عیسائیت میں بھی، جو ''ایک وقت میں ایک بیوی'' کے قانون کی علامت بن گئی ہے، عیسیٰ علیہ السلام نے خود کبھی تعدد ازدواج کے خلاف ایک لفظ نہیں کہا جبکہ مذہبی علوم کے ممتاز مسیحی ماہرین مثلاً لوتھر، میلنتھون (Melanchthon) بوسر (Bucer) وغیرہ (بحوالہ Dictionaire de la Bible by Vigourous, Polygemie) نے تو میتھو کی انجیل (12-1:25) میں دس کنواریوں کی تمثیل (Ten Virgins) سے تعدد ازدواج کا جواز حاصل کرنے میں کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام بیک وقت ایک مرد کی 10 لڑکیوں سے شادی کے امکان کو پیش نظر رکھ رہے تھے۔ اگر مسیحی اس اجازت سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہتے (جو ان کے مذہب کے بانی نے انہیں دی ہے) تو قانون تو بہر حال تبدیل نہیں ہوا۔[1]

یہی بات مسلمانوں کے لیے بھی درست ہے کہ اسلامی قانون دنیا کی تاریخ میں واحد قانون ہے جو بیویوں کی زیادہ سے زیادہ حد کو متعین کرتا ہے (مسیحی نظریات اور عمل کے حوالے سے عمومی بحث و مباحثہ کے نقطہ نظر سے انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا ملاحظہ ہو۔ باب شادی۔ تعدد ازدواج (Marriage, Polygyny نیز Westermarck : History of Human Marriage والیم 3) بھی ایک اچھا حوالہ ہے۔

---

[1] ایک زوجگی (ایک وقت میں ایک بیوی) کا اس طرح کا تصور کہ دوسری شادی (بیک وقت دو بیویاں) کو سنگین جرم، گناہ اور لعنت قرار دیا جائے بہت کم یاب ہے اور شادی کے ایسے منفرد، مثالی اور کٹر پن پر مبنی نظریے کی مثال آج کے جدید دور سے پہلے شاید ہی ملتی ہو اور یہ صورتحال بھی مغربی تہذیب کی دور حاضر کی جدیدیت کا ثمر ہے۔ یہ مسیحی دینی نظریے سے اخذ کردہ قانون نہیں۔'' (انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا، باب شادی)

''یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مسیحیت نے مغربی دنیا میں ''لازمی یک زوجگی'' متعارف کروائی...... مسیحیت بشپ اور پادری کے سوا باقی لوگوں کے لیے تعدد ازواج یعنی ایک سے زیادہ شادی کی واضح انداز میں ممانعت نہیں کرتی (طموتھی۔ III، 2 اور 12 (جو سینٹ پال کی نصیحتیں اور مشورے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کے فرامین نہیں)

...... مگر ابتدائی صدیوں میں مسیحیت کی کسی کونسل آف چرچ نے ایک سے زیادہ شادی کی ممانعت نہیں کی۔ اور بادشاہوں نے بھی دور کفر (قبل از مسیحیت) میں جہاں کہیں بھی یہ رائج تھی اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی۔ چھٹی صدی کے وسط میں آئر لینڈ کے شاہ ڈیار میٹ کی دو ملکائیں اور دو داشتائیں تھیں۔''

(H.d` Arbois de Jubainville, Cours de Literature, Celtique, vi, 292)

تعدد ازدواج فرانس کے Merovingian بادشاہوں کے ہاں بھرپور انداز سے رائج تھی، چارلس دی گریٹ (شارلیمان) کی دو بیویاں اوران گنت داشتائیں تھیں اوراس دور کے ایک قانون سے بھی ایسا تاثر ملتا ہے کہ پادریوں کے ہاں بھی ایک سے زیادہ شادیاں شجرممنوعہ کی حقیقت نہیں رکھتی تھیں۔

A Thierry, Recits dos temps Merovingians, or its English Translation) " *Narratives of Merovingian Era,* ip 17 sqq.v.Hellwald, *Europe during the Middle age,* 11, 420,11.2)

بعد کے ادوار میں فلپ (آف Hesse) اور جرمنی کے بادشا فریڈرک ولیم II نے لوتھرن عقیدے کے مذہبی پیشواؤں کی منظوری سے ایک سے زیادہ شادیاں کیں (Friedberg Kirchenrechts,i, بحوالہ سلسلہ)Lehbuch des Katholi-shers und evangehischen 436-(143

خودلوتھر نے اول الذکر شاہ فلپ کی دوسری شادی کی منظوری دی۔ جبکہ میلنتھون سے بھی ایسا ہی منسوب ہے (*Koslin*، مارٹن لوتھر، صفحہ 476) مختلف مواقع پر لوتھر نے تعدد ازدواج کا ذکر بڑی رواداری کے لہجے کے ساتھ کیا ہے۔اس کی ممانعت خدا نے نہیں کی (*Koslin* مارٹن لوتھر، صفحہ 693)

...... 1650 میں Wertphalia (جرمنی) کے امن معاہدے کے بعد جب کہ مردانہ آبادی کا بڑا حصہ تیس سالہ جنگ کی نذر ہوکا تھا۔ جنگی پارلیمینٹ نے نورمبرگ سے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ اس کے بعد ہر مرد کو دو عورتوں سے شادی کی اجازت ہوگی۔

V.Heilwald, Couss de literature Celtique) صفحہ 599) بعض مسیحی فرقوں نے بڑے زور کے ساتھ مردوں کی ایک سے زیادہ شادیوں کی حمایت کی ہے۔ 1531 میں ایناباپٹسٹس نامی مسیحی فرقے (اس فرقے کا عقیدہ تھا کہ جس بچے کو بچپن میں پتسمہ دیا گیا اسے بالغ ہونے کے بعد ایک بار پھر پتسمہ دینے کی ضرورت ہے۔) مسٹر (Munster) میں کھلے عام یہ اعلان کیا کہ جو کوئی سچا مسیحی بننا چاہتا ہے تو اسے کئی بیویوں کا شوہر ہونا چاہیے (حوالہ مندرجہ بالا صفحہ 558) جبکہ ساری دنیا کو معلوم ہے کہ مارمنز (Mormons) (امریکہ کا ایک معروف مسیحی فرقہ) کثیر الازدواجی کو خدائی ادارے کا درجہ دیتے ہیں (Wastermarck , History of Human Marriage, III, 50-51)

''عزت مآب فلپ (آف Hesse) کی طرف سے مارٹن لوتھر اور فلپ میلنتھون سے کئے جانے والے استفسارات کے بارے میں مارٹن بوسر کی جو ہدایات دی گئی تھیں وہ اس طرح تھیں۔

''معلوم ہے کہ لوتھر اور میلنتھون نے شاہ انگلستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پہلی بیوی کو طلاق دینے کی بجائے دوسری شادی کر لیں۔''

(405) شادی کی تنسیخ یا علیحدگی کا امکان اسلامی قانون میں بھی شروع سے موجود ہے شوہر کو بیوی کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے تاہم بیوی بھی یہ حق نکاح کے وقت مطالبہ کر کے حاصل کر سکتی ہے اور اسے نکاح نامہ میں درج کیا جانا ضروری ہے۔

عدالت اس صورت میں بیوی کی درخواست پر تنسیخ نکاح کی ڈگری جاری کر سکتی ہے اگر شوہر اپنے ازدواجی فرائض ادا کرنے کی اہلیت سے عاری ہو یا وہ کسی سنگین قسم کے مرض میں مبتلا ہو یا سالہا سال سے مفقود الخبر ہو (وغیرہ) علیحدگی کی ایک اور صورت بھی ہے جب نباہ نہ ہونے کی صورت میں میاں بیوی باہمی رضا مندی سے ایک دوسرے سے الگ ہونے کا فیصلہ کرلیں۔ قرآن مجید میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ میاں بیوی جھگڑے کی صورت میں اپنا معاملہ کسی تیسرے ثالث یا بزرگ کے پاس لے جائیں تاکہ علیحدگی سے قبل گھر بچانے کی ایک اور کوشش کی جاسکے (35:4)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس حوالے سے فرمایا:

"اللہ کی نظر میں جائز چیزوں میں سے سب سے ناپسندیدہ چیز طلاق ہے۔"

اسلامی قانون، اخلاقیات اور تعلیمات ایک دوسرے سے مربوط ہیں جن کا سرچشمہ ایک ہی ہے یعنی قرآن مجید اور حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

باب نمبر 12

اسلام میں غیر مسلموں کی حیثیت

(406) قریبی اور دور کے عزیزوں جبکہ رشتہ داروں اور اجنبیوں کے ساتھ ہمارے رویے اور سلوک میں فرق بلکہ امتیاز عین فطری ہے۔ شعور اور اخلاقی ارتقاء کے ساتھ انسانی معاشرے میں اجنبیوں کو اپنے اندر سمونے کا رجحان پیدا ہوا۔ اگر معاشرہ صرف خونی تعلق کی بناء پر استوار ہوتا تو اجنبیوں کو معاشرے میں ضم کرنے یا حقوق قومیت عطا کرنے کا سرے سے سوال ہی نہ ہوتا۔ اگر رنگ کو معاشرے کی بنیاد بنایا جاتا تو بھی یہی صورت ہوتی کیونکہ رنگ کو تو چھپایا ہی نہیں جا سکتا۔ سماجی ایکتا کے لیے زبان کو حوالہ بنایا جائے تو اس کے لیے سالہا سال درکار ہیں اور اجنبی کے معاملے میں جائے پیدائش کا نظریہ تو اور بھی کم قابل قبول ہے اور جب سے انسان نے شہری ریاستوں یا ملکوں کی حدود کے افق عبور کیے ہیں یہ حوالہ سب سے کم اہم ہو گیا ہے۔ تاہم سماجی یکجائی کے مندرجہ بالا تصورات اور نظریات کے حوالے سے کہا جا سکتا ہے کہ اس طرح معاشرہ کی بنیاد محض فطرت کا ایک حادثہ ہے اور اس کا تعلق انسانی عقلیت پسندی سے زیادہ حیوانی جبلت سے ہے۔ اسلام کے حوالے سے یہ حقیقت سب کو معلوم ہے کہ اسلام نے قومیت کے یہ تمام نظریات مسترد کر دیئے ہیں اور اس مقصد کے لیے نظریات کے تشخص کو بنیاد بنایا ہے جس کا انحصار انسان کے اپنے اختیار اور انتخاب پر ہے۔ پیدائش کے حادثے پر نہیں (کہ وہ کہاں پیدا ہوا اور کس عقیدے پر پیدا ہوا) جسے معاشرہ کی بنیاد بنا لیا جائے۔ ایسے معاشرے میں (یعنی اسلامی) حقوق قومیت کا حصول اور معاشرے کے اندر ضم ہونے کا عمل نہ صرف تمام انسانی نسلوں کے لیے آسان اور قابل رسائی ہے بلکہ معقولیت کے قریب اور زیادہ قابل عمل ہے اور اس میں زندگی امن اور سکون کے ساتھ گزارنے کے پورے ذرائع میسر ہیں۔

(407) اگر اللہ کی وحدانیت پر یقین رکھنے والا یا سرمایہ داری نظام کا پرستار کیمونسٹ ممالک میں اجنبی تصور کیا جاتا ہے اور ایک سیاہ فام کو سفید فاموں کے ملک میں امتیازی سلوک کا سزاوار سمجھا

جاتا ہے یا جیسے اٹلی میں کوئی غیر اطالوی اجنبی گردانا جائے اس طرح حیرت نہیں ہونی چاہیے اگر کسی اسلامی ملک میں غیر مسلم کو بھی اجنبی کا درجہ دیا جائے۔ مختلف لوگوں میں اختلاف رائے تو فطری ہے تاہم کسی فرد کا برتاؤ اپنے گروپ یا عقیدے کے لوگوں سے ان لوگوں کی نسبت مختلف ہوگا جو اس کے گروپ یا عقیدے سے تعلق نہیں رکھتے۔

(408) دوسرے تمام سیاسی اور سماجی نظاموں کی طرح اسلام بھی اپنے ''رشتہ داروں'' اور ''اجنبیوں'' میں امتیاز کرتا ہے مگر اس کی دو امتیازی خصوصیات ہیں:

(1) اسلام کے نظریہ کو قبول کر کے یہ رکاوٹ پار کرنے کی سہولت

(2) دونوں درجوں (مسلم۔ غیر مسلم) کے افراد کے مابین دنیاوی معاملات کے حوالے سے کوئی عدم مساوات نہیں۔

ہم اس معاملے کے اس آخری پہلو پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

(409) یہ عظیم عملی حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ مسلمان شریعت لاء یعنی اسلامی قانون کی پابندی ملکی رہنماؤں یا منتخب نمائندوں کی اکثریت کے منظور کردہ سمجھ کر نہیں بلکہ اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ ان کی بنیاد قرآن وسنت ہے جبکہ اول الذکر صورت میں یعنی انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین میں اقلیتی جماعت یا اپوزیشن آئندہ الیکشن جیت کر اپنے نظریات کی ترویج کے لیے جدوجہد شروع کر دیتی ہے۔ اس دور کے جمہوری ممالک میں ایسا ممکن ہے کہ آج کی حکمران جماعت کل کی اپوزیشن بن جائے۔ ہر الیکشن میں نتائج مختلف ہو سکتے ہیں۔ اتحاد بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں اور ہر حکمران جماعت اپنے پیش روؤں کی پالیسیوں کو تبدیل کر کے اپنی پالیسیوں کو لاگو کرتی ہے اور بعض اوقات آئین میں ترامیم بھی لے آتی ہیں اس بحث میں پڑے بغیر کہ شریعت لاء سماجی ارتقا کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے یا نہیں مگر یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اسلامی قانون ایک مستقل دستاویز ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی بنیاد ہی خدائی قانون یعنی قرآن (اور سنت) ہے۔

(410) اسلام کے قوانین میں غیر مسلموں کے ساتھ انصاف اور ان کے بارے میں بعض مخصوص قوانین پر عملدرآمد کی ضمانت موجود ہے۔ اس لیے انہیں سیاسی اختلافات اور اپنے علاقہ کے پارلیمانی انتخابات کے انعقاد کے حوالے سے ملک میں نافذ اسلام کے قوانین کے بارے میں کسی قسم کے خدشات نہیں ہو سکتے کیونکہ کوئی بھی حکمران یا پارلیمینٹ انہیں تبدیل نہیں کر سکتی۔

بنیادی نظریات:

(411) اللہ پر ایمان رکھنے والے اور اللہ کا انکار کرنے والے برابر نہیں ہو سکتے۔ اول الذکر جنت میں جائیں گے جبکہ مؤخر الذکر دوزخ کے مکین بنیں گے۔ مگر اس کا تعلق آخرت سے ہے۔ جہاں تک اس دنیا کی زندگی کا تعلق ہے الدبوسی اور بعض دوسرے فقہا اس امر کے قائل ہیں کہ اسلام میں ''رشتہ داروں'' اور ''اجنبیوں'' کے ساتھ معاملات کے لحاظ سے مکمل مساوات موجود ہے، جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے۔

(412) جہاں تک مذہبی رواداری کا تعلق ہے قرآن نے ''دین میں کوئی زبردستی نہیں'' (256:2) کا اعلان کر کے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے کر دیا ہے۔ اسلامی ملک میں اپنے غیر مسلم شہری ہوں یا عارضی طور پر مقیم غیر مسلم، انہیں اپنی سلامتی اور عقیدے کی آزادی کی ضمانت حاصل ہے۔

(413) غیر مسلموں کی میزبانی اور انہیں پناہ دینے کے حوالے سے اسلام کی تعلیمات محض باتیں نہیں بلکہ 14 سو سال میں اس کی بے شمار عملی مثالیں موجود ہیں۔ قرآن مجید کا یہ حکم ہر مسلمان کے دل میں بسا ہوا ہے۔

> ''(اے پیغمبر) اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو،
> پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو......'' (6:9)

اور تاریخ گواہ ہے کہ نسلی، مذہبی، سیاسی اور دوسرے تعصبات کی بناء پر تشدد کا نشانہ بننے والوں کو ہمیشہ اسلام کی سرزمین میں پناہ دی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریق عمل:

(414) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت کے بعد مدینہ تشریف لائے تو وہاں مکمل انارکی کا راج تھا۔ خطہ اس سے قبل کسی ریاست کے تصور یا حکمران کے وجود سے آشنا نہیں تھا۔ قبائل منتشر اور باہمی جھگڑوں کے باعث مستقل برسرپیکار رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی آمد کے چند ہفتوں کے اندر مکینوں کو ایک نظام پر متفق کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شہری ریاست کے قیام کی بنیاد رکھی جس میں مسلمانوں کے ساتھ

ساتھ یہودی، مشرک عرب اور مسیحیوں کی مختصر سی جماعت بھی شامل تھی۔ انہوں نے ایک عمرانی معاہدے کے تحت ایک ریاستی نظام کے تحت معاملات چلانے کا عہد کیا۔

(415) پہلی "مسلم" ریاست کا آئین اور قانون مکمل محفوظ حالت میں ہم تک پہنچا ہے۔ یہ ریاست اپنی ہیئت کے اعتبار سے آبادی کے مختلف طبقات پر مشتمل ہونے کے سبب ایک وفاق کا درجہ رکھتی تھی۔ اس دستاویز (میثاق مدینہ) کی 25ویں شق معنی خیز ہے:

"...... مسلمان اپنے مذہب پر عمل کریں گے اور یہود اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہوں گے۔"

یا "اس معاہدے کے شرکا کے باہمی تعلقات خیر خواہی، خیر اندیشی اور فائدہ رسانی کی بنیاد پر ہوں گے۔ گناہ پر نہیں۔"

مگر اس میں یہ حیرت انگیز شق بھی شامل تھی۔ ابو عبید کی روایت کے مطابق اس کے الفاظ یہ تھے:

"یہود مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ہی امت ہوں گے۔"

جبکہ ابن ہشام کے مطابق:

"یہودی قوم مسلمانوں کی اتحادی ہوگی۔"

(416) ریاست مدینہ کی تشکیل کے بعد گرد و نواح کے یہودی دیہات کے مکینوں نے بخوشی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نو تشکیل ریاست کے حاکم کے طور پر قبول کر لیا جس سے بجا طور پر یہ تاثر ملتا ہے کہ مسلم ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو کم از کم سربراہ ریاست کے انتخاب میں ووٹ دینے کا حق حاصل تھا۔

(417) اس زیر بحث دستاویز کے مطابق ریاست کے دفاع کی ذمہ داری یہودیوں سمیت آبادی کے تمام طبقات کی مشترکہ ذمہ داری تھی اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ یہ شراکت دفاعی منصوبہ بندی میں مشاورت سے لے کر عملاً میدان جنگ میں جنگی کارروائی تک محیط تھی۔ دستاویز کی شق 37 کے مطابق:

☆ یہود اپنے اخراجات برداشت کریں گے اور مسلمان اپنے اخراجات خود کریں گے۔

☆ معاہدے کے کسی فریق کے خلاف جارحیت کی صورت میں سب حملہ آور کے خلاف آپس میں تعاون کریں گے۔

☆ جو کوئی یثرب یعنی مدینہ پر دھاوا بول دے اسے روکنے کے لیے سب باہم تعاون کریں گے اور ہر فریق اپنے اپنے اطراف کا دفاع کرے گا۔

(418) ریاست مدینہ کے قیام کے چند ماہ بعد ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ کے نواح میں آباد مشرک عرب قبائل سے دفاعی تعاون کے معاہدے کرتے دیکھتے ہیں۔ ان میں سے کچھ نے اس سے دس سال بعد اسلام قبول کیا تاہم اس طویل عرصہ کے دوران مسلمانوں اور عرب مشرکین کے درمیان مکمل تعاون رہا جیسا کہ درج ذیل واقعات سے ظاہر ہو رہا ہے۔

(419) دوسری صدی ہجری میں مشرکین مکہ نے ایک وفد حبشہ بھیجا جس کے ذریعے شاہ حبشہ نجاشی سے استدعا کی گئی کہ جن مکی مسلمانوں نے حبشہ میں پناہ لے رکھی ہے انہیں ملک بدر کر دیا جائے۔ اس سفارتی جارحیت کو ناکام بنانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنا ایک نمائندہ نجاشی کے دربار میں روانہ کیا تاکہ اسے ایسے کسی اقدام سے باز رکھا جاسکے اور اسے بتایا جائے کہ مکہ کے ان مظلوم مسلمانوں نے ان لوگوں کے مظالم اور سختیوں سے تنگ آ کر حبشہ کا رخ کیا تھا اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ نمائندہ عمرو بن امیہ الضمری تھا جو ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا مگر اس کا تعلق مدینہ کے نواح میں آباد قبیلے سے تھا جو مسلمانوں کا حلیف تھا۔ ان قبائل کا حوالہ ابھی اوپر آیا ہے۔ (اور اس قبیلے کے بھی شاہ نجاشی سے قریبی مراسم تھے۔ مترجم)

جزیہ:

(420) ایک ایسے وقت میں جب مسلم سلطنت کی وسیع سرحدوں کے اندر جنگی کارروائیاں کم و بیش ہر وقت جاری رہتی تھیں، فوجی ملازمت کوئی آسان کام نہ تھا، گو اس میں جان کا خطرہ تو سب سے بڑا تھا لیکن معاشی مجبوریاں اپنی جگہ ایک حقیقت تھی۔ ان حالات میں اگر مسلمان حکمرانوں نے اپنے غیر مسلم شہریوں کو ان کی وفاداری پر شبہ کی بناء پر ہی سہی، لازمی فوجی خدمات سے مستثنیٰ رکھا تو کم از کم وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کی حکمرانی کو قبول کر چکے تھے اور کسی طرح ان کے خلاف غداری میں ملوث نہیں ہونا چاہتے تھے، امن سے رہ کر اپنی زندگی گزار سکتے تھے جبکہ مسلمانوں کو لازمی فوجی خدمات انجام دے کر تمام خطرات کی زد میں رہ کر زندگی گزارنا ہوتی تھی، اور اگر ان تمام مراعات کے بدلے میں غیر مسلم ایک معمولی رقم ادا کرنے کے پابند تھے تو یہ کیسے ناانصافی ہوگئی۔ جزیہ کی اس رقم کی ادائیگی سے عورتیں، بچے اور نادار مستثنیٰ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں جزیہ کی شرح 10 درہم سالانہ تھی۔ یہ رقم متوسط درجے کے خاندان کے دس روز کے اخراجات کے برابر تھی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے ہمراہ کسی جنگی مہم میں شریک ہوتا تو اس سال کے لیے اس کا جزیہ معاف کر دیا جاتا تھا۔ چند مثالوں سے اس ٹیکس کی حقیقی نوعیت سامنے آ جائے گی۔

(421) اسلام کی ابتداء میں مدینہ یا مسلم ریاست کے کسی اور مقام پر اس ٹیکس کا وجود نہ تھا۔ اس کا حکم 9 ہجری کے لگ بھگ قرآن مجید میں نازل ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ٹیکس کسی ہنگامی ضرورت کے تحت لگایا گیا اور اس کی ادائیگی مذہبی فریضہ کی طرح لازمی نہ تھی۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی (اسے ابن سعد نے زہریؒ کے حوالے سے روایت کیا) کہ اپنے صاحبزادے ابراہیم کے فوت ہو جانے کے بعد (ماریہ قبطیہ کے بطن سے پیدا ہونے والے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادے جن کا شیر خوارگی میں ہی انتقال ہو گیا تھا) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اگر ابراہیم زندہ رہتا تو اس کی ماں کی عزت افزائی میں تمام قبطیوں کا جزیہ معاف کر دیتا۔ (حضرت ماریہؓ کا تعلق قبطی نسل سے تھا)۔

ایک اور موقع پر (بہ روایت سیوطیؒ ''حسن المحاضر'' باب خلیج امیر المؤمنین) جب ایک غیر مسلم مصری نے اسلامی حکومت کے سامنے فسطاط (قاہرہ) سے بحیرہ احمر تک پرانی نہر کی بحالی کا منصوبہ پیش کیا جس سے مصر سے مدینہ تک اناج اور دوسری اشیاء خوردنی کی بحری نقل و حمل آسان ہو جاتی تو اظہار تشکر کے طور پر خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے عمر بھر کے لیے جزیہ کی وصولی موقوف کر دی۔ یہ نہر ''نہر امیر المؤمنین'' کے نام سے معروف ہوئی۔

بعض فقہا کی رائے میں جزیہ کے نفاذ کے حوالے سے اس کے بین الاقوامی مضمرات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ مسلمان تو اب دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں اور غیر مسلم حکومتوں کے شہری ہیں۔ اگر مسلم ممالک میں آباد غیر مسلموں یعنی مسیحیوں، یہودیوں، ہندوؤں اور دوسرے غیر مسلموں پر جزیہ عائد کیا گیا تو ردعمل میں غیر مسلم ممالک کے مسلمان شہریوں پر منفی اثرات مرتب ہوں گے۔

(422) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور فرمان بھی ہے جس کا اعلان آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بستر وصال پر کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کہ یہودیوں اور نصاریٰ کو سرزمین حجاز سے نکال کر دوسرے علاقوں کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ (بعض روایات میں

مشرکین کو نکالنے کا حکم ہے۔مترجم) اس حکم کا سیاق و سباق احادیث میں مذکور نہیں مگر بظاہر اس سے مراد اس خطے کے یہودی اور مسیحی تھے اور اس کی وجہ ان کا سیاسی رویہ تھا کیونکہ ان دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے بارے میں ایسی کوئی عمومی پابندی کبھی نہیں لگائی گئی اور یہ امر قابل ذکر ہے کہ خلفاء راشدین کے دور میں مکہ اور مدینہ میں بہت سے غیر مسلم غلام عورتیں اور مرد تھے جو اپنے مسلمان مالکوں کے ساتھ ہی مقیم تھے۔مکہ کے ایک مسیحی طبیب کا معاملہ کافی معروف ہے جس کا مطب مسجد الحرام (کعبہ) کے مینار کے نیچے واقع تھا۔یہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے دور یا اس کے فوری بعد کا واقعہ ہے۔(ابن سعد، حوالہ داؤد ابن عبدالرحمٰن، دراصل داؤد ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا مگر اس کا والد جو ایک طبیب تھا بدستور مسیحی عقیدے پر فائز رہا) ابن سعد (III/(i) صفحہ 258) نے ایک اور مسیحی جفینہ کا ذکر بھی کیا ہے جو مدینہ میں بچوں کی تعلیم و تدریس کے فرائض انجام دیتا تھا۔

(423) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بستر وصال پر ایک اور فرمان کا تذکرہ مناسب ہوگا:

"غیر مسلم زیردستوں کو جو تحفظ میں دے چکا ہوں اس کی مکمل پابندی کرنا۔"

(الماوردی) جبکہ ابوداؤد نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جو کوئی غیر مسلم زیردستوں پر ظلم کرتا ہے مجھے روز قیامت (ظالم مسلمانوں کے خلاف) ان کا حامی اور دستگیر پائے گا۔"

(424) سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین مسلمانوں کے لیے اعلیٰ ترین قانون کا درجہ رکھتے ہیں اور جہاں تک ان قوانین کے مسلمانوں کی زندگی میں جاری و ساری ہونے اور بعد میں کیا ہوتا رہا، کا تعلق ہے تو اس حوالے سے تاریخ کا مطالعہ سودمند ہوگا۔ہم یہاں چند حوالے پیش کرتے ہیں:

بعد کے لوگوں کا طرزِ عمل:

(425) عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں آپ کے ایک گورنر نے ایک غیر مسلم کو اپنا سیکرٹری مقرر کیا۔جب یہ خبر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پہنچی تو آپ نے اسے ہٹا کر اس کی جگہ کسی مسلمان کی تقرری کی ہدایت کی۔یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب زیر بحث صوبہ میں ابھی پوری

طرح امن قائم نہیں ہوا تھا۔ اور جنگ ابھی جاری تھی، اس حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حکم قابل فہم ہے کہ ایک مفتوحہ ملک کے ایک باشندے کو گورنر کے سیکرٹری جیسے حساس منصب پر فائز کرنا خرابی کا باعث ہو سکتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے طرز عمل کی مزید وضاحت کے لیے ایک اور واقعہ قابل ذکر ہے (روایت بلاذری، انساب):

"گورنر شام کو خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک خط موصول ہوا جس میں انہوں نے مالیات کے کسی یونانی ماہر کو مدینہ بھجوانے کی ہدایت کی تھی، اور آپ نے ایک مسیحی کو مدینہ میں اس شعبہ کا سربراہ مقرر کیا۔"

(426) حضرت عمرؓ کا یہ معمول تھا کہ آپ فوجی، معاشی اور انتظامی معاملات پر غیر مسلم ماہرین سے مشاورت کیا کرتے تھے۔

(427) مسلمانوں کے منصب امامت (مساجد میں نماز پڑھانے کے لیے) کو صرف ہم مذہبوں کے لیے مخصوص کرنے پر کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اسلام نے زندگی کے تمام معاملات کو چاہے ان کا تعلق دین سے ہو یا دنیا سے، مربوط انداز میں نمٹانے کو پسند کیا ہے اور اس کی ہدایت کی ہے اس لیے اسلام میں سربراہ ریاست ہی نمازوں کی امامت کا حق رکھتا ہے اور یہ اس کی ذمہ داری بھی ہے۔ اس طرح وہ سیاسی کے ساتھ ساتھ مذہبی معاملات کا مدارالمہام بھی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر یہ بات آسانی سے سمجھ آ جاتی ہے کہ ایک مسلم ریاست کا سربراہ غیر مسلم کیوں نہیں بن سکتا۔

(428) سربراہ ریاست کے لیے استثناء کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مسلم ریاست کے غیر مسلم شہریوں کو ملک کے سیاسی اور انتظامی مناصب کے لیے بھی نااہل قرار دے دیا جائے۔ خلفاء راشدین کے دور سے یہ معمول رہا ہے کہ مسلم حکومتوں میں غیر مسلموں کو وزراء کے درجے تک فائز کیا جاتا رہا ہے جب کہ ایسی روایات کا مشاہدہ دنیا کی معروف سیکولر جمہوریتوں میں نہیں ہوا جہاں باصلاحیت مسلمان شہریوں کی کوئی کمی نہیں۔

غیر مسلموں کو مناصب پر فائز کرنے کی خلفاء کی روایت خلاف اسلام نہیں۔ اور دور اول کے مؤرخوں نے اس کی تصدیق کی ہے۔ شافعی اور حنبلی فقہا (مثلاً الماوردی اور ابویعلیٰ الفرا) نے تو خلفا کے غیر مسلموں کو وزارتوں اور ہیئت مقتدرہ کے مختلف مناصب پر فائز کرنے کے اقدام

کو بالکل جائز قرار دیا ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک غیر مسلم کو اپنا ایلچی بنا کر حبشہ بھجوانے کا تذکرہ تو اوپر آ چکا ہے۔

سماجی خود مختاری:

(429) غیر مسلموں کے حوالے سے اسلام کے طرز عمل کی شاید سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس نے غیر مسلموں کو معاشرتی خود مختاری عطا کی ہے:

قرآن مجید سے ایک طویل اقتباس اس موضوع پر کافی روشنی ڈالتا ہے:

''...... لہٰذا اگر یہ تمارے پاس (اپنے مقدمات لیکر) آئیں تو تمہیں اختیار دیا جاتا ہے کہ چاہو ان کا فیصلہ کردو ورنہ انکار کردو۔ انکار کردو تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور فیصلہ کرو تو پھر ٹھیک ٹھاک انصاف کے ساتھ کرو کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے...... اور یہ تمہیں کیسے حکم بناتے ہیں جبکہ ان کے پاس تورات موجود ہے، جس میں اللہ کا حکم لکھا ہوا ہے اور پھر یہ اس سے منہ موڑ رہے ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان ہی نہیں رکھتے۔''

''ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی۔ سارے نبی جو مسلم تھے، اسی کے مطابق ان یہودی بن جانے والوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح ربانی اور احبار بھی (اسی پر فیصلہ کا مدار رکھتے تھے) کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے، پس (اے گروہ یہود!) تم لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر بیچنا چھوڑ دو۔ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی کافر ہیں۔''

''تورات میں ہم نے یہودیوں پر یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان،

دانت کے بدلے دانت اور تمام زخموں کے لیے برابر کا بدلہ، پھر جو قصاص کا صدقہ کردے تو وہ اس کے لیے کفارہ ہوگا اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی ظالم ہیں۔"

"پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریمؑ کے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ توراۃ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا وہ اس کی تصدیق کرنے والا تھا۔ اور ہم نے اس کو انجیل عطا کی جس میں رہنمائی اور روشنی تھی اور وہ بھی توراۃ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا اس کی تصدیق کرنے والی تھی، اور خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی۔"

"ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔"

"پھر اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی جو حق لے کر آئی ہے اور الکتاب میں جو کچھ اس کے آگے موجود ہے اسکی تصدیق کرنے والی اور اس کی محافظ و نگہبان ہے۔ لہٰذا تم خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس سے منہ موڑ کر ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے ایک شریعت اور ایک راہ عمل مقرر کی، اگر تمہارا خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بھی بنا سکتا تھا لیکن اس نے یہ اس لیے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو، آخر کار تم سب کو خدا کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔"

(5:42-48) (ترجمہ سید ابوالاعلیٰ مودودی، تفہیم القرآن)

(430) اسی حکم ربانی کی تعمیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشینوں نے اسلامی حکومت کی تمام غیر مسلم اقلیتوں کو نہ صرف انفرادی اور ذاتی بلکہ زندگی کے تمام معاملات بشمول دیوانی، فوجداری مقدمات میں عدالتی خودمختاری عطا کی۔ مثلاً خلافت راشدہ کے ایام میں حکومت نے مسیحی پادریوں کو دنیاوی معاملات میں بہت سے عدالتی اختیارات تفویض کر رکھے تھے جن کے تحت وہ اپنے ہم مذہبوں کے مقدمات نمٹاتے تھے۔ اسی طرح خلافت عباسیہ میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ مسیحی اور یہودی مذہبی پیشواؤں کو حکومت کی سطح پر اعلیٰ مقام حاصل تھا اور ان کو خلیفہ تک براہ راست رسائی حاصل تھی۔

(431) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مسعود میں مدینہ کے یہودیوں کا اپنا بیت المدارس (عبادت گاہ اور درس و تدریس کا مشترکہ ادارہ) تھا۔ نجران (یمن) کے عیسائیوں کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو معاہدہ کیا تھا اس میں جہاں انہیں جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دی گئی تھی وہاں ان کو یہ اختیار بھی دے دیا تھا کہ وہ اپنے مذہبی مناصب پر نامزدگیاں اور تقرریاں خود کر سکتے ہیں۔

(432) عوام الناس میں یہ عمومی رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ ظاہری معاملات مثلاً لباس، طرز زندگی اور رکھ رکھاؤ میں اپنے حاکموں کی نقل اور پیروی کرتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک ظاہری ہم رنگی تو نظر آتی ہے جس کا حکمران طبقہ کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا اور رعایا کے ان طبقات کو بھی ایک اخلاقی زیاں کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو منافقانہ اور غلامانہ انداز میں اپنے حکمرانوں کی نقل کرتے ہیں (یعنی ان کا اپنا تشخص برقرار نہیں رہتا)۔ ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلم "زیر حفاظت طبقہ" (ذمی) کہلاتے ہیں۔ اور یہ حکومت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ ان "اجنبیوں" کے قانونی حقوق کا تحفظ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ عباسی دور خلافت میں "اجنبیوں" (دوسرے علاقوں سے آ کر آباد ہونے والے غیر مسلم) کو زبردستی اپنے رنگ میں رنگنے کی بات تو بہت دور کی ہے بلکہ ایک دوسرے کا رنگ اختیار کرنے کی بھی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی اور مسلمان، مسیحی، یہودی، آتش پرست اور دوسرے اپنا لباس، طرز زندگی اور اپنا اپنا امتیازی تشخص برقرار رکھتے تھے جبکہ اکثریت کا رنگ صرف اس صورت میں اختیار کیا جا سکتا تھا اگر کوئی اسلام قبول کر لیتا تھا (یعنی لباس اور وضع قطع سے کسی کے عقیدے اور مذہب کا پتہ چل جاتا تھا)۔ یہ بھی اس امر کا ثبوت ہے کہ قبول اسلام کے حوالے سے کبھی جبر کا استعمال نہیں کیا گیا اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات

طیبہ میں بھی اس کا ہلکا سا بھی مظاہرہ نہیں ہوا۔ بلکہ فرد کی ظاہری ہیئت اپنے وقت کی سماجی روایات کی عکاس ہوتی تھی۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ کسی فرد کو دیکھتے ہی اس کے مذہبی عقائد کے بارے میں علم ہو جائے اور اس کے پیچھے سوچ یہ تھی کہ ہر طبقہ کی تہذیب اور ثقافت کا تحفظ ہو سکے اور وہ اکثریت میں مدغم ہو کر اپنی انفرادی پہچان گم نہ کر بیٹھیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد نہ تو زبان ہے اور نہ جنم بھومی یعنی وہ سرزمین جہاں کوئی پیدا ہوا بلکہ اسلام میں قومیت کی بنیاد نظریاتی تشخص یعنی مذہب ہے۔ دنیا کے تمام مسلمان دراصل ایک قوم (اُمہ) ہیں۔

(433) اسلامی مملکت میں ہر فرد کی جان، مال اور آبرو کو مکمل تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ چاہے وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم۔ شرح الھدایہ میں جو دور حاضر میں بھی اسلامی قانون کی ایک مستند دستاویز قرار دی جاتی ہے یہ شق موجود ہے۔

> ''کسی کی بدنامی ہتک یا تہمت لگانے کی ممانعت ہے چاہے ہدف مسلمان ہو یا ذمی (غیر مسلم)۔''

بحر الرائق کے مصنف جو ایک مستند فقیہہ ہیں لکھتے ہیں:

> ''مسلمان کی طرح غیر مسلم کی ہڈیاں (میت) بھی قابل احترام ہیں اور ان کی بے حرمتی کی اجازت نہیں کیونکہ اگر غیر مسلم سے اس کی زندگی میں حاصل تحفظ کی بناء پر بدسلوکی کی ممانعت ہے تو موت کے بعد اس کی میت بھی اسی قدر قابل احترام اور قابل عزت ہے۔''

تمام فقہاء کا اس بارے میں اتفاق ہے کہ مسلمان مرد کو غیر مسلم عورت کی بے حرمتی پر وہی سزا ملے گی جو مسلمان عورت کی بے حرمتی پر مقرر ہے۔

(434) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ کچھ مسلمانوں نے ایک یہودی کی زمین پر قبضہ کر کے اس پر مسجد تعمیر کر لی تھی۔ جب یہ معاملہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے علم میں آیا تو آپ نے مسجد گرا کر زمین یہودی کو واپس کرنے کا حکم دیا۔ پروفیسر کردہی (لبنانی مسیحی جنہوں نے 1933 میں ھیگ میں اسلامی قوانین Private International Law of Islam) پر کئی لیکچر دیئے، لکھتے ہیں: ''یہودی کا یہ گھر ''بیت الیہودی'' آج بھی موجود ہے اور کافی مشہور ہے۔''

ایک اور تاریخی مثال جس کا حوالہ ابن کثیر اور دوسروں نے دیا ہے، دمشق کی جامع مسجد (امویہ) کی ہے۔ ایک اموی خلیفہ نے مسجد کی توسیع کے لیے ملحقہ گرجا پر قبضہ کر لیا تھا۔ عمرؒ بن عبدالعزیز کے دور میں جب یہ شکایت ان کے پاس آئی تو انہوں نے مسجد کا وہ حصہ گرا کر چرچ کو بحال کرنے کا حکم دے دیا تاہم مسیحیوں نے ازخود اس کے عوض مالی معاوضہ حاصل کرنے کی پیشکش کی جس سے یہ معاملہ پرامن طور پر نمٹ گیا۔

(435) آیئے خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کے ایک فرمان کو دیکھیں جو آپ نے اپنے ایک گورنر کے نام جاری کیا (بحوالہ ابن سعد V، 280)

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اللہ کے بندے، امیر المؤمنین عمر (بن عبدالعزیز) کی طرف سے (گورنر) عدی بن ارطاط اور اس کے ہم نشینوں کے نام: السلام علیکم ورحمۃ اللہ:

تمام تعریفیں اللہ تعالٰی کے لیے ہیں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اما بعد: ذمیوں (غیر مسلم شہری) کے حالات کی طرف خصوصی توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ، اگر وہ بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں اور ان کا کوئی وسیلہ نہ ہو تو ان کے مصارف کی تکمیل ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر کسی ذمی کے ساتھ زیادتی کا ارتکاب ہو تو اسے قصاص لے کر دو۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا تمہارا غلام ہو جو بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے تو تم کو چاہیے کہ یا تو اس کے مصارف کا بوجھ اٹھاؤ یا پھر اسے آزاد کر دو۔ مجھ تک یہ اطلاع پہنچی ہے کہ تم شراب کی درآمد پر ٹیکس وصول کر کے بیت المال میں جمع کرتے ہو، جو خدا کی ملکیت ہے، میں تم کو خبردار کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا اور سوائے اس رقم کے جو قانونی طور پر حاصل کی گئی اور مکمل طور پر پاک ہو چاہے وہ کتنی معمولی کیوں نہ ہو، بیت المال میں جمع نہ کی جائے۔"

(436) خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کا ایک اور خط ملاحظہ ہو۔ (ابن سعد V، 252)

''رجسٹروں کو ناجائز وصولی کے بوجھ (ناانصافی پر مبنی ٹیکس) سے پاک کردو اور پرانے ریکارڈ کی بھی جانچ پڑتال کرو، اگر (ماضی میں بھی) کسی ناانصافی کا ارتکاب کیا گیا ہے چاہے متاثرہ شخص مسلمان ہو یا غیر مسلم تو اسے اس کا حق واپس کردو، اگر اس شخص کا انتقال ہو چکا ہے تو اس کا حق اس کے ورثاء کے حوالے کردو۔''

(437) یہ بات مسلمہ ہے کہ فقہا ہمسایوں کے حق شفعہ کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی غیر منقولہ جائیداد بیچنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اس کے ہمسایہ کا حق کسی اجنبی پر فائق ہے اور اس اصول کا اطلاق غیر مسلم ہمسایہ کے حوالے سے بھی ہوتا ہے۔

(438) غیر مسلموں کے حقوق کے تحفظ کی حدود کی وسعت کا یہ عالم ہے کہ اسلامی مملکت میں ان رسوم و رواج یا معمولات پر عمل کرنے کی بھی آزادی ہے جن کی قطعی طور پر اسلام میں ممانعت ہے۔ مثلاً الکوحل کے مشروبات (شراب) کی اسلام میں ممانعت ہے مگر غیر مسلم شہریوں کو نہ صرف اس کے پینے بلکہ اس کی تیاری، درآمد اور فروخت کی بھی مکمل آزادی ہے، یہی صورتحال پانسے کے کھیلوں (قمار بازی)، قریبی رشتہ داروں سے شادی اور سودی کاروبار کے بارے میں ہے۔ پرانے وقتوں میں اس سے مسلمان اثر قبول نہیں کرتے تھے اور اس آزادی کا غلط استعمال اور اس کے اثرات محدود تھے، تاہم دور جدید کے فقہاء نے بین الاقوامی تجارت کے حوالے سے اس آزادی کو قدرے محدود کیا ہے۔ شراب کے استعمال پر پابندی اس وقت تک غیر مؤثر رہے گی جب تک آبادی کے تمام طبقات کو اس کے دائرے میں نہ لایا جائے۔ اور غیر مسلموں کے نمائندوں نے اس پابندی پر رضامندی ظاہر کر کے فقہاء کے کام میں آسانی پیدا کی ہے۔

(439) اسلامی قانون غیر مسلموں کے مختلف فرقوں کے عقائد کی بنیاد پر مسلمانوں کے ساتھ ان کے انفرادی یا نجی تعلقات کے حوالے سے ایک امتیاز بھی ملحوظ رکھتا ہے۔ اسلام میں غیر مسلموں کی ''موحد'' اور ''مشرک'' کی حیثیت سے تقسیم بھی کی گئی ہے یعنی اول الذکر وہ جو خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے اور اپنے مذہب کے بانی پیغمبر پر نازل ہونے والے خدائی پیغام پر عمل پیرا ہیں اور

آخرالذکروہ جواللہ کے ایک ہونے پر یقین نہیں رکھتے (مثلاً بت پرست، دہریے، کافر وغیرہ) ان سب کو اسلامی مملکت میں ضمیر اور زندگی کا تحفظ حاصل ہوتا ہے تاہم مسلمانوں کا نجی زندگی کے حوالے سے تعلقات کا پیمانہ یہ ہے کہ مسلمان کو ایک ''موحد'' غیر مسلم خاتون سے شادی کی اجازت ہے مگر ''مشرک'' خاتون سے نہیں۔ یعنی ایک مسلمان نہ صرف کسی مسیحی یا یہودی خاتون سے شادی کرسکتا ہے بلکہ اس خاتون کو بدستور اپنے مذہب پر قائم رہنے کی بھی اجازت ہے اور وہ چرچ یا معبد میں جا کر عبادت کرنے میں آزاد ہے لیکن مسلم مرد کو کسی بت پرست یا منکر خدا خاتون سے شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ جہاں تک مسلمان عورت کا تعلق ہے تو اسے کسی درجہ کے بھی غیر مسلم مرد سے شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ مسلمانوں کو ''موحد'' غیر مسلموں کے ہاتھ کا ذبیحہ کھانے کی اجازت ہے جبکہ ''مشرک'' غیر مسلموں کا ذبیحہ کھانے کی اجازت نہیں۔

(مسلمان عورت کی غیر مسلم مرد سے شادی کی ممانعت کے پس پردہ ایک حکمت یہ ہے کہ مسلمان حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام یعنی یہودیوں اور مسیحیوں دونوں کے پیغمبروں کو سچا نبی مانتے ہیں اور ان کا احترام کرتے ہیں۔ اس لیے یہودی یا مسیحی عورت کو مسلمان مرد کے گھر میں اپنے پیغمبر کی بے حرمتی کا کوئی خوف نہیں ہوتا مگر مسلمان عورت کو یہودی یا مسیحی مرد کے گھر میں یہ سہولت حاصل نہیں ہوتی چونکہ ان دونوں مذاہب کے پیروکار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے۔ مترجم)

ترک اسلام (ارتداد):

(440) ایک اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو اپنے عقائد پر عمل کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہے اور انہیں قبول اسلام پر آمادہ کرنے کے لیے زبردستی یا جبر کی سختی سے ممانعت ہے تاہم اس کے ساتھ ساتھ اسلام اپنے پیروکاروں کی صفوں میں بھی ایک سخت نظم وضبط قائم رکھتا ہے۔ اسلامی ''قومیت'' کی بنیاد نسل، زبان یا خطہ نہیں بلکہ مذہب ہے۔ اس لیے ترک اسلام یعنی ارتداد کو سیاسی غداری یعنی قوم سے غداری قرار دیا گیا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ یہ جرم اسلام کے قانون میں قابل سزا ہے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ اس کی نوبت شاید ہی کبھی آئی ہو۔ اس دور میں بھی جب

بحرا لکاہل سے لے کر بحراوقیاس تک مسلمانوں کے پھریرے لہراتے تھے اور مسلمان سپر پاور تھے اور آج بھی جب مسلمان سیاسی، مادی اور ذہنی زوال کا شکار ہیں، ارتداد کے واقعات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہی صورتحال ان ممالک میں ہے جو نام کی حد تک اسلامی ہیں اور وہاں بھی جہاں نو آبادیاتی راج میں مسلمانوں کو ترک اسلام پر راغب کرنے کے لیے تمام تر کوششیں کی جاتی ہیں بلکہ اس کے برعکس اسلام مغربی اقوام میں جڑیں پکڑ رہا ہے اور فن لینڈ سے لے کر ناروے تک اور کینیڈا سے ارجنٹائن تک لوگ بکثرت اسلام قبول کر رہے ہیں۔ یہ صورتحال اس کے باوجود ہے کہ تبلیغ اسلام کی کسی باقاعدہ تحریک کا بھی وجود نہیں۔

جہاد:

(441) مختصراً اس موضوع کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جسے غیر مسلم حلقوں میں سب سے زیادہ غلط سمجھا گیا ہے۔ یہ ہے مقدس جنگ یا جہاد۔ ایک مسلمان کی پوری زندگی کا نظام چاہے معاملات کا تعلق دینی معاملات سے ہو یا دنیوی، اللہ کے وضع کیے ہوئے قوانین کے تابع ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان اپنی نماز اپنے مکمل قلبی یقین کے ساتھ ادا نہیں کرتا (مثلاً محض دکھاوا کرتا ہے) تو یہ عبادت نہیں بلکہ خدا کے خلاف جرم شمار ہوتی ہے۔ اس عمل کو اپنے نفس کی پوجا قرار دیا گیا ہے۔ جس کے لیے آخرت میں سزا کی وعید سنائی گئی ہے۔ اس کے برعکس فرمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ اگر کوئی مسلمان کھانا بھی کھاتا ہے اور دل میں یہ نیت رکھتا ہے کہ میں کھانا اس لیے کھا رہا ہوں کہ اللہ کے عائد کردہ فرائض کی بجا آوری کے لیے جسمانی قوت حاصل کروں تو اسے اس کھانا کھانے کا بھی ثواب ملتا ہے چاہے وہ اس حاصل کردہ قوت کو بیوی سے تلذذ حاصل کرنے پر ہی صرف کرے کیونکہ بیوی سے جسمانی قرب کا حکم بھی اللہ کا دیا ہوا ہے اور اس کی بجا آوری بھی رب کی اطاعت شمار ہوتی اور خالق کی خوشنودی کا باعث ہوتی ہے۔

(442) جہاں زندگی گزارنے کے نظریات اتنے اعلیٰ اور ارفع ہوں وہاں کوئی بھی منصفانہ جدوجہد مقدس عمل کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ اسلام میں ہر قسم کی جنگ کی ممانعت ہے سوائے کسی جائز اور ارفع مقصد کے جس کا حکم کتاب اللہ میں موجود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ سے ہمیں صرف تین قسم کی جنگوں کا حوالہ ملتا ہے۔

(1) دفاعی۔ (2) تعزیری۔ (3) احتیاطی (پیش بندی)۔

رومی شہنشاہ ہرقل کے نام اپنے مشہور خط میں، جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بازنطینی علاقے میں مسلمان سفیر کے قتل کے سلسلے میں لکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین راستے پیش کیے تھے اسلام قبول کرلو اور اگر یہ قبول نہیں تو پھر اپنی رعایا سے تعرض نہ کرو اگر وہ اسلام قبول کرنا چاہیں اور اگر یہ راستہ بھی قبول نہیں تو پھر جزیہ ادا کرو۔''

(بحوالہ ابوعبید کتاب الاموال بحوالہ پیراگراف نمبر کتاب ہذا 551)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدوجہد کا مطلوب ومقصود ضمیر کی آزادی کو مستحکم کرنا تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑی اتھارٹی اسلام میں اور کون ہے؟ مسلمانوں کا ''جہاد'' (مقدس جنگ) یہی ہے جس کا مقصد استحصال نہیں بلکہ اس کی بنیاد جذبہ قربانی پر ہے اور اس کا واحد مقصد خدا کے کلمہ کو دنیا میں پھیلانا ہے اس کے سوا باقی سب ناجائز ہے۔ لوگوں کو قبول اسلام کے لیے مجبور کرنے کے لیے جنگ کرنے کا تو اسلام میں تصور ہی نہیں۔ وہ ''مقدس'' نہیں ''غیر مقدس'' جنگ ہوگی۔

باب نمبر 13

علوم وفنون کی ترقی کیلئے مسلمانوں کی خدمات

علوم وفنون کے فروغ کے لیے مسلمانوں کی کاوشوں کا دائرہ بہت وسیع ہے اور اس کی تفصیلات کے بیان کے لیے ایک نہیں مؤرخوں کے ایک جم غفیر کی ضرورت ہے جو علوم کے ہر شعبے میں مسلمانوں کے کردار کا احاطہ کر سکیں اور اس وسیع موضوع کے سمندر کو کوزے میں بند کر سکیں۔ میری یہ حقیری کاوش ہرگز اس موضوع سے انصاف نہیں کر سکتی بلکہ یہ اس میدان میں مسلمانوں کی کامیابیوں کی محض ایک جھلک ہی دکھا سکے گی۔

عمومی رویہ:

(444) اسلام محض خالق اور بندے کے درمیان تعلق کی بنا ڈالنے والا مذہب ہی نہیں بلکہ ایک جامع نظریہ حیات ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ علوم وفنون کی جستجو کے حوالے سے اسلام کے رویہ کا تذکرہ سب سے پہلے کیا جائے۔

(445) اسلام اس دنیا میں خوشحالی کی زندگی کی حوصلہ شکنی نہیں کرتا بلکہ قرآن میں بار بار ایسی ہدایات ملتی ہیں:

> ''......پوچھو تو کہ جو زینت (و آرائش) اور کھانے (پینے) کی پاکیزہ چیزیں اللہ نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہیں، ان کو حرام کس نے کیا ہے؟ کہہ دو کہ یہ چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن خاص انہی کا حصہ ہوں گی۔......''

(32:7 ترجمہ: مولانا فتح محمد جالندھری)

قرآن مجید ان لوگوں کی توصیف کرتا ہے جو یہ دعا کرتے ہیں:

"...... پروردگار! ہم کو دنیا میں بھی نعمت عطا فرما اور آخرت میں بھی نعمت بخشیو اور دوزخ کے عذاب سے محفوظ رکھیو۔"(201:2)

اس کے علاوہ قرآن مجید انسانوں کو سکھاتا ہے:

"......اور جو (مال) تم کو اللہ نے عطا فرمایا ہے اس سے آخرت (کی بھلائی) طلب کیجئے اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلایئے......"(77:28)

یہ اسی دنیاوی خوشحالی کی کشش ہے جو انسان کو کائنات کے اسرار کا مطالعہ، جستجو اور سیکھنے کی طرف مائل کرتی ہے تاکہ انسان ان اشیاء سے فائدہ اٹھائے اور اللہ کا شکر گزار بندہ بن جائے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

"......ہم نے تمہیں زمین میں اختیارات کے ساتھ بسایا اور تمہارے لیے یہاں سامان زیست فراہم کیا، مگر تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔"

(10:7)

(ایک اور حوالہ 15:20-21)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"......وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیے پیدا کیں......"(29:2)

"......کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے، سب کو اللہ نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔......" (20:31) مزید حوالے 12,11:65.65:22,12:16.33,32,14)

ایک طرف قرآن انسانوں کو اس ذات کی عبادت کا سبق یاد دلا رہا ہے "جس نے انہیں بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا"(4:106)

جبکہ دوسری طرف انہیں اس دنیا میں حصول مقصد کے لیے جدوجہد کی تلقین کرتا ہے:

''اور یہ کہ انسان کو وہی کچھ ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔'' (39:53)

قرآن انسانوں کو نہ صرف جستجو اور مشاہدات پر آمادہ کرتا ہے { '' کہہ دو (اے پیغمبر) کہ ملک میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جو لوگ (تم سے) پہلے ہوئے ہیں ان کا کیسا انجام ہوا ہے......'' (42:30)} بلکہ نئی چیزیں دریافت کرنے کی راہ بھی سمجھا رہا ہے۔

''جو آسمان اور زمین کی پیدائش میں غور کرتے (اور کہتے) ہیں کہ اے پروردگار تو نے اس (مخلوق) کو بے فائدہ پیدا نہیں کیا......'' (191:3)

(446) حصول علم کے حوالے سے اسلام کی تاکید اور اصرار کا ثبوت یہ ہے کہ جو پہلی وحی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی اس میں پڑھنے اور لکھنے کا حکم دیا گیا اور قلم کی تحسین کی گئی۔ جو کہ انسانی علم کا واحد ذریعہ یا امین ہے۔ اور یہ وحی اس پیغمبر پر نازل ہوئی جس نے ایک ناخواندہ قوم میں جنم لیا تھا۔ پہلی وحی کے الفاظ یہ تھے:

''...... پڑھو (اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے، جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا......'' (5-1:96)

قرآن مجید میں ہم انسانوں کو یہ تلقین بھی کی گئی:

''......اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم لوگ خود نہیں جانتے......'' (43:16)

''......تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو......'' (7:21)

(اہل ذکر سے مراد عالم لوگ ہیں یعنی جو چیز آپ کو معلوم نہیں ہے اس کے بارے میں اہل علم سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے......'' مترجم)

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

''......مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے......'' (85:17)

''......ہم جس کے درجے چاہتے ہیں بلند کر دیتے ہیں، اور ایک علم رکھنے والا ایسا ہے جو ہر صاحب علم سے بالاتر ہے......'' (76:12)

اور یہ دعا کتنی خوبصورت ہے جو قرآن ہمیں سکھاتا ہے:

''......اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر......'' (114:20)

(447) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے: اللہ پر ایمان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔''

اگر اللہ پر ایمان کی تفہیم اور تبلیغ کے لیے دینی علوم کی ترویج کی ضرورت ہے تو باقی بنیادی عوامل کے لیے دنیاوی علوم کا حصول ضروری ہے۔ مثلاً نماز کے لیے منہ قبلے یعنی مکہ کی طرف ہونا لازمی ہے اور پھر نمازوں کے اوقات کی بنیاد بھی متعین قدرتی عوامل پر ہے جس کے لیے جغرافیہ اور فلکیات کے علوم کا مطالعہ ضروری ہے۔ اسی طرح روزہ میں سحر وافطار کے اوقات کا تعین بھی قدرتی عوامل کی تفہیم سے کیا جاسکتا ہے۔ یعنی طلوع اور غروب آفتاب وغیرہ۔ حج بیت اللہ کے لیے مکہ جانے والے راستوں اور ذرائع آمدورفت کے بارے میں علم ہونا چاہیے۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے حساب میں مہارت ضروری ہے جبکہ وارثت کے حصے کرنے اور اس کی تقسیم کے لیے بھی حساب کے علم کا جاننا ناگزیر ہے۔ اسی طرح قرآن مجید میں مذکور تاریخی حقائق اور سائنسی حوالوں کی روشنی میں اس کی صحیح تفہیم اور ادراک کے لیے بھی تاریخ اور جدید سائنس پر عبور حاصل کرنا چاہیے۔ مگر اس سے پہلے اس زبان کا علم ضروری ہے جس میں قرآن نازل ہوا (علم لسانیات) قرآن مجید میں جن قوموں کا ذکر آیا ان کے محل وقوع کا تعین کرنے کے لیے تاریخ اور جغرافیہ دونوں کا علم درکار ہے۔

(448) یہ حقیقت کسے معلوم نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ تشریف آوری کے فوراً بعد جو پہلا کام کیا وہ مسجد (نبوی) کی تعمیر تھی جس کا ایک حصہ تعلیم و تدریس کے لیے مخصوص تھا۔ جہاں اصحاب صُفّہ دنیاوی جھمیلوں سے الگ تھلگ حصول علم میں مصروف رہتے تھے۔ دن کو یہ حصہ طالب علموں کے لیے درس گاہ اور رات کو سونے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

(449) ''اللہ ان کی مدد فرماتے ہیں جو اللہ کی مدد کرتے ہیں۔'' یہ بات قرآن مجید میں متعدد جگہ کہی گئی ہے۔ (40:22,7:42)

یہ بات تعجب خیز نہیں کہ مسلمانوں کے پاس تبلیغ علم کے لیے کاغذ سستا اور وافر مقدار میں موجود تھا۔ کیونکہ دوسری صدی ہجری میں اسلامی مملکت کے طول وعرض میں کاغذ تیار کرنے کے کارخانے لگنا شروع ہو گئے تھے۔

(450) موضوع کو جامع اور مختصر رکھنے کے لیے ہم بحث کو چند علوم تک محدود رکھیں گے۔ جس میں مسلمانوں کی خدمات بنی نوع انسان کے لیے خاص طور پر اہم اور سودمند رہیں۔

علوم مذہب و فلسفہ:

(451) مذہبی علوم کا آغاز فطری طور پر قرآن مجید کے نزول کے ساتھ ہی ہوا جس پر مسلمانوں کا ایمان ہے کہ یہ خدائی کلام ہے۔ اللہ کا پیغام بندے کے نام۔ اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے لسانیات، گرامر، تاریخ حتیٰ کہ قیاس سمیت بہت سے علوم کے مطالعہ کی ضرورت محسوس ہوئی، جو بتدریج عمومی افادیت کیلئے الگ علوم کی شکل میں ڈھل گئے مثلاً قرآن کی تلاوت نے فن کی شکل اختیار کی اور قرأت قرآن کی ''موسیقی'' بن کر سامنے آئی (اس پر بات بعد میں ہوگی) قرآن کو محفوظ بنانے کی کوششوں کے نتیجے میں اس کے عربی متن میں بہتری پیدا ہوئی، نہ صرف صحت کے حوالے سے بلکہ اس میں نئی خوبصورتی بھی آئی۔ اعراب بندی کے بعد اس میں جو صوری اور صوتی حسن پیدا ہوا وہ اپنی جگہ جبکہ اس سے قرآن کے عربی متن کا دنیا کی کسی بھی زبان کے مقابلے میں درست ترین ہونا مستند قرار پایا۔

اسلام کے آفاقی کردار کی بدولت غیر عرب لوگوں میں قرآن کے مفاہیم کو سمجھنے کی جستجو پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں دنیا کی مختلف زبانوں میں قرآن کے تراجم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ قرآن کے غیر ملکی زبانوں میں ترجمے کا کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی شروع ہو گیا تھا اور صحابی رسولؐ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن مجید کے پہلے مترجم تھے جنہوں نے قرآن مجید کے کچھ حصوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ اس وقت سے دور حاضر تک ان گنت زبانوں میں قرآن مجید کا ترجمہ ہو چکا ہے اور ان شاء اللہ یہ کام قیامت تک جاری و ساری رہے گا۔ تاہم یہ وضاحت ضروری ہے کہ تراجم کا مقصد قرآن کی تعلیمات کو ان لوگوں کے لیے قابل فہم بنانا ہے جو عربی نہیں جانتے مگر نماز اور اذان کی ادائیگی عربی زبان میں ہی لازمی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے قرآن کے متن کو اصلی شکل میں محفوظ بنانے کے لیے جس طریقہ پر عمل شروع کیا گیا تھا وہ اب تک جاری ہے یعنی تحریری صورت اور حفظ قرآن اور اس کے نتیجے میں نہ صرف دنیا کے کونے کونے میں حسن طباعت سے آراستہ قرآن مجید کے کروڑوں نسخے گردش کر رہے ہیں بلکہ لاکھوں حفاظ کرام اسے اپنے سینوں میں بھی محفوظ کیے ہوئے ہیں اور اس دوہرے نظام کا مقصد یہی تھا کہ ایک میں رہ جانے والی غلطی کو دوسرے سے موازنہ میں ختم کیا جا سکے۔ اس لیے یہ اہتمام پہلے کیا جاتا تھا کہ قرآن مجید کی کسی بھی اشاعت سے

قبل نسخہ کو حرف اول سے آخر تک کسی ماہر حافظ کے روبرو پڑھ کر اس کی صحت کی جانچ کی جاتی تھی اور آج بھی اس عمل کے ذریعے قرآن کی درستی کی سند حاصل کی جاتی ہے۔

(452) قرآن کی طرح مسلمانوں کو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی بڑی عقیدت ہے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرامین اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات چاہے ان کا تعلق گھر کے باہر کے معاملات سے تھا یا گھریلو زندگی سے انہیں محفوظ کر لیا گیا۔ احادیث کو جمع کرنے کا کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی تحریک پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے دوران ہی شروع کر دیا گیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستہ لوگوں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے براہ راست سننے والوں سے احادیث جمع کرنے کا کام جاری رہا چونکہ قرآن کے اصل صورت میں محفوظ ہونے پر اصرار کی بنیاد اس کے لیے ترسیل اور اشاعت کے ذرائع کے قابل اعتماد ہونے پر ہے۔ اس لیے احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آئندہ نسلوں تک محفوظ اور اصل صورت میں پہنچانے کے لیے حد درجہ احتیاط ملحوظ رکھی گئی۔ اس کی ضرورت اس وجہ سے بھی تھی کہ حضرت نوح، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام، گوتم بدھ اور اسی طرح ماضی کی عظیم شخصیات کی زندگی کے بارے میں تو چند صفحات سے زیادہ مواد موجود نہیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کے ہر ہر پہلو پر سینکڑوں صفحات کی تفصیلات موجود ہیں۔

(453) اسلام کے قیاسی نقطہ نظر سے خصوصاً عقائد اور اصولوں کے معاملے میں ظاہر ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں ہی جو بحثیں شروع ہو گئی تھیں وہ بعد میں مختلف علوم کی وجہ بنیاد بن گئی۔ مثلاً کلام (مذہب کی منطقی تشریح کا علم) اور تصوف (باطنی، روشنی، روحانیت) غیر مسلموں کے ساتھ بلکہ خود مسلمانوں کے اندر ہونے والے مناظروں کے دوران بیرونی مثلاً یونانی اور ہندوستانی فلاسفی وغیرہ کے کئی عناصر بھی در آئے۔ بعد میں تو خود مسلمانوں کے اندر ایسے عظیم فلاسفروں نے جنم لیا جو تبحر علمی سے مالا مال تھے۔ الکندی، الفارابی، ابن سینا اور ابن الرشد تو آسمان علم کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ خوش قسمتی سے بیرونی علمی کتابوں کے عربی میں تراجم کے باعث آج گو یونانی اور سنسکرت زبان میں لکھے گئے سینکڑوں شاہکار تو امتداد زمانہ کی نذر ہو چکے مگر وہ علمی اثاثہ بعد میں آنے والوں کے لیے عربی تراجم کی شکل میں محفوظ رہا۔

علوم جدید:

(454) عمرانی علوم کی ترقی میں مسلمانوں کا کردار بہت اہم ہے۔اسلامی علم کی ایک قابل ذکر خصوصیت اس کا تیزی سے پھیلاؤ ہے۔قرآن مجید عربی زبان میں لکھی گئی پہلی کتاب ہے۔صرف دوسو سال بعد ناخواندہ قوم کی یہ زبان دنیا کی عظیم ترین زبانوں میں شمار ہونے لگی اور بعد کے برسوں میں تو عربی نہ صرف دنیا کی وسیع ترین زبان بن گئی بلکہ اس نے تمام علوم کی تدریس کے لیے بین الاقوامی زبان کا بھی درجہ حاصل کرلیا۔اس ترقی کی وجوہات کا تعین چھوڑ کر ہم ایک اور حقیقت پرغور کرتے ہیں۔اولین مسلمانوں کی اکثریت عرب تھی اورانہوں نے زبان کے سوا اپنی شخصیت اور پہچان مٹا ڈالی تا کہ ہرنسل کے لوگ برابری کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہوسکیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہرنسل کے مسلمانوں نے ''اسلامی'' علوم کی ترقی میں حصہ لیا۔ان میں عربوں کے ساتھ ایرانی، یونانی، ترک، حبشی، بربر، ہندوستانی اور دوسری اقوام کے مسلمان شامل تھے۔ان میں مذہبی رواداری کا یہ عالم اور علم کی سرپرستی کا جذبہ اس قدر قوی تھا کہ مسیحی، یہودی، مجوسی، بدھ اور دوسرے مذاہب کے لوگ نہ صرف اپنے مذہبی لٹریچر بلکہ دوسرے علوم کو عربی میں منتقل کرنے کے لیے خدمات فراہم کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے تھے۔عربی دنیا کی کسی اور زبان کے مقابلے میں زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ مسلمان سلطنت کی سرکاری زبان تھی جو چین سے لے کر سپین تک پھیلا ہوا تھا۔

قانون:

(455) علم قانون نے اپنے جامع کردار میں مسلمانوں کے اندر بہت ابتداء میں جڑ پکڑ لی تھی اور ان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ مسلمان ہی تھے جنھوں نے دنیا میں پہلی بار قانون کے بحیثیت ایک علم کے تصور کو عملی شکل دی، جو ملک کے دوسرے عام قوانین سے الگ ایک چیز تھی۔زمانہ قدیم کے لوگوں کے اپنے قوانین تھے جو کم وبیش مکمل حالت بلکہ باضابطہ مجموعہ قوانین کی شکل میں موجود تھے لیکن ایک ایسے علم کی ضرورت تھی جس کے ذریعے قانون کے فلسفہ اور ذرائع کو جانچا جاسکتا اور قانون سازی، قانون کی تشریح اور اطلاق وغیرہ کے طریق کار کا تعین کیا جاسکتا اور یہ تصور اسلام

سے قبل کسی ماہر قانون کے دماغ میں نہ آیا تھا۔ دوسری صدی ہجری (8 ویں صدی عیسوی) سے مسلمانوں نے اس کام کی ابتداء کی اور اسے اصول الفقہ کا نام دیا گیا۔

(456) قدیم ایام میں بین الاقوامی قانون، نہ تو بین الاقوامی تھا اور نہ ہی قانون تھا، یہ سیاسیات کا حصہ تھا اور اس کا انحصار سیاست دانوں کی صوابدید اور رحم و کرم پر تھا۔ اس کے علاوہ اس کے قواعد وضوابط کا اطلاق چند ہی ریاستوں پر ہوتا تھا جن میں ایک ہی نسل کے لوگ آباد ہوتے تھے جن کا مذہب اور زبان ایک ہی ہوتی۔ یہ مسلمان تھے جنہوں نے پہلی بار اسے قانونی نظام میں جگہ دی اور حقوق اور ذمہ داریوں کے تصور کی تخلیق کی۔ اس کی موجودگی بین الاقوامی قانون کے قواعد میں دیکھی جاسکتی ہے جو بالکل ابتدائی ایام سے مسلم لاء کے مجموعوں میں ایک خصوصی باب کی حیثیت سے موجود ہیں۔ اسلامی قوانین کی قدیم ترین باضابطہ تحریری شکل میں موجودگی زید بن علی کی ''مجموع'' کی صورت میں ہے جن کا انتقال 120 ہجری/737 عیسوی میں ہوا۔ اس مجموعہ قوانین میں زیر بحث باب بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے اس موضوع کو ایک الگ مضمون کے طور پر ترقی دی اور دوسری صدی ہجری کے وسط سے بھی پہلے اس موضوع پر مختصر مقالوں کی ''سیر'' کے عنوان سے موجودگی کے شواہد ملتے ہیں۔ ابن حجر توالی التاسیس میں لکھتے ہیں کہ اس نوعیت کا پہلا مقالہ ابوحنیفہؒ کے قلم سے تخلیق ہوا جو زید بن علیؒ کے ہم عصر تھے۔ اس بین الاقوامی قانون کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر ملکیوں میں کوئی امتیاز نہیں برتا گیا۔ اس میں مسلم ممالک کے باہمی تعلقات کے معاملے کو نہیں چھیڑا گیا بلکہ صرف دنیا بھر کے غیر مسلم ممالک کے ساتھ معاملات کو ہی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اصولی طور پر تمام مسلمانوں کو ایک ہی امت تصور کرتا ہے۔

(457) قانونی شعبے میں مسلمانوں کی ایک اور خدمت تقابلی نظیری قانون (سابقہ فیصلوں کی نظیر کی بنیاد پر بننے والا قانون) کے حوالے سے ہے۔ مختلف مکاتب فکر کی طرف سے ایک ہی معاملے پر مختلف فیصلوں سے اس قسم کے مطالعے کی ضرورت محسوس ہوئی تا کہ اختلافی فیصلوں کی وجوہ قلمبند کی جاسکیں اور ایک مخصوص قانون پر اس اختلاف کے اثرات کا جائزہ لیا جاسکے۔ اس موضوع پر دبوسی اور ابن رشد کی تحقیقی کتابیں حکم کا درجہ رکھتی ہیں۔ سیموری نے تقابلی قانون یا قانون کے طریق کار (اصول الفقہ) کے بارے میں بھی لکھا ہے۔

(458) ریاست کا تحریری آئین بھی مسلمانوں نے متعارف کرایا اور اس آئین کے مصنف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں ایک شہری ریاست قائم کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ایک تحریری آئین عطا کیا اور یہ دستاویز مکمل شکل میں اب تک محفوظ ہے جس کے لیے ہم ابن ہشام اور ابو عبید کے مرہون احسان ہیں۔ اس آئین کے مندرجات کی 42 مختلف شقوں میں تقسیم کی جا سکتی ہے۔ اس میں واضح طور پر انتظامیہ، مقننہ، عدلیہ، دفاع کے حوالے سے براہ راست وفاقی یونٹوں اور شہریوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کی مکمل وضاحت کی گئی ہے۔ یہ آئین 622ء میں نافذ ہوا۔

(459) قانون کے شعبے میں اصطلاحات کا استعمال دوسری صدی ہجری سے شروع ہوا۔ ان کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے: عقیدہ یا مذہب کی روایات، ہر قسم کے معاہداتی تعلقات اور سزائیں، اسلام کے جامع نظریہ حیات کے حوالے سے اس میں مسجد اور ایوان اقتدار میں کوئی حد فاصل نہیں یعنی مذہب اور سیاست کوئی الگ الگ چیزیں نہیں۔ ریاست کا نظریہ یا آئینی قانون مذہب کا حصہ ہی شمار ہوتا ہے کیونکہ سربراہ ریاست ہی نماز کی امامت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ریاستی محاصل اور آمدنی کے ذرائع بھی عقیدے کا حصہ ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اسلام کے بنیادی ستونوں میں شمار کیا۔ یعنی نماز، روزہ، حج، زکوۃ (وعشر)

بین الاقوامی قانون سزاؤں کا حصہ ہے۔ جنگ سے متعلق قوانین وہی ہیں جو حملہ آور قزاقوں، لٹیروں اور قانون اور معاہدے توڑنے والوں سے نمٹنے کے لیے ہیں۔

(460) اسلام میں قانون سے متعلق نقطہ نظر جامع اور گہرا ہے اس لیے اس موضوع کو تفصیل سے زیر بحث لایا گیا ہے۔

تاریخ اور سماجیات:

(461) ان دو شعبوں میں مسلمانوں کا حصہ دو حوالوں سے اہم ہے: پہلا روایات کے مصدقہ ہونے کی ضمانت اور دوسرا تاریخ کی کتابوں میں چھوٹی چھوٹی تفصیلات فراہم کر کے انہیں محفوظ کرنے کا اہتمام۔ اسلام کا ظہور تاریخ کی مکمل روشنی میں ہوا، اس لیے اسے مبالغہ آمیزی پر مبنی روایات اور سنی سنائی باتوں کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک دوسری اقوام کا تعلق ہے ان سے متعلق

تفصیلات بیان کرتے وقت پیشہ وارانہ دیانت کا مظاہرہ کیا گیا۔ تاہم اسلام کے دور حاضر کی تاریخ کے بارے میں بھی ضروری ہے کہ اسے بھی اسی طرح دیانت اور امانت کا نمونہ بنایا جائے۔

ایک دور تھا جب عدالتوں میں گواہوں کی تصدیق ہی انصاف تک پہنچنے کا واحد وسیلہ تھی اور مسلمانوں نے اس اصول کا اطلاق تاریخ نگاری پر بھی کیا اور واقعہ کی تصدیق ضروری قرار دی گئی۔ پہلی نسل میں اگر کسی روایت کی تصدیق ایک گواہ سے کافی سمجھی گئی تو دوسری نسل میں دو گواہوں کی تصدیق کا اہتمام کیا گیا۔ انداز یہ تھا کہ "میں نے الف کو یہ کہتے ہوئے سنا اس نے بتایا کہ اس نے یہ بات ب سے سنی جو اس واقعہ کے رونما ہونے کے موقع کا عینی شاہد تھا۔" اور پھر واقعہ کی تفصیل بیان کی جاتی۔

اسی طرح تیسری نسل میں تین ذرائع سے تصدیق کی ضرورت محسوس کی گئی اور اس طرح یہ سلسلہ بڑھتا رہا۔ ان طویل حوالوں سے راویوں کی زنجیر کا سرا واقعہ کے مقام اور وقت تک پہنچانا ممکن ہوا اور اس سے واقعہ کی سچائی کی بھی ضمانت حاصل ہوئی۔ کیونکہ کسی بھی راوی کے سوانحی خاکہ کا حوالہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ جس میں نہ صرف اس کے ذاتی شخصیت کے خدوخال بلکہ ان کے اساتذہ اور نمایاں شاگردوں کا تذکرہ بھی مل جاتا ہے۔ (جس سے یہ اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے کہ راوی کس حد تک قابل اعتماد ہے) اس قسم کی شہادتوں کا اہتمام نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کے بیان میں کیا گیا بلکہ علم کی تمام شاخوں کے لیے جو ایک نسل سے دوسری کو منتقل ہوئیں حتیٰ کہ بعض تفریحات اور وقت گزاری کے لیے ہونے والی سرگرمیوں کی تفصیلات بھی اسی صحت کے ساتھ دوسری نسل کو منتقل کی گئیں۔

(462) قاموس مشاہیر یا اسماء الرجال مسلم تاریخی ادب کی ایک منفرد خصوصیت ہے۔ ان کو پیشوں، قصبات، خطوں، صدیوں یا ادوار وغیرہ کی بنیاد پر مرتب کیا گیا۔ اس کے علاوہ خصوصاً عربوں میں شجرہ نسب کو غیر معمولی اہمیت دی گئی اور اس طرح کسی نہ کسی حیثیت سے ممتاز حیثیت کی حامل لاکھوں شخصیات کے باہمی رشتوں کا خاکہ ایک نظر میں دیکھا جا سکتا تھا جس سے واقعات کی تہہ تک پہنچنے کے لیے متجسس محققین کا کام آسان ہو گیا۔

(463) جہاں تک خالصتاً تاریخ کا تعلق ہے مسلم مؤرخوں کی نگارشات کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے پوری دنیا کی تاریخ کو موضوع بنایا۔ اگر قبل از اسلام کے لوگوں نے اپنی اپنی قوم کی تاریخ لکھی تو یہ مسلمان تھے جنہوں نے عالمی تاریخ کو قلمبند کرنا شروع کیا۔ مثلاً ابن اسحاق نے جو

قدیم ترین مسلم مؤرخوں میں انتہائی ممتاز شخصیت کے حامل ہیں (انتقال 769ء) نہ صرف تخلیق کائنات اور تاریخ آدم کو موضوع بنایا بلکہ اپنے دور کی دیگر اقوام کا تذکرہ بھی کیا اور ان کے اس انداز اور طریق کو ان کے بعد آنے والے مؤرخوں الطبری، المسعودی، مسکویہ، سعید الاندلسی، رشید الدین خان اور دوسروں نے اوج کمال تک پہنچایا۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ان مؤرخوں نے جیسا کہ الطبری نے اپنے کام کا آغاز اپنے دور کے معروف نظریات کے تذکرہ سے کیا۔ ابن خلدون نے اپنی مشہور تصنیف "مقدمہ" میں ان معاشرتی اور فلسفیاتی، بحث مباحثوں میں ذرا گہرائی تک غوطہ لگایا ہے۔

(464) اس سے قبل ہی پہلی صدی ہجری میں تاریخ کی دو شاخیں الگ الگ متوازی انداز میں فروغ پانا شروع ہو گئی تھیں تاہم بعد میں یہ آپس میں مل کر ایک ہو گئیں۔ ان میں سے ایک تو اسلام کی تاریخ تھی جس کا آغاز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ سے ہوا اور پھر یہ خلافت راشدہ کے ادوار کو سمیٹتی ہوئی آگے بڑھی۔ دوسری غیر مسلموں کی تاریخ تھی چاہے اس کا تعلق قبل از اسلام کے عرب یا بیرون عرب کے ممالک مثلاً ایران، روم وغیرہ کی تاریخ سے تھا۔ اس کی ایک نمایاں مثال رشید الدین خان کی تاریخ ہے جس کا بڑا حصہ اب بھی شرمندہ اشاعت ہے۔ یہ تصنیف بیک وقت عربی اور فارسی میں تحریر کی گئی اور اس میں پیغمبروں اور خلفاء کے ساتھ ساتھ مسیحی یورپ اور روم، چین، ہندوستان اور منگولیا وغیرہ کے بادشاہوں کا تذکرہ بھی ہے۔

جغرافیہ اور نقشہ نویسی:

(465) سفر حج اور وسیع اسلامی سلطنت میں تجارتی سرگرمیوں کے لیے ذرائع مواصلات کی ضرورت تھی۔ بلاذری اور ابن جوزی لکھتے ہیں:

"ہر دفعہ جب بھی اسلامی سلطنت جو ترکستان سے مصر تک کے وسیع علاقے پر محیط تھی، کے کسی مرکز تک ڈاک روانہ کی جاتی اور ایسا بالعموم روزانہ ہی ہوتا تھا تو خلیفہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کا عام اعلان کرتے تاکہ شہریوں کے ذاتی خطوط بھی سرکاری ڈاک سے بھیجے جاسکیں۔

محکمہ ڈاک کے کارپرداز آمد و رفت کے راستوں کے نقشے تیار کرتے تھے، اور اس کے ساتھ ہر مقام کی تاریخی و معاشی اہمیت پر بھی خاصی تفصیلات شامل ہوتی تھیں۔ جگہوں کے نام عام طور پر حروف تہجی کے حساب سے لکھے جاتے۔ اس جغرافیائی ادب نے دوسرے سائنسی علوم کی راہ ہموار

کی۔بطلیموس کے جغرافیہ کا عربی میں ترجمہ کیا گیا اور اسی طرح ہندوستانی لکھاریوں کی کتابیں سنسکرت سے عربی میں منتقل کی گئیں۔اس دور کے سفرناموں نے عام آدمی کے علم میں بہت اضافہ کیا۔

ابوحنیفہؒ (وفات 767ء) کا ایک مکالمہ (المناقب ابی حنیفہ) جسے الموفق نے مرتب کیا، قابل ذکر ہے۔(1-161):

معتزلہ کے ایک پیروکار نے آپ سے پوچھا کہ زمین کا مرکز کہاں ہے تو انہوں نے جواب دیا: ''عین اس جگہ جہاں تم اس وقت بیٹھے ہو۔'' یہ جواب صرف اس صورت میں دیا جا سکتا ہے اگر وہ یہ بتانا چاہتا ہو کہ زمین گول ہے۔یہ بات قابل ذکر ہے کہ دنیا کے جو سب سے پہلے نقشے بنائے گئے اور وہ مسلمانوں نے ہی بنائے ان میں زمین کو گول ہی رکھا گیا تھا۔ابن ہوقل (975ء) کے تیار کردہ دنیا کے نقشے میں مشرق قریب کے ممالک اور بحیرہ روم کو پہچاننے میں ہرگز کوئی دقت نہیں ہوتی۔الادریسی کے نقشے کو دیکھ کر جو اس نے سسلی کے شاہ راجر کے لیے بنایا تھا (54.1101) ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ اس نے صحت اور درستگی کا اس قدر اہتمام کیا کہ اس نے دریائے نیل کے سرچشموں اور معاون دریاؤں کو بھی نقشے میں ظاہر کر دیا۔یہ امر قابل ذکر ہے کہ عرب مسلمانوں کے ان نقشوں میں جنوب کو اوپر اور شمال کو نیچے کی طرف ظاہر کیا گیا تھا۔بحری سفروں سے طول بلد اور عرض بلد کی پیمائشوں کی ضرورت سامنے آئی اور اصطرلاب اور دوسرے بحری آلات کے استعمال کی ضرورت پیش آئی۔سکینڈے نیویا، فن لینڈ، روس، کازان جیسے ممالک میں ہونے والی کھدائیوں کے نتیجے میں مسلمانوں کے ڈھالے ہوئے ہزاروں سکے برآمد ہوئے جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ مسلمان تاجروں کی سرگرمیوں کا دائرہ ان دور دراز خطوں تک پھیلا ہوا تھا اور قرون وسطیٰ میں ان کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت معمول کی بات تھی۔ابن ماجد جس نے ہندوستان جیسے دور افتادہ ملک تک واسکوڈی گاما کی رہنمائی کی۔قطب نما کا ذکر کرتا ہے کہ اس کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔مسلمان جہاز رانوں نے بحری راستوں کے بارے میں مہارت سے ایک دنیا کو حیران کر رکھا تھا اور بصرہ (عراق) چین تک کے سمندری راستوں پر یہ آزادانہ پھریرے لہراتے پھرتے تھے۔آج کے معروف الفاظ آرسینل (اسلحہ خانہ) ایڈمرل (امیرالبحر) کیبل (جہاز کا رسہ، بحری تار) مان سون (بارش کا سسٹم) Douane (دیوان) Tariff (نرخ نامہ، محصول نامہ درآمد برآمد) درحقیقت عربی الاصل ہیں جو جدید مغربی تہذیب پر مسلمانوں کے اثرات کا واضح ثبوت ہیں۔

علم فلکیات (علم ہیئت):

(466) بہت سے ستاروں کی دریافت اور ان کے مطالعے اور مشاہدے کے حوالے سے مسلمانوں کی قابل قدر اور نا قابل فراموش خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے اور مغربی زبانوں میں آج بھی بہت سے ستارے عربی ناموں سے ہی معروف ہیں۔ سورج پر دھبوں کا انکشاف ابن رشد نے سب سے پہلے کیا تھا۔ کیلنڈر میں عمر الخیام کی متعارف کی گئی اصلاحات گریگوری سے زیادہ دوررس ہیں۔ قبل از اسلام کے عرب بدو فلکی مشاہدے سے درست ترین نتائج حاصل کرنے پر قادر تھے اور وہ نہ صرف اس مہارت سے شبینہ صحرائی سفر اور مہم جوئیوں میں فائدہ اٹھاتے بلکہ موسمیاتی پیش گوئی یعنی بارش وغیرہ کے لیے بھی اس کا استعمال کرتے۔ ''کتاب الانواع'' عربوں کی علمی وسعت کے حوالے سے معلومات کا خزانہ ہے۔ بعد میں سنسکرت، یونانی اور دوسری زبانوں کی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں۔ اس طرح مختلف علاقوں سے جمع ہونے والے علمی نتائج چونکہ بعض اوقات ایک دوسرے سے متعلق ہوتے تھے جس سے نئے تجربات اور مشاہدات کی ضرورت محسوس ہوئی، جگہ جگہ رصد گاہیں قائم ہو گئیں۔ خلیفہ مامون الرشید کے حکم پر زمین کے قطر کی پیمائش کی گئی اور جس کے نتائج کی درستگی حیران کن ہے۔ اس کے علاوہ سمندری جوار بھاٹا، صبح صادق، سحر و شام، قوس قزح، ہالہ اور سب سے بڑھ کر سورج اور چاند اور ان کی گردش کے بارے میں تحقیقی کاوشیں بہت ابتداء میں مرتب کر لی گئیں کیونکہ ان کا نماز اور روزے کے اوقات کے معاملے میں براہ راست تعلق ہے۔

نیچرل سائنس:

(467) اسلامی علوم کے اس پہلو کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں غیر جانبدارانہ تجربے اور مشاہدے پر زور دیا گیا ہے۔ عربوں کا طریقہ کار منفرد اور شاندار تھا۔ مصنفین جدید علوم کے مطالعے کا آغاز اس طرح کرتے تھے کہ منتخب فنی اصطلاحات کی لغات تیار کر لیتے جن کے مترادف ان کی اپنی زبان کے اندر موجود ہوتے۔ انتہائی صبر اور استقامت کے ساتھ وہ شاعری اور نثر کی کتابوں کو کھنگالتے اور ان میں سے اصطلاحات منتخب کر کے ضروری حوالوں کے ساتھ محفوظ کر لیتے۔ اور ان کی الگ الگ موضوعات مثلاً علم تشریح الابدان (اناٹومی) حیوانیات (زوالوجی)

نباتیات (باٹنی) فلکیات (اسٹرانومی) اور علم معدنیات (منرالوجی) کے مطابق تبویب بندی کر لی جاتی ہر آنے والی نسل اپنے پیشروؤں کے کام پر نظر ثانی کر کے اس میں کچھ نئی چیزوں کا اضافہ کرتی رہتی۔ الفاظ کی یہ سادہ سی فہرستیں اس وقت انتہائی مفید ثابت ہوئیں جب تراجم کا کام شروع ہوا اور ایسا بہت کم ہوا کہ کسی غیر ملکی لفظ کا مترادف عربی میں موجود نہ ہو اور اس کی بجائے وہ لفظ بغیر ترجمہ کئے اپنانا پڑا یا اسے عربی سانچے میں ڈھالنا پڑا۔

(468) باٹنی میں استعمال ہونے والے الفاظ بہت اچھی مثال ہیں۔ سوائے ان پودوں کے نام کے جو اسلامی سلطنت میں نہیں پائے جاتے، کوئی ایک بھی ایسی غیر ملکی فنی اصطلاح نہیں جس کا عربی مترادف دستیاب نہ ہو۔ کتاب النبات: انسائیکلوپیڈیا ہرٹیکا آف الدینوری (وفات 895) چھ ضخیم جلدوں میں اس وقت لکھی گئی جب ابھی اس مضمون کی یونانی کتب میں سے ایک کا بھی ترجمہ عربی میں نہیں ہوا تھا۔ سلمبرگ کے الفاظ میں:

> "ایک ہزار سال کے مطالعے کے بعد یونانی باٹنی Dioscorides اور Theophrastus کی تخلیقات کی صورت میں سامنے آئی مگر اس موضوع پر پہلی مسلم کاوش الدینوری کی کتاب النبات نے ان دونوں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اس کی کتاب ان دونوں سے وسیع اور جامع ہے[1]۔"

الدینوری نہ صرف ہر پودے کی ظاہری ہیئت اور بیرونی تفصیلات بلکہ اس کے غذائی اور طبی خواص بھی بیان کرتا ہے۔ اس نے ان کی درجہ بندی کی ہے اور یہ تک بتایا ہے کہ یہ پودا کیسی آب و ہوا اور زمین میں نشو و نما پاتا ہے۔

---

[1] اس کے اصل الفاظ یہ ہیں:

> "بہر حال یہ امر انتہائی حیرت کا موجب ہے کہ باٹنی کا تمام قدیم لٹریچر دو کتابوں پر مشتمل ہے جس کا ہماری کتاب (الدینوری) بخوبی مقابلہ کرتی ہے۔ یہ کس طرح ممکن ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی علمی زندگی کی بالکل ابتداء میں یونانیوں جیسی ذہین و فطین اور علم سے بہرہ ور قوم کے ہم پلہ مقام حاصل کر لیا جبکہ ان کو اس میدان میں پیچھے چھوڑ دیا۔"

Zeilschrift feur Assyriologis, Strassberg
Vol.24-25, 1910-1911, Sec Vol. xxv, 44

طبی سائنس:

(469) مسلمانوں کے زیر سایہ طب نے بھی غیر معمولی ترقی کی۔ علم تشریح الابدان (اناٹومی) اور ادویہ سازی کے علاوہ ہسپتالوں کے نظم ونسق اور ڈاکٹروں کی تربیت کے شعبے میں مسلمانوں کا ریکارڈ قابل رشک ہے۔ ڈاکٹروں کو پریکٹس کی اجازت دینے سے قبل ان کا باقاعدہ امتحان ہوتا تھا۔ روم (شام)، ہندوستان، چین اور بعض دوسرے ممالک کے ساتھ سرحدیں مشترکہ ہونے کے باعث ان ممالک کی طبی روایات مسلم معاشرے نے بھی قبول کیں اور مسلمانوں میں طبی علم اور طریق علاج بیرونی امتزاج سے ''بین الاقوامی'' شکل اختیار کر گیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں نے نئی تحقیق سے اس میں گراں قدر اضافے بھی کئے اور ماضی قریب تک مغرب کی تمام طبی تعلیم وتدریس کا انحصار رازی، ابن سینا، ابوقاسم اور دوسرے مسلمان ماہرین طب کی تخلیقات پر رہا اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ ابن النفیس کے مطابق طب کی دنیا کے یہ بڑے نام جسم میں خون کی گردش کے نظام سے آگاہ تھے۔

علم بصریات:

(470) دنیا خاص طور پر اس علم کے لیے مسلمانوں کی مرہون احسان ہے۔ الکندی کی شعاعوں کے بارے میں کتاب (9ویں صدی عیسوی) یونانیوں کے آتشی شیشوں کے بارے میں تحقیق سے بہت پہلے منظر عام پر آ چکی تھی۔ ابن الہیثم (965ء) کا دور الکندی کے بعد کا ہے اور اسے عالمی سطح پر جو مقام حاصل ہے وہ بجا طور پر اس کا مستحق ہے۔ الکندی، الفارابی، ابن سینا، البیرونی اور کتنے ہی ممتاز نام ہیں جو مسلمانوں کی علمی ترقی کی علامت ہیں اور جنہیں جدید علوم کی تاریخ میں لافانی مقام حاصل ہے۔

علم معدنیات، میکانیات وغیرہ:

(471) اس شعبے نے بھی پڑھے لکھے طبقے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی، طبی نقطہ نگاہ سے بھی اور قیمتی پتھروں کی طبقہ امرا کے لیے درجہ بندی کے لیے بھی، اس شعبے میں البیرونی کی تحقیق آج بھی کارآمد ہے۔

(472) ابن فرناس (وفات 888ء) نے ایک ایسی مشین ایجاد کی تھی جس کی مدد سے اس نے کافی فاصلہ ہوا میں اڑ کر طے کیا۔ اس کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ بدقسمتی سے اس نے کوئی ایسا جانشین یا شاگرد بھی نہ چھوڑا جو اس کے ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتا۔ اس کے علاوہ بعض افراد نے ایسی مشینی آلات ایجاد کیے جو ڈوبے ہوئے بحری جہازوں کو نکال سکتے تھے جبکہ ان کی مدد سے بڑے بڑے درختوں کو آسانی سے زمین میں سے کھینچا جا سکتا تھا۔

(473) جہاں تک زیر آب علوم کا تعلق ہے۔ موتی پیدا کرنے والی مچھلیوں اور سیپیوں کے استعمال پر ان گنت تحقیقی مضامین لکھے گئے۔

حیوانیات:

(474) جنگلی جانوروں اور پرندوں کی زندگی کا مشاہدہ عرب کے صحرا نشینوں کو بہت مرغوب تھا۔ الجاحز (وفات 868) نے اس موضوع پر ضخیم مواد چھوڑا جس میں اس نے ارتقا کا حوالہ بھی دیا۔ اس نظریہ کو بعد میں مسکویہ، القزوینی، الدمیری اور دوسروں نے پروان چڑھایا۔ عقابوں کی زندگی پر ہونے والے کام کا تو ذکر ہی کیا کہ پالے اور سدھائے ہوئے شکاری پرندوں کے ذریعے پرندوں کا شکار معمول تھا۔

علم کیمیا و طبیعات:

(475) قرآن نے جگہ جگہ مسلمانوں کو کائنات کی تخلیق پر غور و غوض کرنے اور یہ مطالعہ کرنے کی تلقین کی ہے کہ کس طرح آسمان اور زمین انسان کی دسترس میں دیئے گئے۔ اس لیے اسلام میں عقیدہ اور دلیل کے مابین کبھی کشمکش پیدا نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے بالکل ابتداء ہی میں کیمیا اور طبیعات کا ترقی پسندانہ انداز میں بڑی سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ سائنس پر کام کا سہرا خائید بن یزید (وفات 704) اور بڑی حد تک عظیم فقیہہ جعفر الصادق (وفات 765ء) اور ان کے شاگرد جابر بن حیان (776ء) کے سر باندھا جاتا ہے ان کے کام کی خاص بات یہ تھی کہ یہ محض قیاسات نہیں تھے بلکہ بامقصد تجربات اور مشاہدات کے ذریعے انہوں نے حقائق حاصل کیے تھے۔ ان کے اثرات کے نتیجے میں قدیم کیمیا کو ایک باضابطہ سائنس کے قالب میں ڈھال دیا گیا جس کی بنیاد حقائق پر تھی اور جسے عملاً ثابت کیا جا سکتا تھا۔ جب کہ جابر (بن

حیان) پہلے ہی عمل تکسید، تخلیص (کچ دھات سے اصل دھات حاصل کرنا) سے آگاہ تھا اور اس نے تبخیر، تصعید اور عمل قلماؤ کے طریقے بھی وضع کئے تھے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کے انسانی علوم کے حصول کے لیے انتہائی صبر اور استقامت کے ساتھ صدیوں اور نسلوں کے کام کی ضرورت ہوتی ہے۔ لاطینی زبان میں جابر بن حیان کی تحقیق کے تراجم کی موجودگی جو طویل عرصہ تک یورپ میں درسی کتب کے طور پر مروج رہے، بجا طور پر اس حقیقت کا اظہار ہے کہ جدید سائنس کس درجہ مسلمان سائنس دانوں کی عرق ریزی کی مرہون احسان ہے اور اہل یورپ کی تیز رفتار سائنسی ترقی عرب مسلمانوں کے عملی تجربات کی بھٹی سے صیقل تحقیق سے استفادہ کا نتیجہ ہے نہ کہ یونانیوں کے قیاسات پر مبنی نظریات پر مغز ماری کرنے کا۔

ریاضی:

(476) ریاضیاتی سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ الجبرا، زیرو، صفر وغیرہ اصطلاحات کی بنیاد عربی ہے۔ الخوارزمی، عمر الخیام، البیرونی اور دوسرے مسلمانوں کے نام اقلیدس اور سدھنتا کے ہندوستانی مصنف کے علاوہ دوسری ہم پلہ عظیم شخصیات کے ساتھ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ موجود رہیں گے۔ مثلث کے وجود سے یونانی لاعلم تھے۔ اس کی دریافت کا سہرا بھی مسلمان ریاضی دانوں کے سر ہے۔

خلاصہ:

(477) مسلمان سلطنتوں میں جدید علوم کی درس و تدریس کا سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک مشرق میں بغداد اور مغرب میں قرطبہ اور غرناطہ پر قیامت نہ ٹوٹ پڑی۔ یہ دونوں سلطنتیں اسلامی دنیا میں علم و ادب کا سب سے بڑا مرکز تھیں۔ ان مراکز پر ایسے وحشیوں کا قبضہ ہو گیا جن کا علم و ادب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا، ایسے وقت میں جب ابھی چھاپہ خانے وجود میں نہ آئے تھے ان دونوں مقامات پر لائبریریوں میں موجود لاکھوں کی تعداد میں نادر و نایاب قلمی مخطوطے جلا کر راکھ بنا دیئے گئے۔ یہ ایک ناقابل تلافی نقصان تھا جس کی داستان خون کے آنسو رلا دیتی ہے۔ ان مقامات پر وسیع پیمانے پر جو قتل عام ہوا اس سے مختلف علوم کے ماہرین بھی نہ بچ سکے اور ان کی بڑی تعداد اس خون ریزی کی بھینٹ چڑھ گئی۔

ایک دفعہ جب کوئی تہذیب اس طرح تباہی کے بعد زوال کا شکار ہو جاتی ہے تو اسے سنبھلنے میں صدیوں کی جدوجہد درکار ہوتی ہے۔ اور اس عمل کے دوران ان قوموں کی تاریخ کا مطالعہ بھی رہنمائی کرتا ہے جو کبھی عظیم تہذیبوں کی علمبردار تھیں اور پھر زوال کے گڑھوں میں گرنے کے بعد طویل جدوجہد کے بعد دوبارہ اپنے قدموں پر کھڑی ہونے میں کامیاب ہوئیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ کردار اور قائدانہ صلاحیتوں کی حامل نابغہ روزگار شخصیات مرضی سے پیدا نہیں کی جاسکتیں بلکہ قادر مطلق کا کسی قوم کے لیے عطیہ ہوتی ہیں۔ حسن کردار و عمل سے بہرہ ور ان شخصیات کو ملک و قوم کی رہنمائی کے لیے آگے آنے میں رکاوٹوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جبکہ مناصب نا اہل اور غیر ذمہ دار افراد کے قبضہ میں ہوتے ہیں جو ایک المیہ ہے۔

فنون (آرٹس):

(478) سائنس کی طرح قرآن نے مسلمانوں میں مختلف فنون کو پروان چڑھانے کی بھی ابتداء کی۔ قرآن مجید میں کی مختلف قرأتوں کے ساتھ تلاوت سے ''موسیقی'' کی ایک نئی شاخ نے جنم لیا۔ (بحوالہ پیراگراف نمبر 475) اسے محفوظ کرنے کی ضرورت کے باعث خطاطی اور جلد بندی وجود میں آئی۔ مساجد کی تعمیر سے فن تعمیر اور فن آرائش کی ابتداء ہوئی اور یہ شعبے اوج کمال کو پہنچے۔ اس کے بعد اس سے دولت مندوں اور رؤسا نے اپنے محلات اور بنگلوں کی تعمیر اور تزئین و آرائش کے لیے بھی ان فنون سے استفادہ کیا۔ اس حوالے سے روح اور بدن کے معاملات میں توازن کے لیے اسلام نے اعتدال پسندی کا سبق دیا۔ جس سے انسانوں میں مختلف فنون کی فطری صلاحیت کو ابھرنے کا موقع ملا۔

(479) صحیح مسلم اور مسند ابن حنبل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک مروی ہے:

> ''اللہ تعالیٰ خوبصورت ہیں اور خوبصورتی کو پسند کرتے ہیں'' (اللہ جمیل و یحب الجمال)

ایک اور حدیث مبارکہ ہے:

> ''حسن ہر چیز میں ظاہر ہوتا ہے، اگر تم کسی جانور کو ذبح بھی کرو تو اسے بھی اچھے طریقے سے ذبح کرو''

قرآن میں فرمان خداوندی ہے:

''اور ہم نے قریب کے آسمان کو (تاروں کے) چراغوں سے زینت دی......'' (5:67)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

''جو چیز زمین پر ہے ہم نے اس کو زمین کے لیے آرائش بنایا ہے، تا کہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں کون اچھے عمل کرنے والا ہے۔''

(7:18)

اللہ تعالیٰ نے یہاں تک ارشاد فرمایا:

''اے بنی آدم! ہر نماز کے وقت اپنے تئیں مزین کیا کرو......'' (31:7)

(480) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ کا ایک عبرت آموز واقعہ ہے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک قبر کے اندرونی حصہ کو دیکھا کہ وہ اچھی طرح ہموار نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اسے درست کر دیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید کہا کہ ہموار قبر سے مردے کو کوئی فائدہ یا نقصان نہیں پہنچے گا۔ مگر اس کا دیکھنا زندہ لوگوں کو اچھا لگے گا اور جو کوئی بھی ایک کام کرتا ہے تو اللہ کی پسندیدگی یہ ہے کہ وہ کام بطریق احسن کیا جائے۔ (ابن سعد: 150,8)

(481) فنون لطیفہ کا ذوق انسان کی جبلت میں ہے۔ دوسرے تمام فطری عطیات کی طرح اسلام اعتدال کے ساتھ فن کارانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانا چاہتا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ہر چیز کی زیادتی، یہاں تک کہ نفس کشی یا روحانی عبادات میں حد اعتدال متجاوز ہو جائے تو اس کی ممانعت ہے۔

(482) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے مسجد نبویؐ میں جو پہلا منبر تیار کرایا گیا اس پر انار کی طرح کے دو آرائشی گولے لگے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کم سن نواسے ان سے کھیلتے تھے۔ یہ لکڑی پر نقش نگاری کی ابتداء تھی، بعد کے برسوں میں قرآن کی نقول کی رنگوں سے تزئین کی گئی اور ان کی جلد بندی میں بھی نفاست ملحوظ رکھی جانے لگی۔ مختصر یہ کہ اسلام آرٹ کی ترقی کی ممانعت نہیں کرتا۔ صرف جو ممانعت کی گئی ہے وہ جانوروں (اور انسانوں) کے ہو بہو

نمونے یا مجسمے بنانے کی ہے اور یہ ممانعت بھی قطعی معلوم نہیں ہوتی اور ہم اس پر بحث کریں گے تاہم یہ بات مسلمہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے روکا ہے۔ اور اس کی وجوہات باطنی بھی ہیں اور نفسیاتی بھی۔ حیاتیاتی ہیں اور سماجی بھی۔ مختلف جہانوں کی تخلیق اور تشکیل میں حیوانی زندگی سب سے پہلا اور بڑا مظہر رہی ہے۔ جب کہ عالم نباتات اور عالم معدنیات کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ اس لیے خالق کے لیے دل کی گہرائیوں سے اظہار عبودیت اور ممنونیت کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے انسان نے اعلیٰ ترین تخلیقات پر اللہ تعالیٰ کا حق محفوظ رکھا جبکہ اپنے جذبہ تخلیق کی تسکین کے لیے ادنیٰ اشیاء کے مجسمے اور تصاویر بنانے پر اکتفا کر لی۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ تخلیق کے عمل میں عالم حیوانات کو جو خاص مقام حاصل ہے اس کو دیکھتے ہوئے (نقل و حرکت کی صلاحیت اور خصوصاً انسان کے نقطہ نظر سے ایجاد (تخلیق) کی صلاحیت) حیوانی مجسمے بنانے کے لیے انسان کو دوہری ترغیب ملتی ہے جس کی مزاحمت وہ بہت زیادہ نہیں کر پاتا۔ ایک یہ کہ وہ ''تخلیق'' کر رہا ہے جب کہ وہ محض اپنے ہاتھ سے ایک چیز گھڑتا یا بناتا ہے (اس کا ثبوت وہ مشہور کہانی ہے جس میں ایک یونانی مجسمہ ساز اپنے ہی ایک مجسمہ پر فریفتہ ہو گیا تھا) دوسری ترغیب یہ کہ وہ مجسمے میں ایک قابل رسائی ''دیوتا'' کی روح اور مثالی اقدار سمو دے۔ (بت پرستی کی قدیم انسانی تاریخ اور دور جدید میں ہیروز، چیمپئنز اور سٹارز کے مجسموں سے عقیدت کا حوالہ دیا جا سکتا ہے)۔

حیاتیاتی پہلو یہ ہے کہ ایک ناقابل استعمال (یا غیر استعمال شدہ) صلاحیت ان صلاحیتوں کے لیے تقویت کا باعث بن جاتی ہے جو مسلسل استعمال میں ہوں۔ مثلاً ایک نابینا شخص میں حافظے اور محسوس کرنے کی صلاحیت عام آدمی کی ان صلاحیتوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے، جانوروں کی پینٹنگ، کندہ کاری اور مجسمہ سازی سے گریز کرنے سے آرٹسٹ کی جبلی صلاحیت اظہار کے دوسرے راستے تلاش کر لیتی ہے اور آرٹ کے دوسرے شعبوں میں وہ زیادہ بہتر کام تخلیق کر سکتی ہے۔ مثلاً جیسے ایک درخت پر پھل بڑھانے کے لیے اس کی شاخ تراش کر دی جاتی ہے۔

جہاں تک سماجی پہلو کا تعلق ہے کسی کاز سے فدایانہ یا جذباتی وابستگی بگڑ کر بت پرستی کی راہ پا سکتی ہے اور اس طرح جانوروں کے مجسمے بنانے پر پابندی بت پرستی پر پابندی کے مترادف ہے۔ تاہم اس میں مستثنیات بھی ہیں مثلاً بچوں کے کھلونے، آرائشی تکیئے، قالین (پر تصویری

ڈیزائن وغیرہ) کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح طور پر برداشت کیا ہے۔ سائنسی مقاصد کے لیے اناٹومی یعنی علم تشریح الابدان، علم البشریات وغیرہ) سکیورٹی کی ضرورت (پولیس وغیرہ جو اشتہاری مجرموں کی تلاش کے لیے تصاویر استعمال کرتی ہے) اور تجارتی مقاصد کے لیے تصاویر کے استعمال پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔

(483) تاریخ گواہ ہے کہ تصویری آرٹ کی پابندی نے مسلمانوں پر عمومی آرٹ کے فروغ کو متاثر نہیں کیا بلکہ اس کے برعکس غیر تصویری آرٹ میں مسلمانوں نے حیرت انگیز ترقی کی۔ قرآن نے مساجد کی تعمیر میں بلندی اور عظمت پیدا کرنے کی تاکید کی ہے۔ (36:24) مسجد نبویؐ، قبہ الصخرہ (بیت المقدس یروشلم) استنبول کی سلیمانیہ مسجد، تاج محل اور غرناطہ کے الحمرا محل سمیت دوسری مسلم یادگاریں فن اور حسن تعمیر میں کسی دوسری تہذیب کی مشہور عالم یادگاروں سے کم نہیں ہیں۔

(484) خطاطی اسلامی آرٹ کا نادر نمونہ ہے کہ اس سے تحریر صرف تحریر نہیں آرٹ بن جاتی ہے۔ اسے پینٹنگز، دیواری نقاشی اور پارچہ جات اور دوسری اشیاء پر آرائش کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس آرٹ کے شاندار نمونے اپنی صناعی، عظمت اور خوبصورتی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ جن کی لفظی تصویر کھینچنا ناممکن ہے۔

(485) ایک اور آرٹ جو مسلمانوں سے مخصوص ہے وہ قرآن مجید کی قرأت ہے۔ اس کے ساتھ نہ تو آلات موسیقی کی سنگت ہوتی ہے اور نہ ہی یہ شاعری ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مسعود سے قرآن مجید قرأت کے لیے خاص توجہ کا مرکز ہے۔ عربی زبان کی نثر میں بھی ایسی مٹھاس اور نغمگی ہے کہ دوسری زبانوں کی شاعری بھی بمشکل ہی اس کا مقابلہ کر پاتی ہے۔ ماہر قاریوں کی تلاوت اور خوش الحان مؤذن کی اذان سن کر بجا طور پر احساس ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی یہ خصوصیت اپنی مثال آپ ہے۔ اور ان میں جو خوبصورتی اور کشش ہے اس کا دنیا میں کوئی ثانی نہیں۔

(486) خالص موسیقی اور گیتوں کو بھی مسلمان بادشاہوں اور طبقہ امراء نے سرپرستی کر کے پروان چڑھانے میں کردار ادا کیا۔ الفارابی نے اپنی کتاب ''رسائل اخوان الصفا'' کے ساتھ، ابن سینا اور دوسروں نے نہ صرف اس موضوع پر یادگار کام چھوڑا ہے بلکہ یونانی اور ہندوستانی موسیقی میں قابل قدر اصلاحات بھی کی ہیں۔ انہوں نے موسیقی کی مختلف کیفیات کے اظہار کی علامتیں

وضع کیں۔ اور مختلف آلات موسیقی کی ساخت اور خصوصیات بھی بیان کیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی نشاندہی کی کہ کون سی شاعری کے لیے کون سے سر مناسب رہیں گے اور کون سے واقعہ کے لیے کون سے آلات موسیقی بجانا موزوں ہوگا۔ خوشی اور غم کی کیفیات کو کس سُر میں بیان کیا جائے گا۔ بیمار دلوں کو کن دھنوں سے خوشی سے سرشار کیا جا سکتا ہے یقیناً یہ صلاحیت گہرے مطالعے اور تحقیق کے بعد ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔

(487) جہاں تک شاعری کا تعلق ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تحسین فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"بعض اشعار دانائی اور حکمت سے بھرپور ہوتے ہیں اور بعض مقررین کے خطبے جادوئی اثرات کے حامل ہوتے ہیں۔"

قرآن مجید نے غیر اخلاقی شاعری کو پسند نہیں کیا۔ اس کا حکم آنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دور کے تمام بہترین شعراء کو جمع کیا اور فرمایا کہ شاعری میں کن حدود کی پابندی کی جائے اور اس طرح فطری صلاحیت کے اچھے اور برے استعمال کے مابین ایک خط امتیاز کھینچ دیا۔

مسلمانوں میں شاعری کے نمونے ہر زبان میں موجود ہیں جن کا تعلق مختلف ادوار سے ہے مگر تنگ دامانی کے باعث یہاں اس کا مختصر سا حوالہ دینا بھی ناممکن نظر آتا ہے۔

ایک عرب بدو بھی شاعری میں رواں نظر آتا ہے اور عربی کے گھر میں بہت سی چیزوں کے نام شاعری کی اصطلاحات سے مشابہ ہیں۔ بیت کا مطلب خیمہ بھی ہے اور دو مصرعوں پر مبنی شعر بھی اور مصرعہ کے معنی خیمہ کا کونہ بھی ہے اور شعر کا ایک "مصرعہ" بھی سبب کا مطلب خیمے کا رسہ بھی ہے اور نظم کا مقطع بھی، اسی طرح وتد سے مراد خیمہ گاڑنے کا کھونٹا بھی ہے اور مقطع کے الگ الگ بول بھی۔ نظم کی مختلف بحروں کو جو نام دیے گئے ہیں وہ اونٹ کی مختلف چال مثلاً تیز یا آہستہ کے اظہار کے لیے استعمال ہونے والے الفاظ بھی ہیں۔

(488) مختصر یہ کہ آرٹ کے شعبے میں مسلمانوں کی خدمات قابل قدر اور قابل ذکر ہیں جس میں اس کے نقصان دہ پہلوؤں سے بچتے ہوئے اس کے جمالیاتی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے اور

اس میں جدتیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ دو نکات کے بارے میں مختصراً اظہار خیال کرتے ہیں:

(1) اگر مسلمانوں کی اپنی کوئی شناخت نہ ہوتی اور ان پر اسلامی تہذیب جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی حیات طیبہ میں پروان چڑھایا کے اثرات غالب نہ ہوتے تو وہ ان قوموں کی تہذیب میں جذب ہو جاتے جنہیں انہوں نے انتہائی آسانی سے زیرنگین کر لیا تھا۔

(2) وسیع اسلامی سلطنت میں تمام مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ ان میں مسیحی، یہودی، پارسی، صابی، برہمن، بدھ اور بہت سے دوسرے شامل تھے۔ ان سب کی اپنی اپنی انفرادی تہذیبی روایات تھیں اور چاہے ان کا آپس میں اشتراک کار نہ بھی رہا ہو مگر یہ سب مسلمانوں کے ساتھ اشتراک کار رکھتے تھے جو ان کے سیاسی آقا تھے اور ان کی خوشنودی کے حصول کے لیے ہر ایک اپنا کام اور اپنا نقطہ نظر ان کے سامنے پیش کرتے تھے۔ اس طرح گو سب کی سائنسی تحقیق کے نتائج میں تضاد بھی ہوتا تھا مگر ان نتائج کے تجزیہ سے سائنس اور انسانیت کے فائدہ کے لیے ایک اجماع کی صورت نکل آتی تھی۔

باب14

اسلام کی عمومی تاریخ

اسلام کی تاریخ سے مراد عملاً گزشتہ 14 سو سال کے دوران دنیا کی تاریخ ہے۔ ہم یہاں اس تاریخ کے بڑے بڑے واقعات کا مختصر خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

خلفائے راشدین:

(490) 632ء (بمطابق 11 ہجری) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیائے فانی سے تشریف لے گئے، اپنی حیات مبارکہ کے آخری 23 برسوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان تھک کوششوں سے نہ صرف اسلام کی وسیع اشاعت ممکن ہوئی بلکہ ایک چھوٹی سی شہری ریاست کی بنیاد بھی رکھی جو مدینہ کے ایک حصے میں قائم ہوئی مگر دس سال کے قلیل عرصہ میں اس کی وسعت جزیرہ نما عرب کی حدود کو پھلانگ گئی جس میں فلسطین اور عراق کے بعض جنوبی حصے بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لاکھوں جاںثاروں پر مشتمل ایک ایسی جماعت پیچھے چھوڑی جو نہ صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے اصولوں پر دل و جان سے ایمان رکھتے بلکہ جو کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شروع کیا تھا اسے جاری رکھنے کی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور تھے۔

(491) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دنیاوی کامیابیوں سے ترغیب پا کر بعض جاہ پرست نبوت کے جھوٹے دعویدار بن بیٹھے اس فتنے کو پھیلنے سے قبل ہی اس کا سر کچلنے کے لیے خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے خلاف فوج کشی کی اور کئی ماہ تک ان کے خلاف برسرپیکار رہ کر ان کا قلع قمع کیا۔

(492) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے وقت رومیوں اور ایرانیوں سے اسلامی سلطنت کی سخت کشیدگی چل رہی تھی اور نوبت جنگ تک پہنچ چکی تھی۔ رومی حدود میں مسلمانوں کے سفیر کو قتل کر دیا گیا تھا (بحوالہ پیراگراف نمبر 442) اور بجائے اس کے کہ اس کوتاہی کا ازالہ کیا جاتا الٹا رومی حکمران نے نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حوالے سے تمام متبادل تجاویز ٹھکرا دی تھیں بلکہ قاتل کو سزا دینے کے لیے مسلمانوں نے جو مہمات روانہ کی تھیں ان کے خلاف فوجی کارروائی بھی کی۔

جہاں تک ایران کا تعلق تھا، کئی سال سے ان کے اور سرزمین عرب میں ان کے بعض زیر حفاظت (محروس) علاقوں کے مابین خونریز جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان علاقوں میں آباد بعض قبائل نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس لیے ایرانیوں کی طرف سے جارحیت کی کارروائیوں سے اب مزید صرف نظر ممکن نہ تھا کیونکہ یہ صورتحال بین الاقوامی سطح پر پیچیدگیوں کا باعث بن سکتی تھی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس وقت روم کی بازنطینی اور ایران کی ساسانی سلطنتیں اپنے وقت کی دو سپر پاور تھیں جبکہ عرب اس حوالے سے کسی حیثیت کے حامل نہ تھے۔ چند خانہ بدوش قبائل تھے جن کے پاس فوجی ساز و سامان تھا نہ ہی مادی وسائل۔

(493) خلیفہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غیر معمولی جرأت اور حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حالات کی نزاکت کو نظر انداز کر دیا اور دونوں بڑی طاقتوں کے خلاف لشکر کشی کا آغاز کر دیا۔

(دراصل مسلمان سفیر کے قتل کے بعد رومی شہنشاہ کے رویہ اور سرحدی علاقوں میں آباد مسلمان قبائل کے خلاف ایرانیوں کی آئے روز کی ریشہ دوانیوں کا قلع قمع کرنے کے لیے مسلمانوں کو مجبوراً تلوار اٹھانا پڑی تھی۔ مترجم)

پہلے ہی مقابلے میں مسلمان فوج نے کچھ سرحدی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جس کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قسطنطنیہ میں سفارت روانہ کی تاکہ مسئلے کو پرامن طور پر حل کیا جا سکے۔ لیکن ان کی یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ تاہم قیصریہ کے مقام پر ہونے والی شکست نے رومی شہنشاہ کو آنے والے خطرات سے خبردار کر دیا تھا اور اس نے نئی فوج کی تیاری شروع کر دی۔ اس صورتحال کے پیش نظر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عراق (ایرانی سلطنت) کے محاذ سے مسلم فوج کے کچھ دستے شام بھیجنے کا حکم دیا۔

634ء میں مسلمانوں کو یروشلم کے نزدیک اجنادین کے مقام پر بڑی فتح حاصل ہوئی اور اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد فہل (پیلا) کے مقام پر ہونے والی شکست کے نتیجے میں فلسطین مکمل طور پر رومیوں کے ہاتھ سے نکل گیا۔ انہی ایام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہو گیا اور آپ کے جانشین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے ان مہمات کو جاری رکھنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ تھوڑے ہی عرصے میں دمشق اور حمص کے شہروں پر بھی مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان شہروں کے مکینوں نے مسلمانوں کو فاتح اور دشمن نہیں بلکہ نجات دہندہ سمجھ کر کھلے ہاتھوں استقبال کیا۔ دریں اثناء حمص کی فتح کے بعد شاہ ہرقل نے تمام بچی کھچی قوت مجتمع کر کے آخری زور لگایا اور جنگی حکمت عملی کے تحت مسلمانوں کو حمص خالی کرنا پڑا تا کہ نئے سرے سے تیاری کر کے دوبارہ قبضہ کیا جا سکے تاہم شہر خالی کرنے سے قبل مسلمان کمانڈر کے حکم پر غیر مسلم شہریوں کی حفاظت کے لیے ان سے حاصل کیا گیا ٹیکس (جزیہ) واپس کر دیا گیا کیونکہ مسلمان فی الوقت ان کی حفاظت کی ذمہ داری پوری کرنے سے قاصر ہو گئے تھے اس لیے ان کے تحفظ کے لیے حاصل کردہ ٹیکس پر ان کا کوئی حق نہ تھا۔ ایسے نیک طینت فاتحین کی واپسی پر حمص کے شہری آنسو بہا رہے تھے۔ ممتاز فرانسیسی مورخ ڈی گوجے اپنی کتاب

(De Geoje: Memoier Sur La Conquete de la Syrie.)

میں لکھتا ہے:

> ''یہ حقیقت ہے کہ شام کے لوگ عربوں کو پسند کرنے لگے تھے اور وہ اس کے حقدار بھی تھے کیونکہ انہوں نے مفتوحہ شہریوں سے محبت اور نرمی کا جو سلوک کیا وہ اس ظلم و تعدی سے قطعی مختلف تھا جو ان کے پیشرو (بازنطینی) آقا ان سے روا رکھتے تھے۔''

مسلمانوں کی یہ پسپائی عارضی تھی اور انہوں نے جلد ہی کمک حاصل کر کے نئی حکمت عملی سے حملہ کر کے حمص پر دوبارہ قبضہ کر لیا کیونکہ اب انہیں شہریوں کی ہمدردیاں بھی حاصل تھیں۔

(494) ایران کی صورتحال بھی کچھ مختلف نہ تھی۔ مسلمانوں کے اولین حملوں کے نتیجے میں حیرہ (آج کا کوفہ) اور گردونواح کی کچھ قلعہ بندیوں پر ان کا قبضہ ہو گیا۔ مہمات شام کے لیے فوجی دستوں کی روانگی کے باعث اس محاذ پر وقتی طور پر قدرے خاموشی ہو گئی تھی تاہم چند ہی ماہ بعد محاذ

پھر گرم ہوگیا اور دارالحکومت مدائن پر آسانی سے قبضہ ہوگیا۔ ایرانی شہنشاہ یزدگرد نے چین، ترکستان کے بادشاہوں اور اردگرد کے حکمرانوں سے مدد مانگی مگر یہ مدد بھی اس کے لیے کسی کام نہ آسکی اور اس کے اتحادی بھی شدید نقصانات سے دوچار ہوئے۔

(495) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور خلافت میں (634-644) اسلامی سلطنت کی حدود ایک طرف طرابلس (ٹریپولی) (لبیا) سے بلخ (افغانستان) تک جبکہ دوسری طرف آرمینیا سے سندھ (پاکستان) اور گجرات (ہندوستان) تک وسیع ہو چکی تھیں جب کہ ان کے درمیان واقع ممالک شام، عراق اور ایران بھی اسلامی سلطنت کا حصہ تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت (644-656) کے دوران مسلمان فاتحین نے نوبیہ کو بھی زیرنگیں کرلیا اور ڈنگولا کے مضافات تک ان کا قبضہ ہوگیا۔ اندلس (سپین) کے بعض علاقے بھی مسلم فوج کے حیطہ اقتدار میں آ گئے۔ مشرق میں انہوں نے دریائے جیحوں (وسط ایشیاء) عبور کرلیا اور چین کے کچھ علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اسی اثناء میں جزائر قبرص، رہوڈز اور کریٹ بھی اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے اور بازنطینیوں کے خلاف دفاعی جنگ کے دوران قسطنطنیہ بھی مسلمان عربوں کے حملے کا نشانہ بنا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا سے رخصت ہوئے بمشکل پندرہ برس ہوئے تھے کہ مسلم افواج مشرق اور مغرب میں بحراوقیانوس سے لے کر بحرالکاہل تک پھیل چکی تھیں اور زیر قبضہ علاقہ پورے براعظم یورپ کے رقبے کے برابر تھا۔ ان برق رفتار فتوحات کی حیران کن خصوصیت یہ تھی کہ کسی بھی جگہ مفتوحہ شہری غیر مطمئن نہیں تھے اور اس کا ایک بڑا ثبوت یہ ہے کہ 656ء میں جب مسلمان پہلی خانہ جنگی کے نتیجے میں بری طرح انتشار کا شکار ہو چکے تھے کوئی اندرونی بغاوت نہیں ابھری اور بازنطینی شہنشاہ اپنی سابقہ رعایا پر معمولی سا بھی اثر انداز نہیں ہوسکا اور اسے اسی قلیل وظیفہ پر اکتفا کرنا پڑی جس کا وعدہ شام کے فہیم مسلم گورنر نے اس سے اس شرط پر کیا تھا کہ وہ غیر جانبدار رہے گا۔

(496) ان وسیع اور برق رفتار مسلم فتوحات کو کسی ایک وجہ سے منسوب کرنا غلط ہوگا۔ اگر بازنطینی اور ساسانی سلطنتیں اپنے باہمی تنازعات اور اندرونی خلفشار کے باعث کمزور ہو چکی تھیں تو دوسری طرف عرب فاتحین کو بھی جنگی سازوسامان، مادی وسائل کی کمی کا سامنا تھا اور تنظیمی کمزوریاں بھی موجود تھیں۔ عرب مسلمانوں کی تعداد بھی اتنی زیادہ نہیں تھی کہ چین سے سپین تک

پھیل جاتے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ان جنگوں کا آغاز قدرے سیاسی تھا۔ مسلمانوں میں اپنا دین زبردستی رائج کرنے کی کوئی خواہش موجود نہ تھی۔ کیونکہ ان کے مذہب نے اس کی سختی سے ممانعت کی ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ غیر مسلم شہریوں کو کبھی مسلمان حکمرانوں نے جبراً اسلام میں داخل نہیں کیا۔ اسلام کی تعلیمات کی سادگی اور معقولیت اور مسلمانوں نے اپنے حسن اعمال اور اخلاق کی جو عمدہ مثالیں قائم کیں غیر مسلموں کے لیے ترغیب کی بڑی وجہ تھی۔ ان فتوحات کے پردے میں مالی وسائل کی لوٹ مار یا معاشی فوائد کے حصول کا الزام کوئی وزن نہیں رکھتا۔ جبکہ مفتوحہ ممالک کے عوام نے آقاؤں کی اس تبدیلی کا عمومی طور پر خیر مقدم کیا کیونکہ یہ تبدیلی ان کے لیے بہتری کی نوید لے کر آئی۔

اس زمانے کی بعض دستاویزات سے جو بعد ازاں مصر سے دریافت ہوئیں ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں نے اس ملک میں حکومت قائم کرنے کے بعد شہریوں پر ٹیکسوں میں معتد بہ کمی کر دی تھی جس سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایسی ہی اصلاحات تمام مفتوحہ ممالک میں رائج کی گئیں۔ انتظامی اخراجات میں بھی قابل ذکر حد تک کمی آ گئی جس کی ایک وجہ عربوں کا سادہ طرز زندگی اور دوسرا مسلمان افسروں کی دیانت داری تھی۔ اسلام میں مال غنیمت اس سپاہی کی ملکیت نہیں ہوتا جس کی تحویل میں آ جاتا ہے بلکہ وہ سرکاری ملکیت شمار ہوتا ہے اور حکومت متناسب شرح سے جنگی مہم کے شرکاء میں خود تقسیم کرتی ہے۔ خلیفہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اکثر ایسے مسلمان سپاہیوں کی دیانت داری اور راست گوئی کی تحسین کرتے تھے۔ جو باقاعدہ فوج کا حصہ نہیں ہوتے تھے مگر وہ انتہائی ایمان داری کے ساتھ قیمتی پتھر اور دوسری چھوٹی موٹی اشیاء بھی حکومت کے حوالے کر دیتے تھے جو آسانی سے چھپائی جا سکتی ہیں۔

(497) ہم اس موضوع کا اختتام اس دور کی ایک مسیحی دستاویز کے حوالہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ یہ ایک خط ہے جو ایک نسطوری لاٹ پادری [1] نے ایک دوست کو لکھا تھا اور جو محفوظ ہے۔

(Assemani, Bibl orient, III, 2,p.xcvi)

1۔ نسطوری۔ پانچویں صدی عیسوی میں قسطنطنیہ کے بطریق نسطوریس کا پیرو جس کا عقیدہ یہ تھا کہ مسیح کی دوگونہ فطرت (سرشت) تھی۔ ایران اور برصغیر پاک و ہند کے عیسائیوں میں سے ایک گروہ جس سے جدید نسطوری فرقہ کا سلسلہ جاری ہوا۔ مترجم)

"یہ طائی (عرب) جنہیں خداوند نے ہمارے زمانے میں غلبہ عطا کیا ہے اور جو ہمارے آقا بھی بن گئے ہیں مگر وہ مسیحی مذہب کی ہرگز مخالفت نہیں کرتے بلکہ وہ ہمارے عقیدے کی حفاظت، ہمارے مذہبی پیشواؤں کا احترام کرتے اور ہمارے گرجاؤں اور خانقاہوں کے لیے عطیات بھی دیتے ہیں۔"

بنو اُمیہ:

(498) 655ء میں تیسرے خلیفہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد مسلم دنیا میں جانشینی کی جنگ شروع ہوگئی۔ جو آنے والے بیس برسوں میں کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی، جس کے نتیجے میں نصف درجن حکمران منظر پر نمودار ہوئے اور غائب ہوگئے۔ یہاں تک کہ عبدالملک کے دور میں (705.685) ایک مستحکم حکومت قائم ہوگئی اور فتوحات کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ جس کے دوران ایک طرف مراکش اور سپین اور دوسری جانب برصغیر پاک و ہند کا شمالی خطہ اور ماوراءالنہر (وسط ایشیاء) اور دوسرے علاقے اسلامی سلطنت کا حصہ بن گئے۔ اس کے علاوہ کچھ عرصہ کے لیے باردو (Bordeaux) ناربون (Narbonne) اور تولوز (Toulouse) جو فرانس کے علاقے ہیں، بھی ان کے مقبوضات میں شامل رہے۔ اس دوران دارالحکومت مدینہ سے دمشق منتقل ہوگیا۔ مدینہ، نبیؐ کا شہر (مدینۃ النبیؐ) کہلاتا ہے۔ اس کی فضائیں مقدس ہیں، دارالخلافہ کی یہاں سے بازنطینی تہذیب کے مرکز دمشق منتقلی سے سیکولر سرگرمیوں کو دینی روایات پر ترجیح حاصل ہونے لگی۔ جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر بھی عیش وعشرت، اسراف، اقربا پروری کی لعنتیں آہستہ آہستہ زور پکڑنے لگیں جو رومی تہذیب کا خاصہ تھیں اور اس کے نتیجے میں بغاوتیں اور شورشیں بھی معمول بننے لگیں جن سے عام طور پر عرب معاشرہ نامانوس تھا۔ تاہم کچھ فوائد بھی سامنے آئے، ان فتوحات کے نتیجے میں علمی اور سماجی سطح پر بڑی ترقی ہوئی۔ صنعت کو بھی بے حد فروغ حاصل ہوا۔ خصوصاً طب کے شعبے میں جسے حکومت کی سرپرستی حاصل تھی۔ یونانی اور دوسری زبانوں سے غیر ملکی طبی تحقیق کا ترجمہ عربی میں کیا گیا۔

عمر بن عبدالعزیز کا مختصر دور حکومت (20-817) اس حوالے سے انتہائی شاندار اور مثالی ہے۔ آپؒ نے ایک ہی شادی پر اکتفا کی اور تقویٰ اور پرہیزگاری سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ادوار کی یاد تازہ کردی۔ آپؒ نے وہ تمام جاگیریں ضبط

کر کے پرانے مالکان یا ان کے ورثاء کو واپس کر دیں جو ان کے پیشرو حکمرانوں نے ظلم اور جبر سے چھین لی تھیں اور تمام ناروا ٹیکس ختم کر دیئے۔ آپؒ عدل و انصاف کے معاملے میں بہت سخت تھے اور چاہے ظالم مسلمان اور مظلوم غیر مسلم ہو آپ کا اس حوالے سے عزم غیر متزلزل تھا۔ آپ کی انصاف پسندی کی درخشاں مثال وہ واقعہ ہے جب آپؒ نے سمرقند کا شہر خالی کرنے کا حکم دیا جس پر مسلم افواج نے دھوکہ سے قبضہ کر لیا تھا۔ آپؒ نے جامع اموی دمشق کا ایک حصہ بھی منہدم کروا دیا جو زبردستی حاصل کی گئی زمین پر تعمیر کیا گیا تھا۔ (حوالہ پیراگراف نمبر 434 کتاب ھذا)

آپؒ کی پالیسیوں کے نتائج حیرت انگیز تھے۔ مثلاً آپؒ کے خاندان کے اقتدار کے آغاز میں عراق سے موصول ہونے والے مالیہ کی مالیت 10 کروڑ درہم تھی مگر آپؒ کے دور حکومت میں یہ مالیت بڑھ کر 12 کروڑ ہو گئی۔ آپؒ کی مذہبی رواداری سے دنیا بھر میں مسلمانوں کے لیے خیر سگالی میں اضافہ ہوا جب کہ سندھ، ترکستان اور بربر لینڈ کے حکمران مسلمان ہو گئے۔ مذہبی علوم میں لوگوں کی دلچسپی میں بہت اضافہ ہو گیا اور مسلمانوں میں اعلیٰ پایہ کے عالم فاضل لوگوں کی ایک کہکشاں آسمان علم پر ابھری جنہوں نے سائنس کے شعبہ میں ترقی کو عروج تک پہنچا دیا۔ کرپشن اور بددیانتی کے خلاف آپؒ کے سخت اقدامات سے سلطنت کے طول و عرض میں آپ کی اچھی حکمرانی کی دھاک بیٹھ گئی۔

(499) اس دور کی تعمیراتی یادگاروں میں یروشلم (بیت المقدس) کا قبۃ الصخرہ جو 691 میں تعمیر ہوا اب بھی موجود ہے۔ دمشق اور دوسرے مقامات پر پرانی یادگاروں کے کھنڈرات اس شعبے میں مسلمانوں کی گراں قدر خدمات کا ثبوت ہیں۔ موسیقی کے شعبہ میں بھی ترقی کا ذکر کیا جاتا ہے گو موسیقی کی علامات ابھی ایجاد نہیں ہوئی تھیں اس لیے ہم موسیقی کے شعبہ میں ہونے والی ترقی کی حقیقی صورت سمجھنے سے قاصر ہیں۔

مسلمانوں کے دو بڑے مکاتب فکر سُنّی اور شیعہ بھی اس دور کی پیداوار ہیں اور ان کے مابین اختلاف کی بنیاد سیاسی ہے۔ اختلاف کی بنیاد یہ ہے کہ آیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کا انتخاب بذریعہ الیکشن ہونا تھا یا قریبی ورثاء میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کیا جانا چاہیئے تھا۔ یہ صورتحال اہل تشیع کے لیے عقیدے کا مسئلہ بن گئی اور اس افتراق کے نتیجے میں مسلمان فرقوں میں بٹتے چلے گئے اور ان میں باہم جنگ و جدل تک بھی نوبت پہنچی۔ ایسی ہی ایک باغیانہ تحریک نے بنو امیہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا اور 750ء میں ان کی جگہ عباسی سریر آرائے حکومت ہوئے، تاہم

اس تبدیلی سے شیعوں کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دور حاضر میں شیعہ مسلمانوں کی تعداد دنیا بھر میں ایک فیصد کے لگ بھگ ہے جبکہ باقی تمام سُنّی ہیں۔ اسی دور کی ایک پیداوار خارجی بھی ہیں لیکن اب ان کی تعداد نا قابل ذکر حد تک کم رہ گئی ہے۔

دور عباسیہ:

(500) 750ء میں جب آل عباس اقتدار میں آئے تو انہی ایام میں یہ واقعہ ہوا کہ مسلم سلطنت پہلے دو حصوں میں تقسیم ہوئی اور پھر اس کی کوکھ سے خود مختار ملک جنم لیتے گئے۔ قرطبہ (سپین) میں ایک حریف خلافت قائم ہوگئی جس نے اپنے زوال تک (1492) مشرق میں خلافت بغداد سے تعلق نہیں جوڑا۔ جس نے بنواُمیہ کے بعد دارالخلافہ دمشق سے بغداد منتقل کرلیا تھا۔

(501) علاقائی حکمرانوں کی چھوٹی موٹی مہم جوئیوں کے سوا آل عباس کا دامن بڑی فوجی فتوحات کے اعزاز سے خالی ہے۔ یہ حکمران گو خلیفہ بغداد کو اپنا حکمران اعلیٰ تو تسلیم کرتے تھے مگر اپنی خارجہ پالیسی یا اندرونی نظم و نسق میں یکسر آزاد تھے۔ اس حوالے سے ہم برصغیر پاک و ہند کا تذکرہ الگ سے کریں گے۔ دریں اثناء یونانیوں کے بازنطینی حکومت کے ساتھ تعلقات میں شدید تلخی پیدا ہوچکی تھی اور نوبت خونریزی تک پہنچ رہی تھی۔ جس کے بعد اہل یونان کو اپنے ایشیائے کوچک کے مقبوضات چھوڑ کر یورپ کے زیرنگیں علاقوں تک محدود ہو جانا پڑا۔

(502) عباسیوں نے "ضرورت کے وقت" عوام سے رضا کاروں کی فوج بھرتی کرنے کی روایت ترک کر کے باقاعدہ پیشہ ور اور تربیت یافتہ فوج کھڑی کرنے کی پالیسی کا آغاز کیا۔ جس میں زیادہ سے زیادہ ترکی النسل لوگ جمع کیے گئے۔ اس کے نتیجے میں جاگیرداری نظام نے جنم لیا۔ جس کے بطن سے خودمختار صوبے جنم لینے لگے جہاں کے گورنروں نے بادشاہی رنگ اختیار کرلیا۔ جہاں ان کی خاندانی حکومتیں قائم ہوگئیں اور عباسیوں کے اقتدار کے کم و بیش ایک سو سال بعد ایسے حالات پیدا ہو چکے تھے کہ عباسی خلفا کی گرفت صوبوں پر ڈھیلی پڑنے لگی اور وہ اپنے بیشتر اختیارات صوبوں کے گورنروں کو دینے پر مجبور ہوگئے جو تقریباً مکمل خودمختار تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ کا اقتدار اپنے محل تک محدود ہوگیا اور باقی کے تمام معاملات امرا (علاقائی حکمران) کے ہاتھ میں چلے گئے۔ ان میں سے جو زیادہ طاقتور تھے وہ دارالخلافہ کے معاملات کو بھی اپنے کنٹرول میں لینے میں کامیاب ہوگئے۔

اس حوالے سے یہاں پاپائیت کے مقابلے میں متضاد صورت نظر آتی ہے۔ پوپ (Popes) کے پاس ابتدا میں سیاسی طاقت نہیں ہوتی تھی مگر کچھ صدیاں گزرنے کے بعد انہوں نے بتدریج خصوصاً مقدس رومن سلطنت کے قیام کے ساتھ سیاسی اقتدار بھی حاصل کرلیا۔ حتیٰ کہ کچھ عرصہ تک تو ان کے درجات شہنشاہوں سے بھی بڑھ گئے لیکن پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے اختیارات سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو گئے مگر اس کے برعکس خلفا کا آغاز مطلق العنان حکمرانوں کے طور پر ہوا اور بعد میں وہ سلاطین (علاقائی حکمران) کو بھی شریک اقتدار کرنے پر مجبور ہوئے اور آہستہ آہستہ محض نام کے خلیفہ رہ گئے جن کے پاس حقیقی حکمرانی تھی نہ ہی اختیارات۔

(503) یہ دور عباسیہ کا واقعہ ہے کہ گورنر تیونس کو سسلی کی خانہ جنگی میں مداخلت کی دعوت دی گئی۔ اس نے نہ صرف جزائر سسلی پر قبضہ کرلیا بلکہ سرزمین اٹلی کا بڑا حصہ بھی روند ڈالا اور اس کی فوجیں روم کی دیواروں تک پہنچ گئیں۔ اس کے علاوہ جنوبی فرانس اور سوئٹزر لینڈ کا قابل ذکر حصہ بھی اس نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ توسیع پسندی کی یہ پالیسی ان حکمرانوں کی تھی جنہیں فاطمیوں نے نکال کر ان کی جگہ لے لی۔ فاطمی جو اہل تشیع تھے، دارالخلافہ قاہرہ لے گئے اور وہاں متبادل خلافت قائم کرلی۔ فاطمی عام طور پر روشن خیال حکمران تھے مگر ان میں سے ایک نے انتہائی کوتاہی کا مظاہرہ کرتے ہوئے یروشلم میں مسیحیوں کی مقدس عبادت گاہ کی بے حرمتی کی جس سے یورپ میں اتنا شدید ردعمل پیدا ہوا کہ خود پوپ نے اسلام کے خلاف مقدس جنگ کے لیے یورپی حکمرانوں کو بھڑکایا، جس کے بعد وہ مشہور صلیبی جنگیں شروع ہوئیں جو دو سو سال جاری رہیں اور لاکھوں مسلمان اور مسیحی ان جنگوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ فاطمی پہلی صلیبی جنگ سے قبل ہی فلسطین سے ہاتھ اٹھا چکے تھے چنانچہ بے گناہ شہری آبادی صلیبی حملہ آوروں کے رحم و کرم پر تھی جس کا قتل عام کر کے انہوں نے اپنے غیظ و غضب کو فرو کیا۔ یہ امر اور بھی افسوسناک ہے کہ فاطمیوں نے لاونٹ (بحیرہ روم کے مشرقی نصف ممالک سرزمین شام، لبنان، اسرائیل، فلسطین) کے خطہ میں واقع اسلامی سلطنت کے علاقوں پر یلغار میں صلیبیوں کی مدد کی۔ اس دور میں مسلم سلطنت میں کوئی مرکزی حکومت نہ تھی بلکہ یہ سلطنت چھوٹی چھوٹی خودمختار ریاستوں میں بٹ چکی تھی جو باہم برسرپیکار رہتی تھیں۔ ان ریاستوں کی ہیئت مقتدرہ میں کردوں اور ترکوں کو بڑا رسوخ حاصل تھا۔ جنہوں نے صلیبی جنگوں کے دوران بتدریج عرب حکمرانوں کو ہٹا کر ان کی جگہ لے لی تھی۔ صلاح الدین ایوبی نے جو صلیبی

جنگوں میں عالم اسلام کا ہیرو بن کر ابھرا، نہ صرف یورپی حملہ آوروں کو شام اور فلسطین سے نکال باہر کیا بلکہ مصر سے فاطمی اقتدار کا بھی خاتمہ کر دیا۔ صلاح الدین اور اس کے جانشین خلافت بغداد کی سیادت تسلیم کرتے تھے تاہم خلافت بغداد کو وہ سیاسی عروج دوبارہ نصیب نہ ہوا جو کبھی اس کا طرہ امتیاز تھا۔ اور علاقائی حکمران اپنی الگ الگ ڈفلی بدستور بجاتے رہے۔ گو اس دور انحطاط میں بھی ان خود مختار حکمرانوں میں بعض اسلامی سلطنت کی سرحدوں کی توسیع سے غافل نہ ہوئے اور اس حوالے سے کامیابیاں بھی حاصل کیں۔

(504) 921ء میں شاہ ''بلغار'' (روس میں دریائے والگا پر واقع علاقہ کازان) نے خلافت بغداد سے ایک تبلیغی مشن بھیجنے کی درخواست کی جس کے جواب میں ابن فدیان کو بھیجا گیا۔ اس کے سفر کی روداد کے مطابق جو بہت دلچسپ ہے، شاہ بلغار نے اسلام قبول کر لیا اور کہا جا سکتا ہے کہ غیر مسلموں میں گھرا ہوا ایک ''اسلامی جزیرہ'' قائم کر دیا جو کوہ قاف اور ملحقہ خطوں میں اسلام کی آمد کا نقطہ آغاز بنا۔

ہندوستان:

(505) افغانستان کے غزنویوں نے ہندوستان کو دوبارہ فتح کرنے کی ابتداء کی (بحوالہ پیراگراف نمبر 495) ان کے بعد یہ سلسلہ دوسرے حکمران خاندانوں نے بھی جاری رکھا تاہم وہ شمالی ہندوستان تک محدود رہے۔ اس کے بعد خلجی آئے جنہوں نے فتوحات کا دائرہ جنوب تک پھیلا دیا۔ ایک حبشی جرنیل ملک کافور برق رفتاری سے پیش قدمی کرتا ہوا کیپ کمورین (تامل ناڈو) تک جا پہنچا مگر یہ بہت بعد کی بات ہے کہ جنوبی ہند میں مسلمان ریاستیں قائم ہوئیں۔

عظیم مغل دور (1526-1858) ہندوستان کی مسلم تاریخ کا روشن باب ہے۔ ان کی حکمرانی پورے برصغیر پر سینکڑوں سال قائم رہی اور ان کا شمار دنیا کے ''بڑے'' حکمرانوں میں ہوتا ہے۔ تاہم 18 ویں صدی کے بعد سے ان کی گرفت صوبوں پر کمزور ہونے لگی اور علاقائی حکمران سر اٹھانے لگے۔ یہ سلسلہ 1858ء میں برٹش راج کے قیام پر منتج ہوا جب انگریزوں نے مغلوں کو نکال باہر کیا۔ اور ملک کے تقریباً 3/5 حصہ کو برطانوی فوج کی قلمرو بنا دیا جب کہ باقی آزاد ریاستیں تھیں جن میں سے بعض مسلمان بھی تھیں ان ریاستوں نے ماضی قریب تک ہندو، مسلم تہذیب و ثقافت کو زندہ رکھا ہے۔ ان میں سے ایک بڑی ریاست حیدر آباد (دکن) تھی۔ ہندوستان کے

وسط میں واقع یہ ریاست رقبہ میں اٹلی کے برابر اور اس کی آبادی 2 کروڑ سے متجاوز تھی۔ اس نے خصوصاً اسلامی تعلیم میں اصلاحات کے لیے جو کوششیں کیں انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی یونیورسٹی میں جو مغربی طرز پر قائم کی گئی کم وبیش 12 مختلف شعبے تھے جن میں دینیات (علم دین) کا شعبہ بھی تھا۔ جامعہ میں تمام مضامین کا ذریعہ تدریس اردو تھا۔ سپیشلائزیشن سکول کی سطح سے شروع ہو جاتی تھی اور عربی زبان، فقہ اور حدیث کی تعلیم بھی انگریزی، ریاضی اور دوسرے جدید علوم کی طرح لازمی تھی۔ اس طرح یونیورسٹی کی سطح تک علم دین کے طالب علم نہ صرف اعلیٰ درجے کی انگریزی پر عبور حاصل کر لیتے بلکہ عربی کے ساتھ ساتھ اسلامی علوم کے دیگر مضامین میں بھی مہارت حاصل کرتے۔ اس طرح تقابلی علوم کا حصول بھی یک گونہ اعزاز بن جاتا تھا۔ اور اس کے طالب علم بھی اپنے آپ کو دیگر جدید علوم کے طالب علموں کے ہم پلہ تصور کرتے تھے۔ کیوں کہ فقہ آج کے جدید علم قانون اور کلام، مغربی فلسفہ کی تاریخ کے برابر شمار ہوتی۔

عربی زبان کے ساتھ عبرانی یا دوسری یورپی زبانیں مثلاً فرانسیسی و جرمن بھی پڑھائی جاتیں۔ جب طالب علم اپنے تھیسس تیار کرتے تو ہر طالب علم کو دو رہنما استادوں سے منسلک کر دیا جاتا۔ ایک دینیات فیکلٹی کے پروفیسر ہوتے اور دوسرے آرٹس، ادبیات یا قانون میں سے جو بھی مضمون وہ پڑھ رہے ہوتے اس طریقہ سے طالب علم کو ایک ہی مضمون پر اسلامی نقطہ نظر اور جدید مغربی رجحانات سے بیک وقت روشناس ہونے کا موقع میسر آ جاتا۔ تیس سال کے کامیاب تجربات اور شاندار نتائج کے حصول کے بعد اس حوالے سے اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ سوائے بھولی بسری یادوں کے۔

اس کی وجہ یہ بنی کہ 1947ء میں جب انگریز ہندوستان کو مسلم پاکستان اور غیر مسلم بھارت میں تقسیم کر کے ہمیشہ کے لیے برصغیر سے رخصت ہو گئے تو بھارت نے نہ صرف خود مختار ریاستوں کو اپنے اندر ضم کر لیا بلکہ ان کے حصے بخرے کر کے مختلف صوبوں میں شامل کر دیئے اور اس طرح ''لسانی قومیتیں'' کھڑی کر دیں اور اب وہ پرانی ریاستیں مختلف صوبوں میں بکھری پڑی ہیں۔

(506) اب واپس اپنے بنیادی موضوع کی طرف جاتے ہیں۔ بغداد کے خلفا صوبوں میں ہونے والی بغاوتوں اور اس کے نتیجے میں ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ اور صوبوں کی شکست و ریخت کو خاموش تماشائی بن کر دیکھنے پر مجبور تھے تاہم سر پھٹول آپس تک ہی محدود تھا۔ ایسا بہت کم تھا کہ

کوئی غیر مسلم آ کر کسی مسلمان علاقے پر مسلط ہو گیا ہو، سلجوق مسلمانوں کا کردار خصوصی تذکرے کا متقاضی ہے۔ 11 ویں صدی میں جب وہ آسمان اقتدار پر ابھرے تو انہوں نے نہ صرف وسط ایشیا کو اپنے تصرف میں لے لیا بلکہ اپنی فتوحات کا دائرہ ایشیائے کوچک کے آخری سرے تک پھیلا دیا اور قونیہ (ترکی) کو اپنا دارالحکومت بنایا۔

کئی نسلوں تک محیط حکمرانی کا ایک شاندار دور گزار کر انہیں جگہ عثمانی ترکوں کے لیے خالی کرنا پڑی۔ اور پھر یہ عثمانی ترک تھے جنہوں نے آبنائے باسفورس کو عبور کیا اور یورپ کے قلب میں گھستے چلے گئے یہاں تک کہ مسلم سلطنت کی حدود ویانا کے دروازوں تک پہنچ گئیں۔ ابتداء میں ان کا دارالخلافہ بروسہ (برسا) تھا بعد میں انہوں نے قسطنطنیہ (استنبول) کو مرکز بنایا۔ آج ترکی کا دارالحکومت انقرہ (انگورہ) ہے۔

ترکوں کے زوال کی ابتداء 18 ویں صدی میں ہوئی اور وہ اپنے یورپی مقبوضات میں ایک کے بعد دوسرے ملک سے پسپا ہوتے ہوئے آخر کار 1919ء میں واپس اپنی سرزمین پر پہنچ گئے۔ پہلی جنگ عظیم میں وہ ہر چیز سے محروم ہو گئے۔ کچھ سازگار بین الاقوامی حالات نے ترکوں کی مدد کی اور وہ دوبارہ ایک جمہوریہ کی شکل میں اپنے قدموں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو گئے۔ ترکی اپنی نئی شکل میں کٹڑ قوم پرست اور سیکولر کردار کے ساتھ متعارف ہوا تاہم بتدریج اپنے عوام کی گہری مذہب پسندی کے باعث حکومتیں ملک کی سیکولر پالیسیوں کو پہلی کی سی سختی کے ساتھ جاری نہ رکھ سکیں اور انہیں عوام کی اسلام دوستی کے سامنے ہتھیار ڈالنا پڑے۔

16 ویں صدی میں اپنے عروج کے زمانے میں عثمانی ترک ایک طرف یورپ میں آسٹریا اور دوسری طرف شمالی افریقہ میں الجزائر اور چاڈ، ایشیا میں جارجیا سے یمن تک میسو پوٹیمیا (عراق) اور دوسرے عرب ممالک اور ایشیائے کوچک پر محیط ایک سلطنت کے مالک تھے۔ ان کے بعض مسلمان مقبوضات اب خود مختار ممالک ہیں جبکہ بعض دوسرے سوویت یونین کی گرفت میں جا چکے ہیں۔ (مشرقی یورپ کے یہ ممالک البانیہ، بلغاریہ وغیرہ بھی اب آزاد ہو چکے ہیں۔ مترجم) جب کہ ترکی سے آزادی حاصل کرنے والے غیر مسلم اکثریت والے ممالک اس سے الگ ہیں۔

(507) 13 ویں صدی میں جب کہ سب تاتاری ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ ہلاکو خان کی قیادت میں ان کا ایک بڑا لشکر دارالخلافہ بغداد پر حملہ آور ہوا اور راستے میں تباہی و بربادی پھیلانے کے بعد عروس البلاد کہلانے والے شہر کو نیست و نابود کر دیا۔ لاکھوں مسلمان گاجر مولی کی طرح کاٹ

دیئے گئے۔ یہ واقعہ 1258ء کا ہے۔ ہلاکو خان کا راستہ ایک مسلمان جرنیل رکن الدین بیبرس نے روکا جس کا تعلق مصر سے تھا۔ اس نے فلسطین کے قریب تاتاری لشکر کو شکست فاش سے دوچار کر کے تتر بتر کر دیا۔ ہلاکو نے صلیبیوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے خلاف ایک بڑی یلغار کا منصوبہ بنایا مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔

یہ دور اسلامی علوم کے زوال اور جدید مغربی علوم کے عروج کے آغاز کا ہے۔ (آج 20ویں صدی میں بھی مسلمان سائنس کے شعبہ میں امریکہ اور یورپ کے ہم پلہ ہونے کے مقام سے بہت دور ہیں)

(اب 21ویں صدی کا آغاز ہو چکا ہے اور اب بھی صورتحال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی میں بہت پسماندہ ہیں۔ مترجم)

یہ امر قابل ذکر ہے کہ مسلمان صوفیا کی کوششوں سے وحشی تاتار اسلام کی طرف مائل ہو گئے اور قبول اسلام کے بعد انہوں نے یورپ کا رخ کیا اور بہت سے ممالک پر قبضہ کر لیا۔ فن لینڈ، لتھوانیا، پولینڈ اور سوویت یونین میں مسلمانوں کی موجودگی انہی تاتاریوں کی یادگار ہیں۔

خلافت اندلس:

(508) جیسا کہ اوپر ذکر آ چکا ہے جس وقت عباسیوں نے عبائے خلافت زیب تن کی، اندلس (سپین) میں قائم مسلمان حکومت نے اپنا ناطہ خلافت بغداد سے توڑ لیا اور کم و بیش ایک ہزار سال تک حکومت کرنے کے بعد 1492ء میں اس عظیم الشان اسلامی سلطنت کے بچے کھچے حصے قسطلہ کے مسیحیوں نے ضم کر لیے۔ سپین کا مسلم دور اس ملک کی ترقی اور خوشحالی کا دور تھا۔ یہاں قائم یونیورسٹیوں میں حصول تعلیم کے لیے یورپ بھر سے غیر مسلم طالب علم آتے تھے۔ اس ملک کے چپے چپے پر بکھری مسلم فن تعمیر کی یادگاریں جن میں سے بیشتر اب صرف کھنڈرات کی صورت میں موجود ہیں اس شعبے میں مسلمانوں کے کمال فن کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ سیاسی زوال کے بعد مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی۔ انہیں تلوار کی نوک پر عیسائیت قبول کرنے پر مجبور کیا گیا۔ انکار کی سزا موت تھی۔ ان کی لائبریریوں کو بڑے پیمانے پر تباہ کیا گیا۔ ایک ایک وقت میں ہزاروں قیمتی کتابوں کے قلمی مسودے جلا دیئے گئے اور اس دور میں جب ابھی چھاپہ خانے وجود میں نہیں آئے تھے یہ ایک ایسا نقصان تھا جس کی کبھی تلافی نہیں کی جا سکی۔

مشرقی اور جنوب مشرقی ایشیا:

(509) سرزمین چین کا بیشتر حصہ اسلام کی سیاسی بالادستی سے نا آشنا رہا۔ وسط ایشیا سے پیش قدمی کرتے ہوئے مسلمانوں نے مشرقی ترکستان (اب چین کا صوبہ سن کیانگ) کو اسلام کی روشنی سے منور کیا اور غالباً بحری راستہ اختیار کرتے ہوئے جنوبی صوبے یون نان کو بھی مسلمان کیا۔ مسلمان مبلغوں کی پرامن اور خاموش سرگرمیوں کے نتیجے میں تبت اور چین کے لاکھوں لوگوں نے اسلام قبول کرلیا۔ تاہم چین کی آبادی کا بیشتر حصہ اسلام کے توحید کے پیغام سے محروم رہا۔

(510) جہاں تک جنوب مشرقی ایشیا کا تعلق ہے اس کی کہانی بالکل مختلف ہے۔ ان آخری صدیوں میں جنوبی عرب اور جنوبی ہندوستان کے مسلمان تاجروں نے اس خطے کا رخ کیا اور یہ ان کی بے لوث کوششوں کا اعجاز ہے کہ نہ صرف جزیرہ نما ملایا بلکہ علاقے کے ہزاروں جزائر کی مکمل آبادی نے اسلام قبول کرلیا۔ انڈونیشیا اور فلپائن کے جنوبی جزائر میں اسلام کو قابل ذکر حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہ علاقہ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا اور آہستہ آہستہ یہ خطے یورپیوں خصوصاً انگریزوں اور ولندیزیوں کے قبضے میں آ گئے اور بالآخر صدیوں کی غلامی کے بعد انڈونیشیا کے کروڑوں مسلمانوں نے بیرونی استبداد سے آزادی حاصل کی اور اسی طرح جزیرہ نما ملایا نے بھی آزادی کی منزل حاصل کرلی۔

افریقہ:

(511) شمالی افریقہ میں مصر سے لے کر مراکش تک اسلام کی آمد بالکل ابتداء میں ہوگئی جبکہ براعظم کے باقی حصوں کے لوگ اسلام سے مختلف ادوار میں آشنا ہوئے۔ مشرقی افریقہ کا قدرتی طور پر اسلام سے سامنا سب سے پہلے ہوا کیونکہ عرب سے یہی خطہ قریب ترین تھا۔ اس خطے کے وسیع علاقے نہ صرف مسلمان ہو گئے بلکہ یہاں قابل ذکر اہمیت کے حامل مسلم ممالک بھی وجود میں آ گئے۔

(512) مغربی افریقہ میں اسلام کے اثرات قدرے تاخیر سے پہنچنے شروع ہوئے مگر بعض مسلمان حکمرانوں کی سرگرم کوششوں سے مقامی تہذیب اور روایات سے بھی مدد ملی۔ لوگوں کی بڑی تعداد دائرہ اسلام میں داخل ہوگئی اور ہم ان تمام ادوار میں یہاں بڑی مسلم سلطنتیں قائم

دیکھتے ہیں۔ عرب مؤرخوں کے مطابق یہ اس خطے کے بحری راستوں کے ماہر مہم جو ہی تھے۔ جنہوں نے سب سے پہلے براعظم امریکہ خصوصاً برازیل کا راستہ دریافت کیا۔ کرسٹوفر کولمبس کی قیادت میں جانے والے اولین یورپی باشندوں اور ان کے بعد کے مہم جوؤں کی ملاقات وہاں آباد سیاہ فاموں سے ہوئی۔ تاریخ کو مسخ کرنے کی تمام تر کوششوں کے باوجود یہ باور کرنے کے ٹھوس شواہد موجود ہیں کہ سیاہ فام افریقہ کے مسلمانوں اور بربروں نے امریکہ کی آبادکاری میں حصہ لیا۔ جیسا کہ برازیل کے نام سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ برازیلہ ایک مشہور بربر قبیلہ ہے اور اس قبیلے کے ارکان کا اجتماعی نام یقیناً برازیل ہے۔ اسی طرح اوقیانوس میں جزیرہ پلمہ کو پہلے بنی ہور کہا جاتا تھا اور یہ نام بربر قبیلے بنی ہوارا کے نام پر تھا۔ جس سے اس دعویٰ کو تقویت حاصل ہوتی ہے کہ مسلمان افریقی اہل یورپ سے بھی پہلے براعظم امریکہ میں پہنچ چکے تھے۔ امریکہ کے ساتھ مسلم مغربی افریقہ کے تعلقات مسلم سپین کے سقوط اور اہل یورپ کے امریکہ تک باقاعدہ بحری سفر کے آغاز تک جاری رہے۔

دریں اثناء افریقہ یورپی طاقتوں فرانس، برطانیہ، جرمنی، اٹلی، پرتگال اور بلجیم کی ہوس ملک گیری کا بھی شکار ہو گیا۔ براعظم کے بہت سے خطے ایسے ہیں جو مسلمانوں کے سیاسی اقتدار سے آزاد رہے ہیں اور وہاں بھی اسلام پھیل رہا ہے حالانکہ ان کے مغربی آقاؤں کی طرف سے اس راستے میں مسلسل رکاوٹیں ڈالی جاتی ہیں بلکہ صورتحال پر نظر رکھی جاتی ہے۔ نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کی لہر کے ساتھ مسلم اکثریت کے بیشتر ممالک آزاد ہو چکے ہیں گو کہ بعض ممالک میں غیر مسلم حکمران جبر و تشدد سے اپنی آمریت برقرار رکھے ہوئے ہیں جب کہ بعض علاقے بتدریج خودمختاری کی طرف پیش قدمی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ فرانسیسی صومالی لینڈ، کمورز اور سپینش صحارا اس کی مثالیں ہیں۔ (یہ علاقے اب مکمل آزاد ہو چکے ہیں۔ مترجم)

دور حاضر کی دنیا:

(413) انڈونیشیا سے مراکش تک تیس سے زیادہ مسلمان ممالک اقوام متحدہ کے رکن ہیں۔ (اب اقوام متحدہ کے رکن اسلامی ممالک کی تعداد 60 کے لگ بھگ ہے۔ مترجم) اگر یورپ کے اندر ایک مسلمان ملک البانیہ ہے تو یونائیٹڈ سوشلسٹ سوویت ری پبلک (روس کے حصے بخرے ہونے سے قبل یہ روس کا نام تھا جس کی کوکھ سے 17 ملک جنم لینے کے باوجود اب بھی روس دنیا کا

سب سے بڑا ملک ہے۔ مترجم) کے اندر دوسری مسلمان جمہوریائیں بھی ہیں جو خودمختاری کی جانب پیش قدمی کر رہی ہیں اور جہاں مذہب کی آزادی کے حوالے سے بھی بہتر صورت نمودار ہو رہی ہے۔ (وسط ایشیا کے 6 مسلمان ممالک ازبکستان وغیرہ اب آزاد ہو چکے ہیں۔ مترجم)

برطانویوں نے جو دولت مشترکہ بنائی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غیر مسلم ممالک کی مجموعی بالادستی ساتھی مسلمان ممالک کی حقیقی آزادی کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی بشرطیکہ ان کے حکمران بیدار مغز، ذہین اور اپنے مفاد پر قومی مفاد کو ترجیح دینے والے ہوں۔ اگر سپین، فرانس، روس، ہندوستان، چین اور دوسرے ممالک اپنے مسلمان شہریوں کو حقیقی خودمختاری (داخلی) پر قائل کر لیں تو مکمل آزادی کے لیے ان کی جدوجہد اپنا جواز کھو بیٹھے گی اور ہر فرد امن اور تعاون کے ساتھ ایک عالمگیر فلاح کی فضا میں زندگی گزارے گا۔

(514) اسلام کے پیروکار ہر رنگ و نسل میں موجود ہیں اور صدیوں سے موجود ہیں۔ سوائے امریکی ریڈ انڈینز کے، عربی بولنے والی اقوام اپنی اہمیت خصوصاً اس بنیاد پر جتلاتی ہیں کہ اسلام کی تعلیمات کے سرچشمے قرآن اور حدیث عربی زبان میں ہیں۔ ہندوستانی، پاکستانی اور ملائی انڈونیشیائی دو بڑے نسلی گروپ ہیں جبکہ سیاہ فام نسل اب تک اپنی توانائیوں اور صلاحیتوں کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی جیسے متبحر عالم بھی یہ رائے دیتے ہیں کہ انسانی تہذیب کے آئندہ مرحلے کی قیادت سیاہ فاموں کے ہاتھ میں ہوگی اور اسلام کے پھیلاؤ کا زیادہ زور اس وقت سیاہ فاموں میں ہے اور سیاہ فام نومسلموں میں اسلام کے لیے پایا جانے والا جوش و خروش مسلمہ ہے۔

(515) دنیا میں مسلمانوں کی بالکل صحیح تعداد معلوم کرنا مشکل ہے کیونکہ پیدائش اور وفات کے علاوہ بعض اوقات ذاتی وجوہ کی بناء پر قبول اسلام کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ مگر جو شہادتیں دستیاب ہیں ان کے مطابق آدمؑ اور حواؑ کی اولاد کا چوتھا، پانچواں حصہ ہر روز اپنے منہ کعبہ کی طرف کر کے اعلان کرتا ہے کہ "اللہ اکبر" (اللہ سب سے بڑا ہے)

باب نمبر 15

مسلمان کی روزمرہ زندگی

پیدائش:

(516) اگر ایک مذہب کسی نسل کے لیے مخصوص اور ملک تک محدود نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہے تو اس میں جنم لینے (شامل ہونے) کے دو راستے ہیں:

(i) رضا کارانہ (اختیاری)۔

(ii) غیر ارادی۔

(517) پہلے رضا کارانہ پیدائش (شمولیت) کا تذکرہ۔ ایک بالغ شخص جب بقائمی ہوش و حواس بغیر کسی جبر و اکراہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق:

''زبان سے اعلان اور دل سے اس کی تصدیق'' کے ذریعہ اسلام قبول کرے، طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ اچھی طرح غسل کرے جو علامتی طور پر جسم کو جہالت، گمراہی اور کفر کی گندگی سے پاک کرنے کے لیے ہے۔ پھر وہ کم از کم دو گواہوں کی موجودگی میں کلمہ پڑھ کر اقرار کرے۔

اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ (میں قرار کرتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی اور معبود نہیں اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔)

(518) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ وہ اسلام قبول کرنے والے سے اس کا نام پوچھا کرتے تھے اور اگر اس کے نام میں کوئی مشرکانہ جزو شامل ہوتا تو اس کا نام تبدیل کر کے نیا معروف نام رکھ دیتے تھے مثلاً اگر کسی کا نام عبدالکعبہ عبدالشمس یا اسی طرح کا کوئی اور نام ہوتا تو اسے مکمل طور پر تبدیل کر دیتے۔ آج کل معمول یہ ہے کہ نو مسلم نام کا پہلا حصہ تبدیل کر کے عربی نام رکھ لیتے ہیں۔

(519) عربی زبان ہر مسلمان کی روحانی مادری زبان ہے، اسے سیکھنا واجب ہے۔ کم از کم اس کے حرفوں کی شناخت تو ضرور ہونی چاہیے تاکہ قرآن مجید کو اس کی اصل زبان میں پڑھ سکیں۔ شروع سے ہی دوسرے مذاہب سے دائرہ اسلام میں داخل ہونے والوں نے اس کو بڑی اہمیت دی ہے کہ انہوں نے اپنی مقامی زبانوں کے ساتھ ساتھ عربی کو بھی اپنایا ہے۔ اسی طرح فارسی، ترکی، اردو، ملائی، پشتو، کردش، سپینش، لتھوانین، افریقی ور دوسری زبانیں بولنے والے مسلمان عربی رسم الخط ضرور سیکھتے ہیں۔ اور ہمارا پرزور مشورہ ہے کہ نومسلم حضرات ایک سماجی فریضہ کے طور پر عربی رسم الخط پر عبور حاصل کریں اور کم از کم جب کسی مسلمان کو اپنی مادری زبان میں خط لکھیں تو عربی رسم الخط استعمال کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب عربی کو تمام اعراب کے ساتھ لکھا جائے تو صحت معانی اور کسی ابہام سے پاک تلفظ ہونے کے حوالے سے کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی صوتی خوبصورتی اور اقتصادی فوائد کا تو شمار ہی کیا (یہ ایک طرح کی مختصر نویسی بھی ہے)

(519۔الف) جب غیر عرب مسلمانوں نے اپنی زبانوں میں عربی رسم الخط اپنایا تو انہیں حروف تہجی اور اعراب میں کچھ اضافے کرنے پڑے۔ یہ اضافے مختلف ملکوں اور ادوار میں مختلف رہے ہیں۔ کیونکہ اسلامی دنیا میں کوئی ایسا مرکزی علمی ادارہ نہیں جو یکساں اصطلاحات وضع اور نافذ کر سکے۔ درحقیقت اس کی اشد ضرورت ہے کہ مسلم ممالک اور عربی رسم الخط استعمال کرنے والے غیر مسلم ممالک کا ایک عالمی اجلاس بلایا جائے تاکہ غیر عرب زبانوں اور ناموں کو عربی رسم الخط میں ڈھالنے کے لیے ایک عالمگیر نظام وضع کیا جا سکے۔

اور مختلف زبانوں میں ایک ہی ''غیر عرب صوت'' کو ظاہر کرنے کے لیے عربی کی مختلف صورتیں استعمال کرنے سے بچا جا سکے جیسا کہ بدقسمتی سے اب معمول ہے۔

عربی حروف میں قدیم ترین اضافہ اہل فارس اور ترکوں نے کیا اور اعراب میں اضافہ اہل سپین نے الجمائدو[1] لوگوں کے لیے کیا۔ خود عربوں نے بھی دور حاضر میں غیر ملکی مقامات اور شخصیات کے درست تلفظ کو یقینی بنانے اور کسی حد تک لب و لہجہ کے فرق کو کم کرنے کے لیے بعض اضافے کیے ہیں۔

1۔ جو لفظ العجمیة کا بگڑا ہوا نام ہے جو غیر عربوں کے لیے مستعمل ہے۔ یہاں غیر عربوں سے مراد جزیرہ نما آئبیرین کے لوگ اور زبان ہے جس میں سپین اور پرتگال شامل تھے۔ اس میں سینکڑوں قلمی مسودے اب بھی محفوظ حالت میں موجود ہیں جن میں قرآن مجید کے تراجم بھی شامل ہیں۔

اس مقصد کے لیے بہترین اور غلطیوں سے پاک نظام وضع کرنے کی کوشش جو ہمارے علم میں ہے وہ حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی نے کی تھی اور اس کا تجربہ اپنی بعض ضخیم کتابوں میں کیا ہے مثلاً

Origines du droit des gens by Ernest Nys کا اردو ترجمہ۔

یونیورسٹی نے کم وبیش 12 نئی اور پرانی یورپی زبانوں کو عربی رسم الخط میں منتقل کیا۔ عربی رسم الخط میں منتقلی کے اس نظام کی تفصیلات Islamic Culture نامی کتاب میں مل سکتی ہیں۔ (طبع 1940 حیدر آباد (دکن) صفحہ 486)

(520) عربی زبان کی معروف 28 حروف تہجی ہیں جو چاند کی گردش کی 28 منزلوں کی طرح ہیں مگر ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ایک ہزار حروف کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔ عربی رسم الخط دائیں سے بائیں لکھا جاتا ہے۔[1]

ا	ب	ج	د	ھ	و	ز	ح	ط
1	2	3	4	5	6	7	8	9
ی	ک	ل	م	ن	س	ع	ف	ص
10	20	30	50	60	70	80	90	
ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ	ض	ظ	غ
100	200	300	400	500	700	800	900	1000

ا، ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ

ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ

ف، ق، ک، ل، م، ن، و، ھ، ی

1. اب تدریسی مقاصد کے لیے حرفوں کی ترتیب بدل دی گئی ہے اور لغات میں ان حروف کو ان کی شکل کی مماثلت کے مطابق ترتیب دیا گیا ہے اور ان کی دو اشکال ہیں۔ (1) مکمل؛ (2) جزوی۔ جزوی معمول کی تحریر کے لیے اور مکمل ہر لفظ کے آخر تا کہ یہ دوسرے لفظ سے الگ اور ممیز نظر آئے۔ ہم یہاں صرف مکمل حروف دے رہے ہیں۔

یہ 28 حروف ہیں جو دائیں سے بائیں لکھے جاتے ہیں۔ عربی اعراب یہ ہیں:

َ ِ ٍ ّ ُ ٌ

یہ اعراب پڑھنے والے کے کسی لفظ کے تلفظ کے بارے میں ابہام کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان کا استعمال عموماً غیر عرب قاریوں کے لیے کیا جاتا ہے کیونکہ عربی جن کی مادری زبان ہے ان کے لیے ان کے لگانے کی ضرورت نہیں۔

(520۔الف) درج ذیل اضافے مشرقی زبانوں مثلاً فارسی، کردش، پشتو، اردو وغیرہ اور بعض مغربی زبانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

پ۔چ۔ژ۔ڤ

ڤ: (وی کی آواز جیسے انگریزی میں Love یا جرمن میں W۔

گ۔

ڭ: (جیسے فرانسیسی میں gn کی آواز Ligne)

ں: (نون غنہ جس طرح فرانس میں ن کی آواز ہے۔)

(521) اب ذکر ہوگا غیر ارادی پیدائش (شمولیت) کا۔ جب ایک مسلمان گھرانے میں کسی بچے کی پیدائش ہوتی ہے۔ جب زچگی کی ضروری کارروائیاں مکمل ہو جاتی ہیں تو بچے کے دائیں کان میں اذان اور بائیں میں تکبیر کہی جاتی ہے۔ یعنی بچے کے کان میں جو سب سے پہلی آواز پڑتی ہے وہ اس کے عقیدے کی تصدیق اور اس کے خالق کی عبادت کے لیے بلاوا ہے[1]۔ اذان کے الفاظ یہ ہیں:

اللہ اکبر اللہ اکبر۔ اللہ اکبر اللہ اکبر (4 دفعہ) (اللہ سب سے بڑا ہے)

اشھد ان لا الہ الا اللہ۔ (2 بار) میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

1۔ اذان عموماً بلند آواز سے ایک مینار کے اوپر چڑھ کر دی جاتی ہے اور فجر کی اذان میں میں حیّ علی الفلاح کے بعد دوبار الصلوٰۃ خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) پڑھا جاتا ہے۔ اہل تشیع اسے اس طرح کہتے ہیں: حیّ علی الخیر العمل (آؤ نیکی کے کام کی طرف)۔

اشھد اَنَّ محمد الرسول اللّٰہ۔(2 بار) میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

حَیَّ علی الصلوٰۃ. (دودفعہ) آؤ نماز کی طرف

حیَّ علی الفلاح. (دودفعہ) آؤ فلاح کی جانب

اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر. (دودفعہ) اللہ سب سے بڑا ہے۔

لا اِلہ اِلاَّ اللّٰہ. (ایک دفعہ) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

تکبیر یا اقامہ:

تکبیر یا اقامہ کے[1] الفاظ اس طرح ہیں:

اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر. (اللہ ایک ہے۔اللہ ایک ہے)

اشھد انّ لا الہ الا اللّٰہ. میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

اشھد اَنَّ محمد الرسول اللّٰہ. میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

حَیَّ علی الصلوٰۃ. آؤ نماز کی طرف

حیَّ علی الفلاح. آؤ فلاح کی جانب

اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر. (اللہ سب سے بڑا ہے)(اللہ سب سے بڑا ہے)

لا اِلہ اِلاَّ اللّٰہ. اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔

ابتدائی زندگی:

(522) جب نوزائیدہ بچے کے بال پہلی بار مونڈے جاتے ہیں تو اس کے بالوں کے برابر چاندی یا مروجہ نرخوں کے مطابق اس کے برابر نقد روپے غریبوں میں تقسیم کئے جانے چاہئیں۔اور اگر کوئی وسائل رکھتا ہے تو ایک بکری یا بھیڑ ذبح کر کے غریبوں اور دوستوں کی ضیافت کرنا سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہے۔اس کو عقیقہ کہتے ہیں۔

---

1 تکبیر یا اقامہ نماز کھڑی ہونے کے بعد کوئی ایک مقتدی مناسب آواز کے ساتھ پڑھتا ہے۔(احناف کے نزدیک دوہری تکبیر پڑھنی چاہیے۔مترجم)

(523) ختنہ کے لیے کوئی عمر مقرر نہیں تاہم ابتدائی عمر میں مسلمان بچے کا ختنہ کیا جاتا ہے جو لوگ بالغ ہونے کے بعد مسلمان ہوں ان کے لیے ختنہ کرانا ضروری نہیں۔

(524) جب بچہ تعلیم کے حصول کی عمر کو پہنچتا ہے جو عموماً 4 سال کے بعد ہوتی ہے تو پہلا سبق لینے کے بعد اپنے اہل خاندان کے لیے ایک ضیافت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ برکت کے لیے قرآن کی سورۃ 96 کی پہلی پانچ آیات بچے کے سامنے تلاوت کی جاتی ہیں جو اُمی پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سب سے پہلے نازل ہوئی تھیں۔ بچے سے کہا جاتا ہے کہ وہ انہیں لفظ دہرائے۔آیات یہ ہیں:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ① خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ②

اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ③ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ④

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ⑤

"......پڑھو (اے نبیؐ) اپنے رب کے نام کے ساتھ جس نے پیدا کیا، جمے ہوئے خون کے ایک لوتھڑے سے انسان کی تخلیق کی، پڑھو، اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا۔انسان کو وہ علم دیا جسے وہ جانتا نہ تھا۔" (96:1-5)

(525) جیسے بچہ نماز پڑھنے کے قابل ہو جائے تو اسے نماز کی ادائیگی سکھائی جاتی ہے اور اس میں جو دعائیں پڑھنا ہوتی ہیں وہ اسے زبانی یاد کروائی جاتی ہیں جن کا تذکرہ بعد میں تفصیل سے ہوگا۔ بچے اور بچی کے ساتویں سال سے نماز کے لیے سخت پابندی کرائی جائے تاکہ بچے نماز کے عادی ہو جائیں۔

(526) روزے بھی نماز کی طرح ہی فرض ہیں اور جب بچہ بلوغت کی عمر کو پہنچ جائے تو اس پر روزہ رکھنا فرض ہے، تاہم مسلمان گھرانوں میں بچے اس سے پہلے ہی روزوں کے عادی ہو جاتے ہیں اور جس دن کوئی بچہ رمضان میں پہلا روزہ رکھتا ہے وہ پورے خاندان کے لیے مسرت اور شادمانی کا ہوتا ہے۔عموماً یہ 12 واں سال ہوتا ہے جب کوئی بچہ پہلی بار روزہ رکھتا ہے اور عام طور پر پورے رمضان میں اسے ایک ہی روزہ رکھنے کی اجازت ہوتی ہے۔اس طرح آئندہ رمضان

المبارک میں اسے زیادہ اور پھر اس سے زیادہ۔ حتیٰ کہ وہ بتدریج روزے کی آزمائش برداشت کرنے کا عادی ہو جاتا ہے اور پورے مہینے کے روزے رکھنے لگتا ہے۔ اس دوران وہ مکمل بالغ ہو چکا ہوتا ہے۔

(527) حج صاحب حیثیت شخص پر زندگی میں ایک بار فرض ہے۔ حج 12 ویں قمری مہینے ذوالحج کے دوسرے ہفتے میں ادا کیا جاتا ہے اس موقع پر دنیا بھر سے مسلمان مکہ المکرمہ میں جمع ہوتے ہیں اور شہر کے مضافات میں عرفات، مزدلفہ اور منٰی میں ایک ہفتہ گزارتے ہیں۔ خدام الحجاج ہر حاجی کی رہنمائی کے لیے جگہ جگہ موجود ہوتے ہیں ان مخصوص ایام کے سوا جب کعبہ کا قصد کیا جائے تو یہ عمرہ کہلاتا ہے۔ حج اور عمرہ کی تفصیل اس طرح ہے:

(527۔الف) حج کے لیے معمول کا لباس اتار کر ایک مخصوص پہناوا زیب تن کیا جاتا ہے جسے احرام کہتے ہیں اس میں ایک سفید بغیر سلی چادر ہوتی ہے جسے بطور تہبند باندھتے ہیں جب کہ اس سفید کپڑے کا دوسرا ٹکڑا کندھے کے اوپر چادر کی طرح اوڑھ لیا جاتا ہے۔ (اس کی بُکل ماری جاتی ہے) سر ننگا رکھا جاتا ہے۔ خواتین اپنے معمول کے لباس میں ملبوس رہتی ہیں جو باپردہ اور شائستہ ہو اور بازو اور ٹانگیں ٹخنوں تک ڈھکی ہوئی ہوں۔ بیرون عرب یا مکہ کے باہر سے آنے والے لوگوں کے لیے لازم ہے کہ وہ احرام حدود حرم یعنی میقات سے باہر ہی پہن کر آئیں۔ اہل مکہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ اپنے گھروں میں ہی احرام پہن سکتے ہیں۔ حج کا پہلا مرحلہ عرفات سے شروع ہوتا ہے جہاں دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمان ایک ہی لباس میں ملبوس میدان عرفات میں جمع ہوتے ہیں جہاں وقوف عرفات ہوتا ہے۔ خطبہ حج کے بعد ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی ادا کر کے شب بسری کے لیے یہاں سے کوچ کر کے مزدلفہ پہنچنا ضروری ہے۔ جہاں رات کھلے آسمان تلے گزاری جاتی ہے۔ اس دوران بندے اپنے رب کے حضور عاجزی وانکساری کا اظہار کرتے اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتے، بخشش کی دعائیں کرتے ہیں۔ اس کے بعد 10، 11 اور 12 ذوالحج کے ایام منٰی میں گزارے جاتے ہیں جہاں تینوں دن شیطان کو علامتی طور پر کنکر مار کر دھتکارا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوبارہ کعبہ میں حاضری دے کر طواف اور صفا مروہ کے درمیان سعی کی جاتی ہے۔

احرام میں ملبوس ہونے کے بعد اسے اتارنے تک حاجی ہر نماز کے بعد تلبیہ کا سلسلہ جاری رکھتا ہے (تلبیہ کتاب کے آخری حصہ میں ملاحظہ فرمائیں)

(527-ب) عمرہ اور حج میں یہ فرق ہے کہ عمرہ میں عرفات، مزدلفہ اور منٰی کے مناسک ادا نہیں کرنے پڑتے بلکہ اس میں صرف طواف کعبہ اور سعی کے فرائض ہیں۔ اس میں مکہ کے مکینوں کو بھی احرام باندھنے کے لیے میقات سے باہر جانا پڑتا ہے۔ طواف اور سعی کے بعد "حلق" یعنی سر منڈا کر احرام اتار کر معمول کا لباس پہن لیا جاتا ہے اور عمرہ مکمل ہو جاتا ہے۔

(528) زکواۃ سرمائے کی بچتوں، اناج کے ذخیروں اور ایسی املاک پر واجب الادا ہوتی ہے جو بڑھ رہی ہوں مثلاً زرعی پیداوار، تجارت، کانکنی، بھیڑوں، بکریوں کے ریوڑ، گائیوں اور اونٹوں کے گلّے جو سرکاری (قدرتی) چراگاہوں میں چرتے ہیں، آج کل تو یہ ٹیکس (زکواۃ) نہ صرف غیر مسلم بلکہ مسلمان ممالک میں بھی انفرادی ذمہ داری بنا دی گئی ہے جو مسلمان ایک خیرات کے طور پر ادا کرتے ہیں۔ اس کا نصاب یہ ہے کہ ایک مخصوص رقم (200 درہم یا چاندی کے سکوں یا 20 دینار یا طلائی پاؤنڈ یا 14 ڈالر[1]) کی بچت پر اڑھائی فیصد شرح سے زکوٰۃ کی ادائیگی لازمی ہے۔ اگر وہ شخص مقروض ہے تو پہلے قرضے کی رقم قابل زکواۃ رقم سے منہا کی جاتی ہے۔ زکوٰۃ کی رقم براہ راست ضرورت مندوں کو ادا کی جاتی ہے اور جہاں اسے باضابطہ ادارہ کی شکل میں دی گئی ہو وہاں ادارے کے سپرد کی جانی چاہیے۔

قرآن مجید کے فرمان کے مطابق زکوٰۃ کا مصرف یہ ہے:

> "...... یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لیے ہیں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر مامور ہوں اور ان لوگوں کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو نیز یہ گردنوں کے چھڑانے اور قرضہ داروں کی مدد کرنے میں راہ خدا میں اور مسافر نوازی میں استعمال کرنے کے لیے ہیں۔" (60:9)

(یہ ذکر اس سے قبل اس کتاب کے پیراگراف نمبر 351 میں بھی آ چکا ہے۔)

(529) ایک اور ٹیکس دو سالانہ تہواری کے موقع پر واجب الادا ہوتا ہے۔ رمضان المبارک کے فوری بعد اتنی رقم جو ایک بالغ شخص کے پورے دن کے کھانے کے لیے کافی ہو، غریب کو دینی

1۔ دور حاضر میں جس میں کرنسی کی قیمتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں تو اس تناسب میں بھی اسی طرح تبدیلی ہوتی ہے (سونے اور چاندی میں 10:1 کا تناسب بھی قائم نہیں رہا) زکوٰۃ کے لیے کم سے کم رقم کا تعین مقامی علماء کے مشورے سے کیا جاسکتا ہے)

لازمی ہے (فطرانہ) دوسرا تہوار جو حج کے موقع پر آتا ہے عیدالاضحیٰ ہے۔ نماز عید کے بعد صاحب حیثیت لوگ قربانی کرتے ہیں اور گوشت کا ایک حصہ غریبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جب کہ ایک حصہ اپنے گھر میں استعمال کی اجازت ہے۔

(530) مالی معاملات میں یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ سودی لین دین، سٹہ بازی، لاٹری یا اس سے ملتے جلتے کسی کاروبار میں حصہ لے۔ کوئی بھی شخص خوشی سے سود ادا نہیں کرتا، اس لیے کسی شخص کو دیے گئے قرض پر سود کی ادائیگی کے مطالبے سے احتراز کرنا چاہیے۔

جہاں تک بینک کھاتوں پر سود کا تعلق ہے تو یہ قدرے پیچیدہ معاملہ ہے اور اس کا انحصار ہر بینک کے نظام پر ہے۔ اگر کوئی بنک سودی کاروبار کرتا ہے تو اس کے کھاتوں پر حاصل ہونے والا منافع بھی ناجائز ہے تاہم ایسے ممالک بھی ہیں جہاں غیر سودی بینک نہیں ہیں اور سود لینے سے انکار پر بینک بعض اوقات یہ رقوم ایسے اداروں کو بھی عطیہ کر دیتے ہیں جو اسلام کے خلاف کام کرتے ہیں مثلاً ایسے مشنری ادارے جو لوگوں کو ارتداد پر مائل کر رہے ہوں، ایسی صورت میں کھاتہ دار کو چاہیے کہ وہ بینک سے سود کی وہ رقم وصول کرلے مگر اسے اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے ضرورت مندوں کو دے دے۔ عظیم فقیہہ سرخسیؒ کا کہنا ہے:

"ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والے منافع کو صدقات میں دے کر اس سے جان چھڑوالی جائے۔"

(531) جہاں تک بیمہ کا تعلق ہے تو سرکاری اداروں یا اشتراک باہمی (امداد باہمی) کی بنیاد پر قائم اداروں سے بیمہ کرنا جائز جب کہ سرمایہ دارانہ بنیاد پر بننے والی کمپنیوں سے ناجائز ہے۔

شادی:

(532) مسلمان مرد کو نہ صرف مسلمان بلکہ یہودی اور مسیحی العقیدہ عورت سے شادی کی بھی اجازت ہے (قرآن 5:5) تاہم بت پرست، مشرک اور منکر خدا عورت سے مسلمان مرد کی شادی جائز نہیں جب کہ مسلمان عورت کو کسی غیر مسلم سے خواہ وہ کسی بھی عقیدے کا حامل ہو شادی کی اجازت ہے (نہ ہی غیر مسلم شوہر کے ساتھ رہنے کی اگر بیوی نے اسلام قبول کرلیا ہو) (قرآن 2:221)

(533) اس صورت میں کہ شوہر مسلمان ہو جائے مگر اس کی بیوی بدستور یہودی یا مسیحی رہنا چاہے تو اس شادی کے برقرار رکھنے کی اسلام میں اجازت ہے لیکن اگر بیوی کا تعلق ممنوعہ عقیدے (یعنی بت پرست، مشرک یا منکر خدا) سے ہو تو شوہر کے مسلمان ہوتے ہی دونوں کا ازدواجی تعلق منقطع ہو جائے گا جب کہ بیوی کو مناسب وقت دیا جائے گا کہ وہ اس بات پر غور کرے کہ آیا اسے شوہر کا مذہب قبول کر کے بدستور اس کے نکاح میں رہنا ہے یا اپنے عقیدے پر قائم رہ کر یہ تعلق ختم کرنا ہے۔ اگر بیوی اپنے عقیدے پر قائم رہنے پر مصر ہے تو پھر علیحدگی ناگزیر ہے۔

(534) اگر عورت مسلمان ہو جائے اور شوہر غیر مسلم رہنے پر اصرار کرے تو دونوں میں ازدواجی تعلق فوری طور پر ختم ہو جائے گا۔ جس کے بعد مرد کو مناسب وقت دیا جانا چاہیے کہ وہ اس حوالے سے فیصلہ کر لے جس کے بعد عورت بذریعہ عدالت علیحدگی کا مطالبہ کرے۔

موت:

(535) مسلمان پر جب موت کا لمحہ وارد ہوتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس کی زبان پر کلمہ جاری ہو اور اس دوران وہ اپنے رب کے حضور جانے کے لیے یہ دنیا چھوڑ دے۔ "لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رسول اللّٰه (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں) اس کے بستر کے ارد گرد موجود لوگ بھی خود کلمہ ادا کر کے کوشش کرتے ہیں کہ اس لمحے اس کی زبان پر کلمہ جاری ہو جائے۔ اسے تلقین کہتے ہیں۔ روح کے نکلنے کے بعد جسم کے سخت ہونے سے قبل مردے کے ہاتھ سینے پر اس طرح رکھ دیئے جاتے ہیں جیسے وہ نماز میں قیام کی حالت میں کھڑا ہو اور یا پھر پہلوؤں کے ساتھ لگا دیئے جاتے ہیں جیسے رکوع سے اٹھنے کے بعد ہوتے ہیں۔

(536) جسد مردہ کی تدفین سے قبل اسے غسل دیا جاتا ہے اور اسے سفید سوتی کپڑے کی تین چادروں میں لپیٹ کر کفن پہنایا جاتا ہے۔ غسل دیتے وقت پہلے مرحلے پر اس کا وضو کرایا جائے پھر صابن یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز ملا کر پانی جسم کے اوپر بہایا جاتا ہے اور پھر (کپڑے کی تھیلیاں ہاتھوں پر چڑھا کر) پورے جسم کو نرمی سے مسل کر صاف کیا جاتا ہے۔ جس کے بعد صاف پانی بہا کر صابن وغیرہ اتار دیا جاتا ہے۔ آخری مرحلے پر کافور ملا پانی جسم کے اوپر بہایا جاتا ہے اگر غسل کے لیے پانی میسر نہ ہو تو تیمم بھی کافی ہے۔ (اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو پیرا گراف نمبر 552 کتاب ہذا)

جسد کی تکفین کے بعد اس کی مغفرت کے لیے نماز جنازہ کا اہتمام کیا جاتا ہے (نماز جنازہ کے طریقے کے لیے ملاحظہ ہو پیرا گراف نمبر 569 کتاب ہذا) نماز جنازہ غائبانہ بھی پڑھی جا سکتی ہے اگر میت کی تدفین کے مقام پر پہنچنا ممکن نہ ہو، قبر کھودتے وقت کوشش ہوتی ہے کہ کعبہ رخ کے متوازی ہو اور دفن کرتے وقت سر کو ہلکا سا اس طرح رخ دے دیا جاتا ہے تا کہ منہ کعبہ کی طرف ہو جائے۔ میت کو لحد میں اتارتے وقت یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ عَلٰی مِلَّتِ رَسُوْلِ اللّٰه.

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ تدفین کے بعد دو فرشتے مردہ کے پاس آتے ہیں اور اس سے اس کے دین کے بارے میں کچھ سوال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر تدفین کے بعد جب تمام لوگ رخصت ہو جاتے ہیں تو ایک شخص قبر پر رُک جاتا ہے اور کچھ مخصوص کلمات دہراتا ہے۔ یہ گویا مردہ کو لقمہ دیا جاتا ہے کہ وہ سن کر فرشتوں کے سوالوں کے جواب دے سکے۔ اس کا ترجمہ درج ذیل ہے (اصل متن جدول D میں ملاحظہ فرمائیں)

"...... اے اللہ کے بندے / اے اللہ کی بندی یاد کر وہ عہد جو تم نے دنیا چھوڑتے وقت کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور یہ کہ جنت برحق ہے اور یہ کہ دوزخ برحق ہے اور یہ کہ قبر میں سوال و جواب برحق ہے اور یہ کہ قیامت آئے گی اس میں کوئی شک نہیں اور اللہ تعالیٰ ان کو زندہ کرے گا جو قبروں میں ہیں اور بے شک تم نے اللہ کو اپنا رب تسلیم کیا اور دین کی حیثیت سے اسلام کا انتخاب کیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنا پیغمبر مانا۔ قرآن کو اپنا رہنما، کعبہ کو اپنا قبلہ اور دوسرے مسلمانوں کو اپنا بھائی مانا۔ خدا تم کو اس آزمائش میں ثابت قدم رکھے۔"

"ایمان لانے والوں کو اللہ ایک قول ثابت کی بنیاد پر دنیا اور آخرت میں ثبات عطا کرتا ہے اور ظالموں کو اللہ بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔" (قرآن مجید 27:14)

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

''اے اطمینان پانے والی روح۔''

''اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل، تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔''

''تو میرے (ممتاز) بندوں میں شامل ہو جا۔''

''اور میری بہشت میں داخل ہو جا۔'' (89:27-30)

(537) قبروں کو نمایاں کرنے پر فضول خرچی کرنے کی سخت ممانعت ہے اور قبروں کو جس حد تک ممکن ہو سادہ رکھنا چاہیے۔ یہ زیادہ بہتر ہے کہ اپنا مال غریبوں اور ضرورت مندوں پر خرچ کیا جائے اور اللہ سے دعا کی جائے کہ اس صدقہ کا ثواب مرنے والے کو پہنچ جائے۔

عمومی عادات و معمولات:

(538) روزانہ پانچ وقت نماز اور سال میں ایک بار ماہ رمضان المبارک میں روزے رکھنے کے علاوہ مسلمانوں کو بعض دوسرے اعمال کی بھی تاکید کی گئی ہے جس میں سب سے اہم یہ ہے کہ قرآن مجید کی تلاوت اور ترجمہ کے ساتھ پڑھنے کو معمول بنایا جائے اور اس کے مندرجات پر غور کیا جائے تاکہ مسلمان ان تعلیمات کو اپنی زندگی میں جاری و ساری کر لیں اور اللہ تعالیٰ کے کلام سے بڑھ کر کیا چیز باعث برکت ہو سکتی ہے۔

(539) مسلمان کے لیے لازمی ہے کہ وہ ہر کام شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ (اللہ کے نام سے) کہے اور اسے ختم کرنے کے بعد کہے الحمد للہ (تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں یعنی اظہار تشکر) جب کسی کام کے ارادے کا اظہار کرے یا مستقبل کے لیے وعدہ کرے تو کہے ''انشاء اللہ'' (اگر اللہ کو منظور ہوا تو)۔

(540) دو مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام'' علیکم (تم پر سلامتی ہو) یا السلام علیکم۔

دوسرا شخص کہتا ہے وعلیکم السلام (اور تم پر بھی سلامتی ہو) یہ کلمات انگریزی کے گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ سے زیادہ جامع ہیں۔

(541) مسلمان کو چاہیے کہ رات کو سوتے وقت اور صبح اٹھتے ہی اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرے۔ اس سلسلے میں سبحان اللہ، سبحان اللہ آسان ترین وظیفہ ہے۔ اس کے علاوہ کثرت سے

درود شریف کا ورد کرے۔ مثلاً یہ وظیفہ معمول بنالیا جائے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ علٰی محمد وَبارک وسلم (اے اللہ تعالیٰ رحمت بھیج محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور اپنی برکت بھیج آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی حفظ وامان میں رکھ)

(542) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دائیں پہلو کو ترجیح دیتے، جب پاؤں میں کھڑاویں (سینڈل کی طرز کے کھلے جوتے) پہنتے تو دائیں پاؤں میں پہلے پہنتے اور پھر بائیں پاؤں میں اور جب اتارتے تو بائیں پاؤں سے پہلے اور دائیں پاؤں سے بعد میں اتارتے۔ جب قمیض (یا عبا) زیب تن فرماتے تو دائیں آستین میں پہلے بازو ڈالتے اور پھر بائیں میں، جب سر مبارک میں کنگھی کرتے تو دائیں نصف سر میں پہلے اور بائیں نصف سر میں بعد میں کنگھی پھیرتے۔ جب گھر یا مسجد میں داخل ہوتے تو دایاں پاؤں پہلے اندر رکھتے اور پھر بایاں پاؤں اندر کرتے۔ اس کے برعکس جب آپ طہارت خانہ (واش روم) میں داخل ہوتے تو بائیں پاؤں کو پہلے اندر کرتے اور پھر دائیں کو۔ اور جب باہر آتے تو دائیں پاؤں پہلے نکالتے اور اس کے بعد بائیں پاؤں کو نکالتے۔ لباس یا جوتا اتارتے وقت بائیں سے آغاز فرماتے۔ جب کوئی چیز تقسیم کرنا مقصود ہوتی تو دائیں طرف کھڑے لوگوں سے شروع کرتے اور بائیں پر جا کر ختم کرتے۔

(542۔الف) روزمرہ کے ہر کام کے شروع کرنے سے قبل اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا اور اس کے کرم و رحمت کے لیے دعائیں زندگی کا مستقل معمول بنا لینی چاہئیں چاہے یہ کام حوائج فطرت ہوں یا کاروبار حیات کے دوسرے کام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مبارکہ میں ہر موقع کے لیے مخصوص دعائیں موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ کا ذکر پیراگراف نمبر 166 ب میں آچکا ہے۔ جب کہ باقی دعائیں احادیث کی معروف کتابوں سے مل سکتی ہیں۔

خوردونوش:

(543) اس حوالے سے اہم ترین نکات درج ذیل ہیں:

(544) خنزیر کا گوشت اور چربی ہر شکل میں اس طرح ممنوع ہیں جیسے نشہ آور مشروبات، ایک غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن مجید میں جو لفظ خمر استعمال ہوا ہے، اگرچہ اس کے لفظی معنی تو انگوروں سے بنی ہوئی شراب ہے تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں خمر سے مراد ہر نشہ آور مشروب لیا جاتا تھا۔ اس لیے جب "خمر" کے بارے میں آیت نازل ہوئی تو مدینہ

کے مسلمانوں نے ہر قسم کے نشہ آور مشروبات کے تمام سٹاک گلیوں اور نالیوں میں انڈیل دیئے اور یہ نہیں سمجھا کہ یہ حکم ایک مخصوص شراب کے لیے ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ مدینہ میں کھجوروں سے شراب تیار کی جاتی تھی۔ جہاں تک گوشت کا تعلق ہے مسلمان ایسے جانوروں اور پرندوں کا گوشت استعمال نہیں کرتے جنہیں صحیح طریقے سے ذبح نہ کیا گیا ہو۔ قرآن مجید میں فرمان ہے:

''تم پر مرا ہوا جانور اور (بہتا) لہو اور سور کا گوشت اور جس چیز پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے اور جو جانور گلا گھٹ کر مر جائے اور جو چوٹ لگ کر مر جائے اور جو گر کر مر جائے اور جو سینگ لگ کر مر جائے، یہ سب حرام ہیں اور وہ جانور بھی جس کو درندے پھاڑ کھائیں۔ مگر جس کو تم (مرنے سے پہلے) ذبح کر لو اور وہ جانور بھی جو تھان پر ذبح کیا جائے (بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے) ہاں جو شخص بھوک سے ناچار ہو جائے (بشرطیکہ) گناہ کی طرف مائل نہ ہو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔'' (3:5)

بے شک حلال جانور اور پرندے بھی اگر غیر مسلموں کے ذبح کیے ہوئے ہیں تو ان کا گوشت مسلمانوں کے لیے حلال نہیں۔ البتہ اس صورت میں جائز ہے اگر اہل کتاب (مسیحی یا یہودی) کے ذبح شدہ ہوں اور بشرطیکہ انہوں نے اپنے مذہبی عقائد کے مطابق انہیں ذبح کیا ہو اگر کسی مسیحی نے مرغ جھٹکے سے ذبح کیا ہے تو وہ بھی اسی طرح جائز نہیں جیسے خود کسی مسلمان کا جھٹکا جائز نہیں۔

(545) اسلامی طریقہ سے ذبح کا عمل اس طرح ہے کہ چھری چلانے کے وقت بسم اللہ پڑھا جاتا ہے (مسلمانوں میں معمول بسم اللہ، اللہ اکبر پڑھنے کا ہے۔ مترجم) گلا کاٹتے وقت نرخرہ اور خوراک کی نالی کاٹی جاتی ہے اور شہ رگ کو بھی کاٹ دیا جاتا ہے۔ تاہم حرام مغز کو نہیں چھیڑا جاتا۔ جب تک جانور کی جان مکمل طور پر نہ نکل جائے سر کاٹ کر الگ کیا جائے نہ ہی کھال اتارنے کا کام شروع کیا جائے۔

(546) کھانے کے لیے سونے اور چاندی کے برتنوں کا استعمال بھی مسلمانوں کے لیے ممنوع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

''سونا اور خالص ریشم کا پہننا مردوں کے لیے جائز نہیں۔ صرف عورتوں کو اجازت ہے۔'' تاہم کچھ مستثنیات ہیں جن کے تحت فوجی یونیفارم کے طور پر ریشم پہننا جائز ہے۔ اس

طرح دانت پر سونے کا خول چڑھوانے کی بھی اجازت ہے۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اپنے دانت پر سونے کا خول چڑھایا تھا۔ اس کے علاوہ عرفجاہ بن اسعد نامی ایک صحابی نے روایت کیا کہ ان کی ناک ایک جنگ میں کٹ گئی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اجازت دی تھی کہ وہ ناک کے اوپر سونے کا خول پہن لیں کیونکہ چاندی کا خول گل گیا تھا۔

لباس اور آرائش گیسو:

(547) مسلمان مردوں کے لیے مکمل قدرتی ریشم سے بنا لباس پہننا جائز نہیں اس طرح سرخ رنگ کے کپڑے بھی مردوں کو پہننے کی اجازت نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب ریش تھے اور مسلمانوں کو بھی حکم دیا کہ داڑھی بڑھائیں۔

(548) مسلمان عورتوں کے لیے حکم ہے کہ وہ جسم کو اچھی طرح ڈھانپنے والا شائستہ لباس پہنیں اور ایسے پہناوے سے گریز کریں جس سے کسی طرح جسم جھلکے یا برہنگی کا شائبہ ہو۔ ان کے لیے لباس اور بالوں کی تراش میں مردوں کی مشابہت اختیار کرنا بھی جائز نہیں۔ انہیں ان تمام چیزوں سے گریز مناسب ہے جو بازاری عورتوں کا خاصہ ہیں۔ ان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ نماز کی ادائیگی کے دوران سر کو ڈھانپ کر رکھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواتین کے لیے تاکید فرمائی ہے کہ وہ زیر جامہ بھی استعمال کریں (ٹراؤزر کی بھی اجازت ہے) اور (باہر جاتے وقت) ان کے گاؤن (عبا، برقعہ) پنڈلی کے نصف سے ہرگز اوپر نہیں ہونے چاہئیں بلکہ بہتر یہ ہے کہ ٹخنوں تک ہوں (جیسا کہ ابوداؤد، ترمذی، ابن حنبل اور دوسروں کی روایت کردہ احادیث سے ثابت ہے)

نماز اور وضو:

(549) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ''صفائی نصف ایمان ہے۔'' اس لیے نماز کی تیاری جسم کی صفائی سے شروع ہوتی ہے۔ عام طور پر نمازوں کے لیے وضو ہی کافی ہے تاہم بعض دوسری صورتوں میں غسل واجب ہے یعنی جب میاں بیوی ہمبستری کریں یا مرد کو سوتے وقت احتلام ہو جائے (برے خواب سے پاجامہ گیلا ہو جائے) عورتیں جب ایام (ماہواری) سے فارغ ہوں اور جب ان بچے کی پیدائش کے بعد مقررہ ایام گزر جائیں۔ جمعہ کی نماز کے لیے نہا کر مسجد میں جانے کی زوردار تاکید کی گئی ہے۔

(550) غسل کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وضو کیا جائے اور پھر پورے جسم پر سر سے پاؤں تک کم از کم تین بار پانی بہایا جائے۔ غسل کے لیے شاور موزوں ترین ہے تاہم اگر شاور میسر نہ ہو تو ٹب سے نہانے کے بعد سر اور کندھے پر صاف پانی کا ایک جگ ضرور انڈیل لیا جائے۔

(551) وضو کا طریقہ یہ ہے:

''سب سے پہلے بسم اللہ پڑھ کر وضو کی نیت کریں اور دونوں ہاتھ کلائیوں تک دھوئیں، اس کے بعد منہ میں پانی ڈال کر انگلی کے ساتھ منہ اندر سے صاف کر کے کلی کریں۔ پھر چلو میں پانی لے کر اس میں ناک ڈبوئیں اور اندر انگلی سے دونوں نتھنے صاف کریں۔ اس کے بعد چہرے کو ماتھے سے لیکر ٹھوڑی تک اور دونوں کانوں تک دھوئیں۔ اس کے بعد بازو کہنیوں سمیت دھوئیں اور پھر مسح کریں۔ مسح کا طریقہ یہ ہے کہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو نئے پانی سے گیلا کریں اور سامنے سے پیچھے کی طرف انگلیاں بالوں میں پھیرتے ہوئے لے جائیں اور دونوں کانوں کے سوراخوں میں گلی انگلیاں ڈالکر صاف کریں (بعض مسالک کے نزدیک گردن کا مسح بھی ضروری ہے) پھر پہلے دائیں اور پھر بائیں پاؤں ٹخنوں تک دھوئیں۔ ان میں سے ہر فعل تین تین بار کیا جاتا ہے (سوائے مسح کے جو ایک ہی بار کافی ہے۔ مترجم) تاہم پانی ناکافی ہو تو ایک بار دھونا بھی کافی ہے۔

(552) اگر پانی بالکل میسر نہ ہو تو تیمم کی اجازت ہے۔ ایسے مریضوں کو بھی جنہیں پانی چھونے سے نقصان کا اندیشہ ہو۔ تیمم کی اجازت ہے۔ تیمم کا طریقہ یہ ہے کہ اس کی نیت کر کے بسم اللہ پڑھیں اور پاک مٹی کے اوپر ہاتھ پھیر کر چہرے پر پھیر لیں۔ پھر اسی طرح مٹی کے اوپر ہاتھ پھیر کر بائیں ہتھیلی دائیں بازو پر اور دائیں ہتھیلی بائیں بازو پر پھیر لی جائے، پاک مٹی کے لیے کچے مکانوں کی دیواریں بھی استعمال ہو سکتی ہیں۔ تیمم اللہ تعالیٰ کے حضور بندے کی عاجزی کے اظہار کی علامت ہے۔

(553) ہر نماز کے لیے نیا وضو اس صورت میں ضروری ہے اگر پہلا وضو اونگھ آ جانے سے، جسم سے ہوا خارج ہونے، پیشاب کرنے یا اعضاء تناسل سے کوئی مادہ خارج ہونے یا قے آ جانے کی بناء پر ٹوٹ گیا ہو۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ ٹائلٹ استعمال کرنے کے بعد پانی کا استعمال کرنا چاہیے اور صفائی کے لیے ٹائلٹ پیپر یا ٹشو کافی نہیں ہوتا۔

(554) نماز کی ادائیگی کے لیے لباس اور جگہ کا پاک ہونا اور منہ قبلہ رخ ہونا ضروری ہے۔ (مکہ میں کعبہ کی جانب) آج سائنسی ایجادات کی بدولت قبلہ کا رخ متعین کرنا کچھ مشکل نہیں۔ مثلاً انگلینڈ کے لوگ جنوب مشرق کی جانب رخ کریں گے تو امریکہ کے لوگ مشرق، جنوب، مشرق کی طرف۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ دنیا گول ہے اس لیے کسی مقام اور کعبہ کے درمیان مختصر ترین فاصلہ تلاش کیا جانا چاہیے۔ نیویارک کے رہنے والوں کے لیے ان کا رخ مشرق، جنوب، مشرق ہوگا تو الاسکا کے لیے جنوب مغرب ہوگا۔ کعبہ کا بالمقابل (کرہ ارض کے دوسری طرف اس کے عین سامنے کا علاقہ) سینڈوچ یا جزائر سموائے قریب واقع ہے اور اس مقام سے گزرتے ہوئے مثلاً کشتی یا جہاز کے سواروں کے لیے چاروں اطراف کعبہ سے برابر فاصلوں پر ہوں گی اس لیے یہ امام کی صوابدید پر ہوگا کہ وہ کس طرف رخ کر کے نماز کی امامت کروادے۔ کعبہ کے اندر بھی یہی صورت ہے کہ آپ جس طرف چاہیں منہ کر کے رب کے حضور کھڑے ہو جائیں۔

(555) روزانہ پانچ نمازیں فرض ہیں تاہم ہر جمعہ کے روز نماز ظہر (کے وقت میں جمعہ کی نماز) جماعت کے ساتھ ادا کرنا لازمی ہے۔ دو سالانہ تہوار ہیں۔ ایک ماہ رمضان المبارک کے اختتام پر روزوں کی تکمیل پر اظہار تشکر کے لیے عید الفطر اور دوسرا حج کے موقع پر عید قربان۔ تمام نمازیں ایک دوسرے سے ملتی جلتی ہیں تاہم رکعتوں کی تعداد مختلف ہے۔ سوائے نماز جنازہ کے جس کا ذکر بعد میں (پیراگراف نمبر 569) میں آرہا ہے۔ دن کی پہلی نماز فجر ہے، جس کے دو (فرض) رکعتیں ہیں (رکعت کی وضاحت آگے آئے گی) اس کے بعد ظہر اور عصر کی بھی چار چار (فرض) رکعتیں ہیں۔ مغرب کی تین اور عشاء کی بھی 4 (فرض) رکعتیں ہیں۔ جمعہ اور عیدین کی دو دو رکعتیں ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نماز عشاء کے بعد تین رکعت وتر پڑھنے کی بھی سخت تاکید کی ہے۔

(555۔الف) فرض نمازیں تو پانچ ہیں تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ معمول تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر نماز کے ساتھ فرضوں کے علاوہ کچھ مزید رکعتیں بھی ادا فرمایا کرتے تھے۔ جو سنت مؤکدہ کہلاتی ہیں اور ان کی ادائیگی کی بھی سخت تاکید فرمائی۔ اس معمول کے مطابق نماز فجر سے قبل دو رکعت، نماز ظہر سے قبل 4 رکعت اکٹھی یا دو دو کر کے اور 4 فرضوں کی ادائیگی کے بعد

دو رکعت، نماز مغرب کے 3 رکعت فرض کے بعد 2 رکعت (نماز سنت) ادا فرمایا کرتے تھے۔ نماز عشاء کے بعد تین رکعت (وتر) بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی تاکید بھی فرمائی۔ حنفی مکتب فکر کے مطابق یہ تین وتر اکٹھے ادا کیے جاتے ہیں جب کہ باقی مکاتب فکر کے نزدیک دو رکعت اور پھر الگ سے ایک رکعت پڑھ کر تین پورے کیے جاتے ہیں۔ ان نمازوں کے علاوہ نوافل کی تعداد مقرر نہیں اور ہر مسلمان اپنی سہولت کے مطابق جتنے نوافل چاہے ادا کر سکتا ہے۔ زیادہ نوافل زیادہ مستوجب جزا ہوں گے۔ مسجد میں داخل ہونے کے بعد دو رکعت نفل تحیۃ المسجد کے طور پر ادا کرنا بھی سنت نبویؐ ہے۔

(556) نماز کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے وضو کیا جاتا ہے اور پھر نماز کی ادائیگی کے لیے مناسب جگہ کا انتخاب جہاں کھڑے ہو کر نمازی اپنا منہ قبلے رخ کر کے ہاتھ کانوں (کی لوؤں) تک اٹھاتا ہے اور پھر نیت کرتا ہے کہ "میں نیت کرتا ہوں فلاں نماز کی، جس کی رکعت اتنی ہیں، منہ طرف قبلہ کے (مثلاً نماز ظہر کی نیت اس طرح ہوگی 4 رکعت فرض نماز ظہر منہ طرف قبلے کے...... اللہ اکبر)

جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے وقت بھی انفرادی نیت کر لینی چاہیے۔ اس کے بعد اگر نماز جماعت کے ساتھ ہے تو امام بآواز بلند اللہ اکبر کہتا ہے جب کہ مقتدی سرگوشی کے انداز میں اللہ اکبر کہتے ہیں[1]۔ اور پھر ہاتھوں کو سیدھا نیچے گرا دیں، مالکیوں اور اہل تشیع کے نزدیک نیت اس طرح باندھی جاتی ہے کہ ہاتھ دونوں پہلوؤں پر اس طرح گرا دیں کہ ہتھیلیاں رانوں کو چھو رہی ہوں جب کہ باقی تمام مکاتب فکر کے مطابق ہاتھ سینے پر اس طرح باندھے جاتے ہیں کہ بائیں ہاتھ جسم کے ساتھ مس کر رہا ہوتا ہے اور دائیں ہاتھ اس کے اوپر باندھ لیا جاتا ہے۔

اب نماز شروع ہو گئی ہے اب نمازی نہ تو کسی سے بات کرے اور نہ ہی اِدھر اُدھر دیکھے بلکہ اس کی نظر اس نکتہ پر مرکوز ہونی چاہیے جہاں سجدہ میں اس کا سر جا کر ٹکے گا۔ ہر نئی حرکت یعنی رکوع، سجود اور سجدہ سے اٹھتے وقت اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔

---

1 اگر دو نمازی بھی ہوں تو اس میں سے ایک کو امام بن جانا چاہیے اور دوسرا مقتدی کی حیثیت سے اس سے چند انچ پیچھے کھڑا ہو جائے اور اگر تعداد تین یا زیادہ ہیں تو پھر مقتدیوں کو تعداد کے مطابق امام کے پیچھے ایک یا دو قطاریں بنا لینی چاہئیں۔ مقتدی بلند آواز سے کچھ نہ پڑھیں بلکہ زیر لب پڑھیں اور امام کی حرکات و سکنات کی اقتدا کریں۔

(557) نماز کے شروع میں ثناء پڑھی جاتی ہے۔(حوالہ جدول اے)اس کے بعد سورۃ فاتحہ (جدول بی)اور پھر قرآن مجید کی کوئی سورۃ یا سورۃ کا کوئی حصہ(مثال جدول سی،ڈی،ای وغیرہ) مقتدی تمام نمازوں میں جو کچھ پڑھنا ہوتا ہے زیرلب پڑھتے ہیں البتہ امام فجر،مغرب اور عشاء کے علاوہ نماز جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں سورۃ فاتحہ اور قرآنی سورۃ کی قرأت بالجہر کرتا ہے۔

(558) حالت قیام میں قرآن مجید کی سورۃ کی تلاوت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر جھک جاتے ہیں۔ یہ حالت رکوع کہلاتی ہے۔ اس دوران کم از کم تین بار سبحان ربی العظیم پڑھا جاتا ہے۔(تصویر 3) اس کے بعد کھڑے ہو کر کہا جاتا ہے سمع اللّٰہ لمن حمدہ، ربنا لک الحمد۔

اگر نماز باجماعت ہے تو امام بلند آواز کے ساتھ کہتا ہے سمع اللّٰہ لمن حمدہ جب کہ مقتدی صرف یہ کہتے ہیں ربنا لک الحمد۔اس حالت قیام میں ہاتھ دونوں پہلوؤں کے ساتھ کھلے چھوڑ دیئے جاتے ہیں پھر اللہ اکبر کہہ کر سجدے میں چلے جاتے ہیں۔سجدے میں گھٹنے موڑ کر پیشانی،ناک اور ہتھیلیاں جائے نماز پر نرمی کے ساتھ ٹکا دی جاتی ہیں۔ سجدے کی حالت میں کم از کم تین بار سبحان ربی الاعلیٰ پڑھا جاتا ہے۔ اس کے بعد نمازی اس انداز میں بیٹھتا ہے کہ اس کا وزن بائیں پاؤں پر آ جاتا ہے جبکہ دائیں پاؤں کو وہ سیدھا کھڑا کر لیتا ہے جس میں نیچے زمین کے ساتھ پیوست اور ایڑی اوپر آسمان کی جانب اٹھی ہوئی ہے اس کیفیت میں جو جلسہ کہلاتی ہے وہ اللہ سے مغفرت کی دعا کرتا ہے(جدول او)اس کے بعد وہ پھر سجدے میں چلا جاتا ہے اور وہی کلمہ دہراتا ہے جو پہلے سجدے میں کہے تھے اور پھر اللہ اکبر کہہ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس سارے عمل کو ایک رکعت کہتے ہیں۔

(559) دوسری رکعت کا آغاز سورۃ فاتحہ سے کیا جاتا ہے اور اس کے بعد کوئی قرآنی آیت پڑھی جاتی ہے۔(مثلاً جدول جی میں شامل آیت میں سے کوئی ایک) اس رکعت میں ثناء نہیں پڑھی جاتی اس کے بعد پھر رکوع،قیام اور سجود مگر اس میں دوسرے سجدہ کے بعد کھڑے ہونے کے بجائے "جلسہ" کی پوزیشن میں بیٹھے رہتے ہیں(قعدہ)اور اس کے بعد "جلسہ تشہد" کے دوران التحیات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود پڑھتے ہیں۔(جدول پی)

(560) چونکہ نماز فجر،جمعہ اور عیدین کی نماز دو رکعت پر مشتمل ہوتی ہے اس لیے درود کے بعد ایک دعا اللہ کے حضور پیش کی جاتی ہے(جدول کیو)اور پھر نماز کا اختتام ہو جاتا ہے اور اختتام

کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے دائیں طرف منہ موڑ کر کہا جاتا ہے السلام علیکم و رحمۃ اللہ (سلامتی ہو آپ پر اور اللہ کی رحمت) اور پھر بائیں طرف منہ موڑ کر یہی کلمے دہرائے جاتے ہیں۔ (تصویر 16ے، بی) اور اگر نماز دو سے زیادہ رکعتوں پر مشتمل ہو تو پھر التحیات (جلسہ تشہد) کے بعد اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور پہلی رکعتوں کی طرح ہاتھ باندھ کر سورۃ فاتحہ پڑھ کر (کوئی اور قرآنی آیت پڑھے بغیر) رکوع میں چلے جاتے ہیں اور پھر سیدھے کھڑے ہو کر دو سجدوں کے بعد اگر نماز مغرب ہو تو تیسری رکعت میں "جلسہ" کر کے (بیٹھ کر) نماز حسب دستور ختم کر دیتے ہیں اور اگر چوتھی رکعت بھی پڑھنا مطلوب ہے تو پھر تیسری رکعت مکمل کر کے دوسرے سجدہ کے بعد چوتھی رکعت کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے بھی تیسری رکعت کے انداز میں مکمل کرتے ہیں اور آخر پر سلام پھیر کر نماز ختم کر دیتے ہیں۔

نماز کے حوالے سے کچھ مزید تفصیلات:

(561) شافعی اور حنبلی مسالک میں نماز فجر میں قنوت کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ دوسرے مسالک کا اس حوالے سے مؤقف یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت تو ضرور ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کچھ عرصہ جاری رکھنے کے بعد اسے موقوف کر دیا تھا۔

(562) حنفی مسلک میں بھی دعائے قنوت پڑھی جاتی ہے مگر یہ نماز عشاء میں وتروں کی تیسری رکعت کے دوران فاتحہ اور آیت قرآنی پڑھنے کے بعد رکوع پر جانے سے قبل پڑھی جاتی ہے۔ جس کے بعد باقی نماز معمول کے مطابق مکمل کی جاتی ہے۔ نماز با جماعت کی صورت میں جس مسلک کے امام کے پیچھے آپ نماز پڑھ رہے ہیں اس کی پیروی کرنی چاہیے۔

(563) بعض مسالک میں دو رکعت کے بعد پہلے التحیات میں درود نہیں پڑھا جاتا اور صرف آخری التحیات میں ہی پڑھا جاتا ہے جبکہ بعض کے ہاں دونوں جگہ پڑھنا ضروری ہے۔

مختلف مسالک کے مابین اختلاف رائے:

(563۔الف) مسلمانوں میں تین بنیادی مسالک ہیں: سنی، شیعہ، اباضی (جنہیں عرف عام میں خارجی کہتے ہیں) ان کی پھر ذیلی شاخیں ہیں ان مسالک میں طریق عبادت اور اصولوں کے اختلافات ہیں۔ ان اوراق میں تاریخ کے اندر جھانکنے اور اختلافات کی تفصیلات دینے کی گنجائش

نہیں ہے۔تاہم جب ایک ہی شہر میں مختلف مسالک کے مسلمانوں کو ایک ہی فعل مختلف انداز میں کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو فطری طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختلاف کہاں سے رونما ہوا۔ اصولوں اور قوانین میں اختلاف کو ایک طرف رکھتے ہوئے جو ہر مسالک کے فقہاء کے اپنے انداز میں تفہیم دین کا نتیجہ ہے، آیئے ہم طریق عبادت کے اختلاف کو دیکھیں کہ اس میں کوئی خود سے نئی چیز شامل نہیں کی گئی بلکہ یہ سب کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مبارکہ کے مطابق ہے۔

(1) ایسا کئی معاملات میں ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک وقت میں جس طریقہ سے عبادت کرتے تھے بعد میں خود ہی اس میں تبدیلی کر دی۔ بعض چیزیں ترک کر دیں بعض سے منع فرما دیا۔ (مثلاً شروع میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکوع میں جاتے تو ہاتھوں کو لٹکتا چھوڑ دیتے تھے تاہم بعد میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھوں کو گھٹنوں پر جمانا شروع کر دیا اور مسلمانوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم دیا) تاہم کئی معمولات ایسے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود تو ترک کر دیئے مگر صحابہؓ کو منع نہیں کیا اور اس طرح کچھ صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تقلید میں پرانا معمول ترک کر دیا جبکہ بعض نے جاری رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں گروپس سے تعرض نہیں فرمایا۔ اس طرح بعض معاملات میں صدیوں بعد بحث شروع ہو گئی کہ کون سا معمول ٹھیک ہے تو اس پر فقہاء میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔

(2) اس طرح ظاہر ہے کہ طریقہ عبادت میں اختلاف کا منبع خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معمولات میں تبدیلی تھا اس لیے ان میں سے کسی طریقے کی بھی تنقیص مناسب نہیں۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ ایسی کوئی تفصیلات بھی میسر نہیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ کب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کون سا معمول ترک کر کے دوسرا اپنایا کہ ہم یہ کہہ سکیں کہ نئے معمول کے باعث پہلے والا متروک ہو چکا۔ اس طرح اگر کوئی شافعی، حنفی کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کر دیتا ہے تو گویا اس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا ہے اور یہ بڑا گناہ ہے۔

(3) اسلامی ادب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسمائے مبارکہ میں حبیب اللہ یعنی اللہ کا محبوب کا استعمال بھی کثرت سے ہوا ہے اور قرآن مجید میں واضح طور پر فرمادیا گیا(21:33) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہے جس کی پیروی تم پر لازم ہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں فرمایا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ہر فعل اور معمول کی پیروی کریں ماسوائے اس کے جس کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باضابطہ ترک فرمادیا ہوتا ہم اس صورت میں کہ ایک ہی عمل کو مختلف انداز میں انجام دیا جارہا ہے تو اس کا سوائے اس کے کوئی مطلب نہیں کہ بعض اسے ایک طریقے سے ادا کرتے ہیں تو بعض دوسرے طریقے سے اور اس طرح گویا مختلف مکاتب فکر کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب کی ہر سنت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جاری رہنے کا سامان فرمادیا ہے۔ اس لیے مسلمانوں پر لازم ہے کہ ایک دوسرے کے لیے احترام اور برداشت کے جذبات پیدا کریں۔

نماز استخارہ:

(563-ب) جب کوئی شخص کسی خاص معاملے پر الجھن میں ہو اور فیصلہ کرنے میں مشکل کا سامنا ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے استخارہ کی تلقین کی ہے یعنی اللہ سے مشورہ، مگر یہ کوئی قرعہ اندازی یا جھاڑ پھونک کا طریقہ نہیں ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ نماز عشاء کے بعد نماز استخارہ کی نیت کرکے دو رکعت نفل اس طرح ادا کیے جاتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ کے بعد یہ آیت تلاوت کی جائے (جدول جی) اور سورۃ 109 جدول زیڈ i) اور دوسری رکعت میں فاتحہ کے بعد وحی پہلی رکعت والی آیت (جدول جی) اور پھر سورۃ 112 (جدول جے) جبکہ باقی نماز معمول کے انداز میں مکمل کی جائے۔ سلام پھیرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے انتہائی عاجزی اور انکساری سے گڑگڑا کر وہ دعا مانگی جائے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس موقع کے لیے ارشاد فرمائی (جدول Z-ii) جو بہتر ہے کہ یاد کرکے زبانی پڑھی جائے اور اگر زبانی یاد نہ ہو تو دیکھ کر پڑھ لی جائے اور ترجیحاً عربی میں ہی پڑھی جائے تاہم اگر ممکن ہو تو اپنی زبان میں اس کا ترجمہ بھی جائز ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کو ذہن میں بسا کر سو جائے۔ اگلی صبح اٹھتے ہی جو خیال غالب ذہن میں آئے گا وہ

استخارہ کا جواب ہوگا اور اگر کوئی (اشارہ خواب میں نہیں ہوتا یا) خیال ذہن میں اس حوالے سے راسخ نہیں ہوتا تو یہی عمل دوسری اور پھر تیسری رات دہرایا جائے۔

نماز کا فاسد ہو جانا:

(564) اگر کوئی نماز میں بول پڑے۔ ہوا خارج ہو جائے، قہقہہ مار کر ہنس دے یا کوئی چیز کھا پی لے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے۔ اس صورت میں نماز نئے سرے سے ادا کی جائے اور اگر نماز ہوا خارج ہونے سے فاسد ہوئی ہو تو نیا وضو بھی ضروری ہے تاہم نماز کی ادائیگی کے دوران کوئی رکن یا نماز کا کوئی حصہ ادا کرنا بھول جائیں تو نماز کی دوبارہ ادائیگی ضروری نہیں بلکہ نماز معمول کے مطابق مکمل کر کے التحیات کے بعد دو سجدے کرے اور باقی نماز مکمل کرے۔ بھول کی تلافی کے ان سجدوں (سجدہ سہو) میں معمول کی دعا سبحان ربی الاعلیٰ پڑھی جا سکتی ہے۔

(565) اگر کوئی نمازی تاخیر سے مسجد میں آئے اور باجماعت نماز شروع ہو چکی ہو اور وہ اس بات سے بے خبر ہو کہ کتنی رکعتیں پڑھی جا چکی ہیں تو اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ جماعت میں شامل ہو کر امام کی اقتداء میں باقی نماز ادا کرے اور اگر ایک یا زیادہ رکعتیں ادا ہونے سے رہ جائیں تو امام کے سلام پھیرنے کے بعد اٹھ کر مکمل کر لے۔ فرض کیا وہ نماز مغرب میں دوسری رکعت کے سجدے کے دوران نماز میں شامل ہوا تو گویا اس نے امام کے ہمراہ صرف ایک رکعت ادا کی اس لیے اسے بعد میں دو رکعتیں مزید ادا کرنا ہوں گی۔ اس طرح کہ وہ امام کے سلام پھیرنے کے بعد کھڑا ہو کر ایک رکعت ادا کرے اور پھر پہلے التحیات کے لیے بیٹھ جائے اور پھر کھڑا ہو کر دوسری رکعت پڑھے اور التحیات کے بعد دوسری رکعت مکمل کر کے سلام پھیر دے۔ اگر نماز میں اس وقت شامل ہوں جب امام حالت رکوع میں ہو اور رکوع کے کلمات مکمل ہو جائیں تو یہ پوری رکعت شمار ہو جائے گی تاہم اگر نمازی اس وقت شامل ہو جب امام رکوع سے قیام میں آ جائے تو مکمل رکعت کی ادائیگی ضروری ہوگی چاہے دونوں سجدے ادا بھی ہو جائیں۔

چند عمومی باتیں:

(566) اگر نماز کا وقت کسی ایسے مقام پر آ جائے جہاں قبلہ رخ کا تعین ممکن نہ ہو تو قیاس کر لے یعنی اندازے سے رخ متعین کر لے اور مکمل یقین کے ساتھ نماز ادا کر لیجائے۔ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے۔ نماز مکمل یکسوئی کے ساتھ ادا کی جانی چاہیئے۔ دوران قیام نظر اس مقام پر مرکوز ہونی چاہیے جہاں پیشانی کو زمین پر رکھا جاتا ہے یعنی جس مقام پر سجدہ کیا جاتا ہے رکوع کے دوران نظر پاؤں کے ناخنوں پر اور سجدہ کے دوران آنکھیں کھلی رکھی جائیں۔ دوران نماز ادھر ادھر یا آسمان کی طرف دیکھنا منع ہے۔ نماز کے دوران مضبوطی سے ایک جگہ کھڑے رہنا چاہیے۔ آگے پیچھے یا دائیں بائیں ہلنا جلنا نہیں چاہیے۔

(567) نماز کے بعد اللہ تعالیٰ سے اپنی جائز ضروریات اور خواہشات کی تکمیل کی دعا کی جانی چاہیے۔ اور وہی دعائیں سب سے بہتر ہیں جو خود قرآن میں مذکور ہیں۔

(568) چونکہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ عربی زبان میں ہوتا ہے اس لیے اسے زبانی یاد کرنا پڑتا ہے۔ نماز کا آغاز سورۃ فاتحہ سے ہوگا۔ (قرآن مجید کی پہلی سورۃ) سورۃ فاتحہ نماز کا لازمی حصہ ہے۔

نمازِ جنازہ:

(569) نماز جنازہ دوسری نمازوں سے قدرے مختلف ہوتی ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ وضو کر کے رخ قبلہ کی طرف اور ہاتھ کانوں تک بلند کر کے نماز کی نیت کی جائے اور پھر اللہ اکبر کہہ کر دوسری نماز کی طرح ہاتھ باندھ لیے جائیں۔ ثناء کے بعد سورۃ فاتحہ اور پھر قرآن مجید کی کوئی آیت تلاوت کی جاتی ہے۔ اس کے بعد پھر اللہ اکبر کہہ کر تمام مسلمانوں، زندہ ہوں یا فوت ہو چکے ہوں کی بخشش کے لیے اللہ کے حضور دعائیں کی جاتی ہیں مگر رکوع یا سجدہ نہیں کیا جاتا۔ (جدول ایس)، اس کے بعد تیسری بار اللہ اکبر کہہ کر خاص حاضر میت کی مغفرت کے لیے دعائیں کی جاتی ہیں (جدول ٹی) اور پھر آخر پر اللہ اکبر کہہ کر سلام پھیر دیا جاتا ہے۔

نماز- دوران بیماری اور سفر:

(570) اگر کوئی مسلمان اتنا علیل ہو جائے کہ بستر سے ہل جل نہ سکے تو جس طریقہ سے اسے سہولت ہو نماز پڑھ سکتا ہے۔ بیٹھ کر، بلکہ لیٹ کر بھی، اگر بیٹھ کر نماز پڑھنا ہو تو سجدہ اس طرح کیا جاتا ہے کہ اس میں سر کو زمین کے ساتھ لگانا ضروری نہیں ہوتا بلکہ ہلکا سا سر جھکا کر سجدہ کا اشارہ دے دیا جاتا ہے۔ جب کہ لیٹے ہوئے نماز کی ادائیگی اس طرح کی جاتی ہے کہ ذہن میں قیام، رکوع، سجود اور باقی حالتوں کا محض تصور کر کے اور اس دوران نماز کے کلمات کا متعلقہ حصہ پڑھ کر نماز مکمل کی جاتی ہے۔

(571) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوران سفر نماز کو قصر (چھوٹا کر کے) ادا کرنے کی اجازت دی ہے اور 4 رکعت کی جگہ صرف 2 رکعت پڑھ کر فرض ادا ہو جاتا ہے۔

(نماز میں قصر کی رعایت اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو دی ہے۔" (101:4) مترجم)

اور اگر (دوران سفر وغیرہ میں) اوقات کی مجبوری ہو تو نمازیں جمع بھی کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً دوسری اور تیسری (ظہر اور عصر) ظہر سے غروب آفتاب تک اور چوتھی اور پانچویں (مغرب اور عشاء) کی نمازیں اکٹھی کر کے رات کے دوران کسی بھی وقت ادا کی جا سکتی ہیں۔

(ملاحظہ ہو پیراگراف نمبر 170 کتاب ہذا)

نمازوں کے اوقات:

(572) نماز فجر علی الصبح ادا کی جاتی ہے اور اس کا وقت طلوع آفتاب تک ہے اس لیے جب بھی صبح نیند کھل جائے ادا کر لی جائے دوسری یعنی ظہر کی نماز بعد از دوپہر یعنی سورج جب نصف سفر مکمل کر لے۔ اس کا وقت تین گھنٹے رہتا ہے۔ تیسری یعنی عصر سہ پہر کے وقت ادا کی جائے گی۔ اور اس کا وقت غروب آفتاب تک ہے۔ چوتھی نماز مغرب کا وقت غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹے بعد تک کا ہے۔ آخری نماز عشا کا وقت اس وقت شروع ہو جاتا ہے جب شام کا جھٹپٹا غائب ہو جائے۔ نماز عشاء کی ادائیگی صبح کاذب تک کسی بھی وقت جائز ہے۔ تاہم بہتر ہے کہ نصف شب گزرنے سے قبل ہی ادا کر لی جائے۔

(573) یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہ اوقات صرف ان ممالک میں قابل عمل ہیں جو خط استوا کے اوپر یا منطقہ حارہ میں واقع ہیں اور جوں جوں ہم قطبین کی جانب بڑھنا شروع کرتے ہیں تو سردیوں اور گرمیوں میں دن اور رات کی طوالت اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ سورج کی گردش اوقات کے تعین میں مددگار نہیں رہتی۔ قطبین پر سوائے اس دن کے جب دن اور رات برابر ہوتے ہیں۔ (21 مارچ) کے چھ ماہ تک ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ سورج مکمل طور پر غروب ہو یعنی مکمل تاریکی کبھی نہیں ہوتی اور پھر آئندہ چھ ماہ تک سوائے اس دن کے جب دن اور رات برابر ہوتے ہیں (21 ستمبر) یہ افق پر مسلسل طلوع رہتا ہے۔ اس دوران سورج کی پوزیشن یہ ہوتی ہے۔

72 درجے شمال پر	9 مئی سے 4- اگست تک
70 درجے شمال پر	17 مئی سے 27 جولائی تک
68 درجے شمال پر	27 مئی سے 17 جولائی تک
66 درجے شمال پر	13 جون سے 29 جون تک

اس دوران سورج مسلسل افق کے اوپر رہتا ہے اور رات اور دن کا تصور ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح سورج نہ ہی ''دن'' اور نہ ہی ''رات'' میں غروب ہوتا ہے۔ اس طرح سردیوں کے موسم میں سورج افق سے نیچے رہتا ہے اور 24 گھنٹے کے دوران ایک لمحے کے لیے بھی طلوع نہیں ہوتا۔ 66 درجے شمال پر 30 جون کو سورج 12 بج کر 3 منٹ پر طلوع ہوتا ہے جب کہ 23 بجکر 46 منٹ پر (11 بج کر 46 منٹ) غروب ہو جاتا ہے۔ 2 جولائی کو یہ 0.3 بجے طلوع ہوتا ہے جبکہ 23 بج کر 32 منٹ پر اس کا غروب ہوتا ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ ان چند منٹوں میں یعنی جس دوران سورج غروب رہتا ہے مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں ادا کی جانی چاہیں۔ اور اب جبکہ لوگ بڑی تعداد میں ان خطوں میں آباد بھی ہو گئے ہیں تو پیچیدگیاں سامنے آئی ہیں اور نمازوں کے اوقات کا تعین اور رمضان المبارک کے روزوں کے لیے سورج کی گردش کا انحصار کرنا ممکن نہیں۔ روز جمعہ کا تعین بھی ناممکن ہے کہ اگر معیار سات غروب آفتاب مقرر کیے جائیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے فقہاء نے سورج کی حرکت پر انحصار کی بجائے گھڑی کو معیار بنانے کی رائے دی ہے مگر سوال یہ ہے کہ کن ممالک کا شمار اس صورتحال کا شکار خطوں میں کیا جائے اور کن کا معمول کے ممالک میں کیا جائے۔ اس معاملے کے لیے مختلف ممالک کے علماء کی مجالس نے درج ذیل طریق عمل کی منظوری دی ہے۔

(573-الف) قرآن مجید کا فرمان ہے:

''اللہ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔'' (286:2)

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

''(ہاں) مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔

(اور) بے شک مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہے۔'' (6'5:94)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ اور بیرونی علاقوں کو بھیجے جانے والے نمائندوں کو یہ تلقین کر کے قرآنی فرمان کی تائید بھی کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ:

''لوگوں کے لیے سہولتیں اور آسانیاں پیدا کرو اور مشکلات پیدا نہ کرو کہ لوگ اسلام سے دوری نہ اختیار کرلیں، دوسروں سے بھائیوں جیسا برتاؤ کرو۔''

اس عمومی ہدایت کے علاوہ غیر معمولی طویل دنوں کے بارے میں ایک استفسار کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان بھی موجود ہے۔ یہ حدیث ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ اور دوسروں سے مروی ہے۔

''جب دجال لوگوں کو گمراہ کرنے آئے گا تو زمین پر 40 روز رہے گا۔ جس میں ایک روز ایک سال، دوسرا ایک ماہ اور تیسرا ایک ہفتے کے برابر ہوگا۔ باقی دن معمول کے ایام کے برابر ہوں گے۔''

ایک صحابیؓ نے اٹھ کر سوال کیا کہ جو دن ایک سال کے برابر ہوگا اس میں بھی کیا نمازیں پانچ ہی پڑھنا کافی ہوگا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ''نہیں حساب کر کے پڑھنا (ہوگا)۔''

اس میں جو دن ایک سال کے برابر کہا گیا ہے وہ قطبین 90% درجے متوازی جیسے حالات سے ملتا جلتا ہے اور جو ایک ماہ کے برابر ہے وہ شمالی نصف کرے 68 درجے قدرے جنوبی کی طرف جیسے حالات اور ایک ہفتے کے برابر والا 66 درجے تھوڑا سا جنوب کی طرف کے حالات سے ملتا جلتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فرمان کی روشنی میں علماء کی مجالس نے فیصلہ دیا

ہے کہ ان خطوں میں سورج کی گردش کی بجائے گھڑی کو نمازوں کے اوقات کے لیے معیار بنایا جائے۔ اور اس میں سہولت پیدا کرنے اور قابل عمل بنانے کے لیے 45 درجے پر واقع وقت کو ان ممالک کے لیے جو اس مقام اور قطب کے درمیان واقع ہیں معیار بنانے کا حکم دیا ہے۔

(574) خط استوا پر طلوع اور غروب آفتاب کے اوقات تمام موسموں میں عملاً ایک ہی رہتے ہیں۔ تاہم قطبین پر اس حوالے سے انتہائی غیر متعین صورتحال ہے۔ جغرافیہ دانوں نے خط استواء اور قطبین کے درمیانی فاصلے کو 90 درجوں میں تقسیم کیا ہے اور اس طرح تقسیم کے خطوط 45 درجے شمال اور 45 درجے جنوب میں مقرر کیے گئے ہیں۔ وہ لوگ جو استوائی اور منقطہ حارہ میں واقع ممالک کے مکین ہیں یعنی خط استوا کے دونوں جانب 45 درجے کے دونوں متوازی خطوط کے درمیان انہیں چاہیے کہ وہ مختلف موسموں میں سورج کی گردش کو پیش نظر رکھیں جب کہ وہ لوگ جو اس خط کے اس پار واقع ہیں انہیں طلوع وغروب آفتاب کے مقامی اثرات سے قطع نظر 45 درجے متوازی پر وقوع پذیر ہونے والے وقت کی پابندی کرنی چاہیے۔ ان غیر معمولی ممالک کے شہری بعض موسموں میں جس وقت روزہ افطار کریں گے تو ابھی سورج چمک رہا ہوگا۔ جب کہ بعض دوسرے بدستور کھانے پینے سے گریزاں رہیں گے حالانکہ سورج کافی عرصہ قبل ''غروب'' ہو چکا ہوگا۔

(575) 45 درجے شمال اور 45 درجے جنوب پر ہونے والی اس تقسیم سے زمین نظری طور پر دو برابر حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے مگر درحقیقت تین چوتھائی سے زیادہ قابل رہائش زمین نارمل زون میں شامل ہے اور زمین کی آبادی کا غالب اکثریت کا حامل حصہ اسی نارمل زون میں رہتا ہے۔ اس زون میں پورا افریقہ، بھارت، تمام سمندر عملاً پورا چین اور دونوں امریکہ (شمالی، جنوبی) ماسوائے کینیڈا اور ارجنٹائن اور چلی کے سرحدی علاقے کے، شامل ہیں۔

یہ امر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس تقسیم سے مسلمان ممالک قطعی طور پر متاثر نہیں ہوتے۔ وہ ممالک جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کے ادوار میں مسلمان ہوئے تھے جن میں عرب، شام، ترکی، مصر، سپین، اٹلی، جنوبی فرانس، ایران، ترکستان، انڈیا، پاکستان، انڈونیشیا، ملائشیا تک کے ممالک شامل ہیں، وہی طریق کار جاری رکھیں گے جو وہاں کا معمول ہے اور جس کے وہ صدیوں سے عادی ہیں۔

یورپ میں باردو۔ بخارسٹ۔ سیوسٹوپول کے بالائی خطے، شمالی امریکہ میں ھیلی فیکس،

پورٹ لینڈ سے اوپر کا خطہ اور جنوبی نصف کرے میں ارجنٹائن، چلی کے جنوب میں چند چھوٹے چھوٹے علاقے اور نیوزی لینڈ کے جنوب میں چند جزائر ان رعایتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ انگلینڈ، فرانس، جرمنی، ہالینڈ، سکنڈے نیویا (ڈنمارک، سویڈن) فن لینڈ، کازان، کینیڈا وغیرہ میں آباد مسلمان اسلام کے اس قانون سے مستفید ہو سکتے ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث مبارکہ سے اخذ کیا گیا ہے جس کا اوپر تذکرہ آیا ہے۔ دنیا کے نقشے کو دیکھ کر یہ تعین آسانی سے ہو سکتا ہے کہ کون نارمل زون میں اور کون اس سے باہر آباد ہے۔

نماز-صرف عربی میں کیوں؟

(575-الف) (i) تمام دنیا کے مسلمانوں کا یہ معمول ہے کہ وہ نماز عربی میں پڑھتے ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ بھی جو کلمات ادا کیے جاتے ہیں وہ عربی میں ہی ہوتے ہیں اور یہ معمول ان مسلمانوں کا بھی ہے جو عربی کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔ یہ معمول رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مسعود سے چلا آرہا ہے کہ ملک کی اپنی زبان کوئی بھی ہو نماز پنجگانہ اور نوافل کی ادائیگی بزبان عربی ہی کی جاتی ہے۔

(ii) بظاہر یہ بات معقول اور منطقی نظر آتی ہے کہ اللہ کے حضور دعائیں اور التجائیں جو شخص بھی پیش کر رہا ہے اسے یہ مکمل ادراک ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور بلاشبہ مادری زبان ہی وہ زبان ہے جس میں کوئی شخص اپنا مافی الضمیر اچھی طرح ادا کر سکتا ہے اور اس طرح نماز ان تمام زبانوں میں ادا کی جائے جو مسلمان بولتے ہیں لیکن اگر اس معاملے کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو مضبوط دلائل کے ساتھ اس ''سہولت'' کو رد کیا جا سکتا ہے۔

(iii) سب سے پہلے مابعد الطبیعاتی یا نفسیاتی پہلو ۔قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''......اور پیغمبر کی بیویاں مومنوں کی مائیں ہیں۔......'' (6:33)

یہ بات سب کو معلوم ہیں کہ ازواج مطہرات کی زبان عربی تھی اس لیے اس حوالے سے تمام مسلمانوں کی ''مادری زبان'' عربی ہے اور مادری زبان میں دعا مانگنے پر کس کو اعتراض ہو سکتا ہے۔

(iv) ہو سکتا ہے یہ دلیل سب کو متاثر نہ کر سکے۔اس لیے ان لوگوں کے لیے ایک اور نکتہ:

یہ حقیقت تو تمام مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہے کہ قرآن مجید کلام الٰہی ہے جس کی محض تلاوت بھی باعث ثواب اور خیر و برکت ہے۔ مسلمان خود اللہ تعالیٰ کے کلام کو پڑھ کر اور اس کو

ذریعہ بنا کر اپنے مالک وخالق کی قربت حاصل کرتا ہے۔یعنی جس طرح ایک بلب کو روشن کرنے کے لیے بجلی کا کرنٹ تار کے ذریعے بلب تک پہنچایا جاتا ہے اور اپنے خالق تک پہنچنا گویا منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔جس کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں ہے اور جس کے لیے وہ تگ ودو کرتا ہے۔یہ اللہ کا کلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر عربی زبان میں نازل ہوا۔تاہم اس کا مختلف زبانوں میں ترجمہ انسانوں نے کیا مگر یہ ترجمہ اس روحانی سفر کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔روحانی سفر اصل عربی کو ذریعہ بنا کر ہی ممکن ہے۔

(v) ان لوگوں کے لیے جو روحانی کی بجائے دنیاوی حوالے سے دلائل چاہتے ہیں۔آیئے ہم نماز اور دعا کے مابین فرق کو واضح کر دیں۔جہاں تک دعا کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ سے راز و نیاز ،ذاتی اور اجتماعی ضروریات کے لیے اپنے خالق کے سامنے جھولی پھیلا کر تنہائی میں جس زبان میں چاہے اپنے دل کی آواز اپنے رب تک پہنچائیں اس بارے میں کسی کو کوئی اعتراض نہیں۔بندہ جس حال میں اور جس زبان میں اپنے خالق سے ہم کلام ہو یہ بندے اور رب کا معاملہ ہے۔

مگر جہاں تک نماز کا تعلق ہے یہ ایک اجتماعی اور ایسا معاملہ ہے جو سب کے سامنے ادا کی جاتی ہے جس میں نماز میں شریک دوسرے ساتھیوں کی ضروریات اور تقاضوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا پڑتا ہے۔یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ نماز کی بہترین صورت یہ ہے کہ اسے باجماعت ادا کیا جائے اور انفرادی یا تنہائی میں پڑھی جانے والی نماز صرف خاص حالات میں جائز ہے اس کی عام اجازت نہیں اور ترجیح ہمیشہ باجماعت نماز کو ہی دی جانی چاہیے۔آیئے ہم اس اجتماعی اور کھلے طور پر ادا کیے جانے والے فعل کا زیادہ باریک بینی سے جائزہ لیں۔

(vi) اگر اسلام ایک علاقائی،نسلی یا قومی مذہب ہوتا تو کسی کے لیے اس خطہ،نسل یا قوم کی زبان میں مذہبی معاملات کو نمٹانے کا کوئی مسئلہ نہ تھا بلکہ وہاں رائج زبان آسانی سے اس کا ذریعہ بن جاتی۔مگر ایک عالمگیر مذہب کے تقاضے قطعی مختلف ہیں جس کے پیروکار سینکڑوں علاقائی زبانیں بولتے ہیں جو دنیا کے مختلف علاقوں میں آباد مختلف گروہوں کے لیے بھی باہم ناقابل فہم ہیں۔آج ہماری زندگی وسیع المشربی اور کثیر القومیتی ہوتی جارہی ہے اور ہر شہر میں مختلف نسلوں،قوموں اور رنگوں کے حامل مسلمان موجود ہیں جن میں سے بعض مستقلاً وہاں آباد ہیں جب کہ بعض عارضی طور پر قیام پذیر ہو جاتے ہیں۔اور اجنبیوں کے لیے خیر سگالی اور آداب میزبانی کا مظاہرہ کیا ہی جاتا ہے۔

فرض کیجیے ایک انگریز مسلمان چین جاتا ہے جب کہ وہ چینی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا، فرض کیجیے وہ گلی میں یہ الفاظ سنتا ہے ''چن چو چی شان'' فطری بات ہے اس کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔ اگر اس کے کانوں میں اذان کے الفاظ اللہ اکبر کا چینی ترجمہ پڑے گا تو وہ کس طرح جان سکے گا کہ یہ اذان کی آواز ہے اور شاید وہ نماز پنجگانہ میں سے کوئی یا پھر جمعہ کی نماز بھی ادا نہ کر سکے۔ (امر واقعہ یہ ہے کہ چین کی مساجد انگلینڈ، فرانس یا مغرب میں دوسرے ممالک کی مساجد کی طرح نہیں ہیں اور عام طور پر ان میں مینار نہیں بنائے جاتے) اسی طرح اگر کوئی چینی مسلمان کسی دوسرے ملک کا سفر کرے اور اگر وہاں کے مسلمان اپنی مقامی زبان میں اذان دیں اور نماز ادا کریں تو اسے اپنے مذہبوں سے کوئی ہم آہنگی محسوس ہوگی نہ ہی کوئی چیز ان میں باہم مشترک ہوگی۔ اس لیے ایک عالمگیر مذہب کا یہ تقاضا ہے کہ اس کے پیروکاروں میں بعض بنیادی چیزیں مشترک ہوں۔ اس میں اذان اور نماز میں پڑھی جانے والی دعائیں اور کلمات ایسی چیزیں ہیں جنہیں بنیادی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک اور مسئلہ بھی ہے کہ بعض اوقات ایک ہی طرح کی آواز دینے والے الفاظ دو مختلف زبانوں میں مختلف اہمیت اور معانی کے حامل ہوتے ہیں اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک زبان کا بے ضرر لفظ کسی دوسری زبان میں مضحکہ خیز یا غیر شائستہ معانی دینے والا ہو۔ اور ایسا ان زبانوں میں قطعی ممکن ہے جن سے کوئی بالکل آشنا نہ ہو اور وہ سفر کے دوران کہیں کان میں پڑ جائیں مگر یہ صورتحال نماز کے آداب کے قطعی منافی ہے۔ اگر بچپن سے ہی ان معاملات سے آشنائی ہو جائے تو ایسی مشکلات پیدا نہیں ہوتیں چاہے وہ غیر عرب ہی ہو مگر وہ عربی میں نماز پڑھنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

(vii) غیر زبان بولنے والوں کے خلاف تعصب کے نفسیاتی پہلوؤں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ایسے مواقع آئے روز پیدا ہوں گے جب سیاسی (قومی) بلکہ ذاتی اور انفرادی تنازعے رونما ہوں گے۔ مثلاً انگریزی بولنے والا برطانوی کسی ایسی نماز میں شامل نہ ہوگا جس کا امام فرانسیسی روسی یا کسی اور زبان میں امامت کروا رہا ہوگا۔ عربی چونکہ قرآن اور حدیث یعنی فرامین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کے دل میں اس کے احترام، محبت اور تقدس کے جذبات ہیں اور وہ صرف عربوں کی زبان تصور کر کے اس کے بارے میں نہیں سوچتا بلکہ اس کی نظر میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امہات المؤمنین کی زبان ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ خدا نے اپنا آخری پیغام بندوں تک پہنچانے کے لیے اسی زبان کا انتخاب کیا۔

(viii) ہم مذہبوں کے مابین اتحاد کے تقاضوں پر بہت زیادہ زور ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ (کیونکہ ایسا ہونا عین فطری ہے) بھائی چارے کے فروغ کے لیے نئے روابط تخلیق کیے جانے چاہئیں نہ کہ جو پہلے سے موجود ہیں ان کو ہی تباہ کر لیا جائے۔

(ix) بین الاقوامی کانفرنسوں اور اجلاسوں کی مثال بھی دیکھنی چاہیے۔ مثلاً جب اقوام متحدہ کا اجلاس ہوتا ہے تو اس میں شریک ملازمین اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق جس زبان میں چاہیں بات نہیں کر سکتے بلکہ اظہار خیال کرنے والے کو ان زبانوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے گا جو ادارہ نے سرکاری طور پر منظور کی گئی ہیں یعنی انگریزی، فرانسیسی یا دوسری زبانیں۔ ان کے تراجم کا بھی انتظام ہے جو مخصوص زبانوں میں کیا جاتا ہے۔ کسی کو بھی اس نظام پر اعتراض نہیں اور اجتماعی مفاد کے لیے مخصوص مفاد قربان کر دیا جاتا ہے۔

(x) مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے جو کم اہم نہیں۔ یہ تو ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ترجمہ کبھی بھی اصل کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ اور اس حوالے سے ایک مثال یہ ہے کہ آج قرآن مجید کے انگریزی (اور دیگر زبانوں) میں ان گنت تراجم موجود ہیں مگر پھر بھی انہی زبانوں سے زیادہ بہتر تراجم کے لیے مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں اور آئے روز نئے نئے تراجم منصہ شہود پر آ رہے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کے نقائص سے پاک مواد تو اصل ہی ہو سکتا ہے نہ کہ اس کا ترجمہ۔

(xi) اس حوالے سے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آج عملاً اسلام کے سوا کوئی مذہب نہیں جس کی بنیاد بننے والا کلام الٰہی یعنی وحی اپنی اصل شکل میں محفوظ ہے۔ مسیحیوں، یہودیوں، پارسیوں اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں تک ان کی مذہب کی جو تعلیمات پہنچی ہیں وہ تراجم کی شکل میں ہیں یا پھر اصل کے محض چند حصے ہیں جبکہ اس لحاظ سے مسلمان بہت خوش نصیب ہیں کہ انکے پاس قرآن مجید اپنی اصل زبان اور شکل میں محفوظ ہے۔

(xii) قرآن کی ایک اور خصوصیت بھی ہے کہ اگرچہ قرآن نثر میں ہے مگر اس میں شاعری کی تمام خصوصیات اور خوبصورتی موجود ہے مثلاً غنائیت، قافیہ بندی اور پرتاثیر انداز بیان وغیرہ۔ اس طرح کہ متن میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی سے اس کے معانی میں اس طرح ردوبدل ہو جاتا ہے کہ جیسے ایک لفظ کے آگے پیچھے کرنے سے شعر کی بنت خراب ہو جاتی ہے۔ راقم الحروف کو کچھ عرصہ قبل ایک تجربہ ہوا کہ ایک فرانسیسی نومسلم نے جو پیشہ کے اعتبار سے موسیقار تھے، مجھے بڑے یقین سے کہا کہ قرآن کی سورۃ 110 میں سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ کوئی حصہ چھوٹ گیا ہے کیونکہ

یہ اس طرح پڑھا جاتا ہے "فی دین اللہ افواجاo فسبح ...... جو موسیقی کے حوالے سے ناممکن ہے۔

اس موقع پر قرآن کی تلاوت کے بارے میں جو تھوڑا بہت علم میرے پاس ہے وہ میرے کام آیا اور میں نے اسے یہ بتا کر مطمئن کر دیا کہ نہیں، اس کی صحیح تلاوت اس طرح ہے فی دین اللہ افواجاً فسبح ...... (اس میں ف اور و کو ملا کر افواجاً کی ن کے بعد ہلکی سی آواز "وٗ" کی دے کر فسبح کی ف تلاوت کی جاتی ہے) اس پر نومسلم بھائی کے دل سے جیسے بوجھ اتر گیا اور اس نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "آپ کی وضاحت سے اس میں موسیقی کے نقطہ نظر سے کچھ بھی قابل اعتراض نہیں رہا۔"

قرآن کی نثر کا موازنہ شاعری سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر ایسا کیا جائے تو کوئی کیسے ایک مکمل، جامع اور موزوں ترین لفظ کی جگہ کمتر درجے کا کوئی لفظ ڈالے گا۔

(xiii) یہ بات قابل ذکر ہے کہ پوری نماز صرف چند کلمات پر مشتمل ہے۔ سب سے پہلے اذان ہے، پھر تکبیر اور اس کے بعد نماز کے دوران پڑھے جانے والے کلمات ہیں اللہ اکبر، فاتحہ، سبحان ربی العظیم دو آیات سبحان ربی الاعلیٰ، تشہد کی دعا اور بس۔ یہ سب کچھ کاغذ کے ایک صفحے میں سمویا جا سکتا ہے۔ عام طور پر ان کلمات کے معانی ہر مسلمان کو ازبر ہوتے ہیں حتیٰ کہ ایک بچہ کو بھی یاد کرنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ اگر ان کلمات کی اہمیت کو پوری طرح سمجھ لیا جائے تو پھر مسلمان کی نماز کلمات کی تفہیم کے بغیر ایک مشینی انداز کی تلاوت اور اٹھک بیٹھک ہی نہیں رہ جاتی۔

(xiv) ذاتی طور پر راقم بھی یہ محسوس کرتا ہے کہ کوئی بھی مسلمان قرآن کے ترجمے کو وہ مقام، مرتبہ اور احترام نہیں دے گا جو اصل عربی زبان میں قرآن کو حاصل ہے کیونکہ ترجمہ تو بہرحال کسی انسان کا کیا ہوا ہو گا جب کہ اصل قرآن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ کے کلام کی شکل میں نازل ہوا اور لافانی ذات نے جس کی حفاظت کا ذمہ اٹھایا ہے۔

(xv) ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک نوجوان طالب علم اس بات پر اصرار کئے جا رہا تھا کہ اہم بات یہ ہے کہ جو کچھ کوئی کہتا ہے (دعا کرتا ہے) اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیا دعا مانگ رہا ہے جب اس پر تمام دلائل بے اثر ثابت ہوئے تو راقم نے کہا "اگر تم وعدہ کرو کہ روزانہ پانچ نمازیں اپنی مادری زبان میں ادا کیا کرو گے تو میں تم کو اس کی اجازت دیتا ہوں۔" اس پر اس نے بحث ادھوری چھوڑ دی اور پھر دوبارہ میرے پاس نہیں آیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ نماز کو محض ایک علاقائی

رسم بنانے پر مصر لوگ بھی اسے معمول بنانے پر تیار نہیں اور بیشتر کی باتیں بحث برائے بحث کا درجہ رکھتی ہیں۔ مسلمان کو کسی ایسے شخص سے جو سرے سے اسلام پر ایمان ہی نہیں رکھتا یا اس پر عمل پیرا نہیں مشورے لینے کی ضرورت نہیں۔

(xvi) جو لکھاری امام ابو حنیفہؒ (وفات 767ء) کے اس قول کا حوالہ دیتے ہیں کہ نماز میں قرآن کا اپنی زبان میں ترجمہ پڑھنے کی بھی اجازت ہے، ان کی یہ بات نصف سچائی ہے۔ ان مفتیوں کو پوری سچائی سامنے لانی چاہیے کہ اگرچہ امام ابو حنیفہؒ نے ابتدا میں یہ اجازت دی تھی تاہم بعد میں اپنی رائے سے رجوع کر لیا (جیسا کہ بالکل واضح انداز میں اس کا تذکرہ فقہ کی معروف کتابوں المرغانی کی ہدایہ اور الحسکفی کی درالمختار میں آیا ہے) اور اس اجماع امت سے اتفاق کیا ہے کہ ''معمول کے حالات میں نماز میں کلمات عربی میں ہی ادا کیے جانے چاہئیں، حالات کے مطابق مستثنیات تو بہرحال موجود ہیں مثلاً یہ کہ کسی نو مسلم کو قبول اسلام کے بعد نماز کی ادائیگی کے لیے ضروری کلمات یاد کرنے میں کچھ وقت لگے گا اور اس دوران وہ کلمات جس زبان کی اسے تفہیم ہے اس میں ادا کر سکتا ہے۔

اس حوالے سے ہمارے پاس حضرت سلمان فارسیؓ جیسے جلیل القدر صحابیؓ کی مثال موجود ہے جنہوں نے اپنے کچھ نو مسلم ہم وطنوں کے لیے سورۃ فاتحہ کا فارسی ترجمہ بھجوایا تھا۔ جس کے لیے انہوں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اجازت حاصل کی تھی (حوالہ تاج الشریعہ کی النہایہ حاشیہ الہدایہ) اور وہ نو مسلم اس اجازت سے اس وقت تک استفادہ کرتے رہے جب تک وہ عربی زبان سے مانوس نہیں ہو گئے۔ اس طرح نو مسلم ابتدائی طور پر چند گھنٹوں یا چند روز کے لیے نماز کی ادائیگی اپنی زبان میں کر سکتے ہیں۔

(xvii) اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ نماز کسی دوسری زبان میں ادا کرنے کے کچھ فوائد ہیں اور کچھ نقصانات ہیں مگر یہی صورتحال علاقائی زبان (مادری زبان) میں نماز ادا کرنے کی بھی ہے۔ اگر کوئی اور دلیل کارگر نہیں ہوتی تو نفع اور نقصان کا موازنہ کر لیا جائے اور ان میں سے جو کم تر برائی ہے وہ قبول کر لی جائے۔

صرف قمری کیلنڈر ہی کیوں؟

(576) اسلام مذہبی معاملات کے لیے صرف قمری کیلنڈر کو ترجیح دیتا ہے جس میں رمضان المبارک اور ذوالحج کے مہینے قابل ذکر ہیں کہ قمری کیلنڈر کے باعث روزے اور حج کے ایام جو اسلام کے اہم ارکان ہیں مختلف موسموں میں گردش کرتے ہیں یعنی کبھی سردی اور کبھی گرمی میں آتے ہیں۔ قبل از اسلام کے عرب میں ان ایام (حرمت والے مہینوں کو) کو آگے پیچھے کرنے کا رواج موجود تھا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے طویل اور گہری سوچ بچار کے بعد اور پھر بالآخر جب قرآن مجید نے حج الوداع کے موقع پر اس کی ممانعت کر دی (37:9) تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو ختم کر دیا۔ قمری مہینوں کے استعمال سے ان افراد کو ضرور صدمہ پہنچتا ہے جو بلا سوچے سمجھے دوسروں کی نقالی کو جزو ایمان بنائے ہوئے ہوں اور اس حوالے سے احساس کمتری کا شکار ہوں۔ قمری کیلنڈر کے کچھ فوائد کا تذکرہ یہاں کیا جاتا ہے۔

(الف) قمری کیلنڈر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ چونکہ رمضان المبارک کے روزے ہر سال مختلف ایام میں آتے ہیں اس طرح ہم ہر موسم میں کھانے اور پینے کی احتیاج میں کمی کے عادی ہو جاتے ہیں کہ نہ تو ہر وقت مشکل صورتحال کا ہی سامنا ہے اور نہ ہی ہر وقت عیش اور فراوانی کی صورتحال ہے

(ب) اسلام چونکہ پوری دنیا کے لیے آیا ہے اس لیے مختلف علاقوں کی آب و ہوا میں جو فرق ہے اس کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جانا تھا۔ اگر روزے شمسی کیلنڈر کے مطابق کسی ایک مقررہ مہینے میں فرض کیے جاتے یعنی ایک مخصوص سیزن میں تو یہ بات فطرت سے متصادم ہوتی اور عملی طور پر ممکن نہ ہوتا۔ مثلاً شمالی نصف کرہ یعنی خط استواء کے شمال میں واقع ممالک میں موسم گرما جبکہ جنوبی نصف کرہ یعنی خط استوا کے جنوب میں واقع ممالک میں موسم سرما ہوتا اور یہ بات بھی ہے کہ استوائی ممالک میں موسم سرما کو اچھا اور خوشگوار موسم تصور کیا جاتا ہے جبکہ قطبین کے قریب واقع خطوں میں یہ بہت بڑی زحمت کا دورانیہ ہے۔ اس طرح شمسی کیلنڈر میں مختلف ممالک کے مسلمانوں کو جس ''ناانصافی'' اور امتیاز کا سامنا ہوتا اس کا تدارک قمری کیلنڈر سے ہی ممکن تھا۔ یعنی ہر خطے کے مسلمانوں کو موسم کی سختیوں اور رحمتوں سے برابر کا حصہ دینے کے لیے قمری کیلنڈر کو بنیاد بنایا گیا۔

(ج) سالانہ بچتوں، مال تجارت اور زرعی پیداوار پر عائد زکوٰۃ اور عشر سے حاصل ہونے والی رقوم میں غیر محسوس طور پر اضافہ ہوتا ہے کیونکہ 33 شمسی سال 34 قمری سال کے برابر ہوتے ہیں۔ گویا 33 برس میں قمری کیلنڈر کے مطابق 34 سال کے محاصل جمع ہو جاتے ہیں اور تنخواہوں وغیرہ کی ادائیگی کے بعد بھی حکومت کے پاس دیگر ترقیاتی کاموں کے لیے وافر وسائل محفوظ ہوتے ہیں۔

خلاصہ:

(576۔الف) خدائے بزرگ و برتر کے حضور یہ التجا ہے کہ وہ ہماری اس حقیر سی کاوش کو قبول فرمائے اور یہ چند گزارشات ان لوگوں کے قلب منور کرنے کا ذریعہ بن جائیں جو اسلام کی مبادیات کو سمجھنے کے خواہاں ہیں۔ جن لوگوں کو تفصیلات کی ضرورت ہے ان کے لیے علماء و فقہاء کی برسوں کی عرق ریزی کا حاصل وہ ضخیم کتابیں ہیں اور مصر کی الازہر، تیونس کی زیتونہ اور فیض (مراکش) کی قیروان جیسی جامعات ہیں جبکہ پاکستان، ہندوستان، انڈونیشیا اور دوسرے اسلامی ممالک میں قائم ان گنت ادارے ہیں جو تعلیم و تدریس اور تحقیق کے میدانوں میں علم و فضل کے سرچشموں سے طالبان علم کی پیاس بجھا رہے ہیں۔

جدول میں درج کلمات اور ان کا ترجمہ:

(578) اے، بی، سی، ڈی، ای جدولوں کے تراجم کلمات کے ساتھ ہی دیئے گئے ہیں۔

جدول (F) ثناء:

(1) احناف کے نزدیک:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ وَتَبَارَكَ اسْمُكَ وَتَعَالٰى جَدُّكَ وَلَا إِلٰهَ غَيْرُكَ۔

"اے اللہ تعالیٰ تیری ذات پاک ہے خوبیوں والی اور تیرا نام برکت والا ہے اور تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔"

(2) شافعی کے نزدیک:

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَّمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ لَا شَرِيكَ لَهُ وَبِذَٰلِكَ أُمِرْتُ وَأَنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ○

''اور میں نے کرلیا اپنا چہرہ اس ذات کی طرف جس نے پیدا فرمائے آسمان اور زمین اور میں نہیں ہوں مشرکین میں سے، بے شک میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا رب ہے نہیں ہے کوئی شریک اس کا اور اس (نماز) کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا مسلمان ہوں۔''

جدول (G) سورۃ الفاتحہ:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝٧

''سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔ مہربان ہے، رحم والا ہے، قیامت کے دن کا مالک ہے، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری ہی مدد چاہتے ہیں، ہم کو سیدھا راستہ دکھا، ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام کیا، نہ ان لوگوں کا (راستہ) جو (تیرے) غضب میں مبتلا ہو گئے اور نہ گمراہوں کا۔ (آمین)''

جدول (H) سورۃ العصر:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

وَالۡعَصۡرِ ① اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِیۡ خُسۡرٍ ② اِلَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوۡا بِالۡحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوۡا بِالصَّبۡرِ ③

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

”زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔“ (3-1:103)

جدول (I) سورۃ الکوثر:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اِنَّاۤ اَعۡطَیۡنٰکَ الۡکَوۡثَرَ ① فَصَلِّ لِرَبِّکَ وَانۡحَرۡ ②

اِنَّ شَانِئَکَ ہُوَ الۡاَبۡتَرُ ③

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور انتہائی رحم والا ہے۔

”(اے نبیؐ) ہم نے تمہیں کوثر عطا کر دیا، پس تم اپنے رب ہی کے لیے نماز پڑھو اور قربانی کرو، تمہارا دشمن ہی جڑ کٹا ہے۔“ (3-1:108)

جدول (j) سورۃ الاخلاص:

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

قُلۡ ہُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ① اَللّٰہُ الصَّمَدُ ② لَمۡ یَلِدۡ ۬ۙ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ ③

وَلَمۡ یَکُنۡ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ ④

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم والا ہے۔

”کہو، وہ اللہ ہے، یکتا، اور سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں، نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد، اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔“ (4-1:112)

جدول (K) آیۃ الکرسی:

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

”اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں، زندہ ہے سب کا تھامنے والا، اس کو اونگھ نہیں پکڑتی اور نہ نیند، اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، اس کے پاس کون سفارش کرے اسکی اجازت کے بغیر، وہ جانتا ہے جو ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ اس کے علم میں سے کسی چیز کو نہیں گھیرتے مگر جو کچھ چاہے، اس کی کرسی نے آسمانوں اور زمین کو سما لیا ہے، ان دونوں کی نگہبانی اس کو تھکاتی نہیں اور وہی بلند مرتبہ والا بڑی شان والا ہے۔“

جدول (L):

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ.

”میں اپنے بڑے پروردگار کی تسبیح بیان کرتا ہوں۔“

جدول(M):

سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ. رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ.

''اللہ نے اس کی (حمد) سن لی جس نے اس کی تعریف کی، اے ہمارے پالنے والے سب تعریف تمہارے لیے۔''

جدول(N):

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی.

''میں اپنے بلند پروردگار کی تسبیح بیان کرتا ہوں۔''

جدول(O):

رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ.

''اے اللہ مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم کر۔''

جدول(P) تشہد:

اَلتَّحِیَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّیِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ أَیُّهَا النَّبِیُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُهُ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَعَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰہُ وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ.

''سب عبادتیں زبان کی، بدن کی اور مال کی اللہ ہی کے لیے ہیں۔ سلام ہو آپ پر اے نبی! اور اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں۔ سلام ہو ہم پر اور اللہ کے نیک بندوں پر۔ میں دل سے اقرار کرتا ہوں (گواہی دیتا ہوں) کہ اللہ کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں) اور (یہ بھی اقرار کرتا ہوں) کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

جدول (Q):

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی إِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ إِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی إِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی آلِ إِبْرَاھِیْمَ إِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ أَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْمَأْثَمِ وَالْمَغْرَمِ ۔ اَللّٰھُمَّ إِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا وَلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ إِلَّا أَنْتَ فَاغْفِرْ لِیْ مَغْفِرَۃً مِّنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِیْ إِنَّکَ أَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ۔

''اے اللہ رحمت بھیج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر (ڈاکٹر محترم حمید اللہ کے انگریزی ترجمہ کے الفاظ اس طرح ہیں۔'' اور رحمت بھیج آپؐ کے ماننے والوں پر۔''

جس طرح تو نے رحمت بھیجی ابراہیم علیہ السلام پر اور آل ابراہیم علیہ السلام پر (ڈاکٹر محترم حمید اللہ کے الفاظ یہ ہیں ''اور ابراہیم علیہ السلام کے ماننے والوں پر۔''

بے شک تو تعریف کیا ہوا، بزرگی والا ہے، اے اللہ برکت بھیج محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر (ڈاکٹر محترم حمید اللہ نے ''آل'' کا ترجمہ ''ماننے والے'' کیا ہے) جس طرح تو نے برکت دی ابراہیم علیہ السلام اور آل ابراہیم علیہ السلام پر بے شک تو تعریف کیا گیا، بزرگی والا ہے۔''

''اے اللہ میں گناہ اور قرض سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اے اللہ میں نے اپنی جان پر بہت حق تلفی کی اور گناہوں کو تیرے سوا کوئی نہیں بخشے گا پس تو مجھے اپنے پاس سے پوری بخشش بخش دے اور مجھ پر رحم کر، بے شک تو ہی معاف کرنے والا بخشش کرنے والا ہے۔''

جدول (R):

سُبْحَانَ مَنْ لَا يَنَامُ وَلَا يَسْهُو.

''پاک ہے وہ ذات جسے نیند نہیں آتی ہے نہ ہی اس سے کوئی چیز بھول پاتی ہے۔''

جدول (S):

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ. اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِحَيِّنَا وَمَيِّتِنَا وَشَاهِدِنَا وَغَائِبِنَا بِرَحْمَتِكَ الْوَاسِعَةِ.

''اے اللہ رحمت بھیج محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور برکت اور درود بھیج۔ اے اللہ ہمارے زندوں، مردوں، حاضر، غائب کی اپنی بے پایاں رحمت سے مغفرت فرما دے۔''

جدول (T):

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِهٰذَا الْمَيِّتِ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ.

''اے اللہ! یہ شخص جو آج فوت ہوا ہے (یا ہوئی ہے) اس کو بخش دے، بے شک تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

جدول (U):

اللّٰهُمَّ اهْدِنَا فِيمَنْ هَدَيْتَ وَعَافِنَا فِيمَنْ عَافَيْتَ وَتَوَلَّنَا فِيمَنْ تَوَلَّيْتَ وَبَارِكْ لَنَا فِيمَا أَعْطَيْتَ وَقِنَا شَرَّ مَا قَضَيْتَ فَإِنَّكَ تَقْضِي وَلَا يُقْضَى عَلَيْكَ وَإِنَّهُ لَا يَذِلُّ مَنْ وَالَيْتَ تَبَارَكْتَ رَبَّنَا وَتَعَالَيْتَ لَكَ الْحَمْدُ عَلَى مَا قَضَيْتَ، نَسْتَغْفِرُكَ وَنَتُوبُ إِلَيْكَ، وَصَلَّى اللّٰهُ عَلَى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ.

"اے اللہ ہمیں ہدایت دے ان لوگوں میں جن کو تو نے ہدایت دی۔ ہمیں تندرستی دے ان لوگوں میں جن کو تندرستی دی اور میرا کام بنا ان لوگوں میں جن کی تو نے چارہ گری کی، اور برکت عطا کر ہمیں جو اچھی چیز تم نے ہمیں دی اور اس چیز کی برائی سے ہمیں بچا جو تو نے مقدر کی۔ بے شک تو طے کرتا ہے اور تیرے خلاف طے نہیں کیا جاتا اور بے شک نہیں وہ خوار ہوتا جس کو تو درست رکھے اور نہیں عزت پاتا وہ جس کا تو دشمن ہے، تو بہت برکت والا ہے، اے ہمارے رب اور تو بہت بلند ہے ہم تجھ سے بخشش مانگتے ہیں اور تیری طرف توبہ کرتے ہیں اور درود بھیج اللہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر۔"

جدول (V):

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُكَ وَنَسْتَغْفِرُكَ وَنُؤْمِنُ بِكَ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْكَ وَنُثْنِیْ عَلَيْكَ الْخَيْرَ وَنَشْكُرُكَ وَلَا نَكْفُرُكَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ يَّفْجُرُكَ اَللّٰھُمَّ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَلَكَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَيْكَ نَسْعٰی وَنَحْفِدُ وَنَرْجُوْا رَحْمَتَكَ وَنَخْشٰی عَذَابَكَ اِنَّ عَذَابَكَ بِالْكُفَّارِ مُلْحِق.

”اے اللہ تحقیق ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں، تجھ سے بخشش مانگتے ہیں اور تجھ پر ایمان لاتے ہیں اور تجھ پر بھروسہ کرتے ہیں اور تیری خوبیاں بیان کرتے ہیں اور تیرا شکر کرتے ہیں ہم اور تیرا ناشکری نہیں کرتے اور علیحدہ رہتے ہیں اور چھوڑتے ہیں ہم اس کو جو تیری نافرمانی کرے۔ اے ہمارے رب تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تیرے لیے ہم نماز پڑھتے اور تیرے سامنے سر کو جھکاتے ہیں اور تیرے لیے ہی ہم بھاگ دوڑ کرتے اور تقدم کرتے ہیں، ہم تیری رحمت کے امیدوار ہیں اور تیری سزا سے ڈرتے ہیں کیونکہ تیری سزا سے ہم کافروں کے ساتھی بن جائیں گے۔“

جدول (W):

حجر اسود کے سامنے کھڑے ہو کر طواف کی نیت:

نَوَيْتُ الطَّوَافَ بِسْمِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ اَكْبَر. اَللّٰھُمَّ اِيْمَانًا بِكَ وَتَصْدِيْقًا بِكِتَابِكَ. وَوَفَاءً بِعَھْدِكَ وَاِتِّبَاعًا لِسُنَّةِ نَبِيِّكَ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّم.

”نیت کرتا ہوں طواف بیت اللہ کی، اللہ کے نام سے جو سب سے بلند اور عظمت والا ہے۔ اے میرے پروردگار! میرا یہ طواف کرنا تمہارے اوپر

ایمان کی علامت ہے، میں تمہاری کتاب کی صداقت کی گواہی دیتا ہوں، اپنے اور تمہارے درمیان عہد کی پابندی کرتے ہوئے اور تمہارے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت کی پیروی میں جو ہمارے آقا ہیں، اے پروردگار! تو آپؐ پر رحمتیں نازل فرما اور آپ کو اپنی حفاظت میں رکھ۔"

جدول (X):

طواف کی دعائیں

(الف) کعبہ کے دروازے کے سامنے:

اَللّٰھُمَّ اِنَّ الْبَیْتَ بَیْتُكَ وَالْحَرَمُ حَرَمُكَ وَالْاَمْنُ اَمْنُكَ وَھٰذَا مَقَامُ الْعَائِذِ بِكَ مِنَ النَّار.

"یا اللہ بے شک یہ گھر تیرا گھر ہے اور یہ حرم تیرا حرم ہے اور (یہاں کا) امن و امان تیرا ہی دیا ہوا ہے۔ اور ہر بندہ تیرا ہی بندہ ہے اور میں بھی تیرا ہی بندہ ہوں اور یہ دوزخ کی آگ سے تیری پناہ پکڑنے والوں کی جگہ ہے۔"

(ب) باقی کے طواف میں یہ دعا پڑھیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الشَّكِّ وَالشِّرْكِ وَالشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الْاَخْلَاقِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ.

"اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں (تیرے احکام میں) شک سے اور (تیری ذات وصفات میں) شرک سے اور اختلاف ونفاق سے اور برے اخلاق سے اور برے مال اور برے انجام سے، مال میں اور اہل وعیال میں۔"

(ج) دوسرے طواف کی دعا:

اَللّٰهُمَّ اَظِلَّنِیْ فِیْ ظِلِّكَ يَوْمَ لَا ظِلَّ اِلَّا ظِلُّ عَرْشِكَ وَاسْقِنِیْ بِكَاسِ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَرْبَةً هَنِيْئَةً لَا اَظْمَأُ بَعْدَهَا اَبَدًا، يَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَام.

''اے اللہ جس روز سوائے تیرے عرش کے سایہ کے کہیں سایہ نہ ہوگا، اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوض (کوثر) سے ایسا خوش ذائقہ گھونٹ پلانا کہ اس کے بعد ہمیں کبھی پیاس نہ لگے۔ اے بزرگ و برتر پروردگار۔

(د) تیسرے طواف کی دعا (بمطابق حج اورعمرہ)

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُوْرًا وَذَنْبًا مَغْفُوْرًا، وَسَعْيًا مَشْكُوْرًا، وَتِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ يَا عَزِيْزُ يَا غَفُوْر.

''اے اللہ اس حج (یا عمرہ) کو مجھ سے اس طرح ادا کروادے کہ تمہاری بارگاہ میں مقبول ہوجائے اور جو گناہ ہیں وہ بخشے تصور فرما، اور جو کوششیں کروں وہ کامیابی سے ہمکنار ہوں، جو تجارت کروں اس میں نقصان نہ ہو، اے عظمت اور طاقت والے اور بخش دینے والے رب۔''

(ہ) چوتھے طواف کی دعا:

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ.

''اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔''

جدول (Y) صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی دعا:

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ. اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ. اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ حَجًّا مَبْرُوْرًا وَذَنْبًا مَغْفُوْرًا. وَسَعْيًا مَشْكُوْرًا. وَتِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ يَا عَزِيْزُ يَا غَفُوْرُ. اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ عَلٰى مَا هَدَانَا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى اَوْلَانَا. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ صَدَقَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَاَعَزَّ جُنْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ. لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَا نَعْبُدُ اِلَّا اِيَّاهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ.

’’اے میرے پروردگار بخش دے اور رحم فرما اور درگذر کر اس سے جسے تو جانتا ہے۔ بے شک تو جانتا ہے وہ جو ہم نہیں جانتے، بے شک تو زبردست بزرگی والا ہے۔اے اللہ اس کو مقبول حج (یا عمرہ) گردان اور میرے گناہوں کو بخشا ہوا اور میری کوشش کو مشکور اور اس کو ایسی تجارت بنا جو نقصان کے خطرے سے دوچار نہ ہو، اے زبردست طاقت والے اور بخشنے والے رب۔ اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے، اللہ تعالیٰ سب سے بڑا ہے۔ سب تعریف اللہ کے لیے ہے کہ اس نے ہمیں راستہ بتایا اور سب تعریف اللہ کے لیے ہے کہ اس نے ہمیں نعمت بخشی۔ اللہ کے سوا کوئی اور عبادت کے لائق نہیں وہ ایک ہے، اس کے لیے سب ملک (بادشاہی)

ہے اور سب تعریف اسی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، جو ایک ہے اور اس کا وعدہ سچا ہے، مدد کی اس نے اپنے بندے کی اور اس کے لشکر کو غالب کیا اور اس اکیلے نے تمام گروہوں کو شکست دی، نہیں کوئی معبود سوائے اللہ کے اور نہیں ہم عبادت کرتے مگر خاص اسی کی، خالص کرتے ہوئے اس کے لیے دین اگرچہ کافر برا منائیں۔"

جدول (Z) تلبیہ:

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ.

"میں حاضر ہوں، یا اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بے شک تمام تعریفیں اور نعمتیں تیرے لیے ہیں اور ملک بھی، تیرا کوئی شریک نہیں۔"

جدول Z (i)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ① لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ② وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ③ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ④ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ⑤ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ⑥

شروع اللہ کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔

"اے پیغمبر ان منکران اسلام سے) کہہ دو کہ اے کافرو!

"جن (بتوں) کو تم پوجتے ہو ان کو میں نہیں پوجتا۔"

"اور جس (اللہ) کی میں عبادت کرتا ہوں اس کی تم عبادت نہیں کرتے۔"

''اور (میں پھر کہتا ہوں کہ) جن کی تم پرستش کرتے ہو ان کی میں پرستش نہیں کرنے والا ہوں۔

''اور نہ تم اس کی بندگی کرنے والے (معلوم ہوتے) ہو جس کی میں بندگی کرتا ہوں۔

''تم اپنے دین پر، میں اپنے دین پر۔''

جدول Z (ii) دعائے استخارہ:

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ الْعَظِيمِ فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلَا أَقْدِرُ وَتَعْلَمُ وَلَا أَعْلَمُ وَأَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ اَللّٰهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْأَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي أَوْ قَالَ عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ فَاقْدُرْهُ لِي وَيَسِّرْهُ لِي ثُمَّ بَارِكْ لِي فِيهِ يَا كَرِيم. وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الْأَمْرَ شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَدُنْيَایَ وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ يَا كَرِيْم. اَللّٰهُمَّ اِنَّ عِلْمَ الْغَيْبِ عِنْدَكَ وَهُوَ مَحْجُوْبٌ عَنِّیْ وَلَا اَعْلَمُ مَا اَخْتَارُهٗ لِنَفْسِیْ لٰكِنْ اَنْتَ الْمُخْتَارُ لِی فَاِنِّیْ فَوَّضْتُ اِلَيْكَ مَقَالِيْدَ اَمْرِیْ وَرَجَوْتُكَ لِفَقْرِیْ وَفَاقَتِیْ فَاَرْشِدْنِیْ اِلٰی اَحَبِّ الْاُمُوْرِ اِلَيْكَ وَاَرْجَاهَا عِنْدَكَ وَاَحْمَدَهَا عِنْدَكَ فَاِنَّكَ تَفْعَلُ مَاتَشَاءُ وَتَحْكُمُ مَا تُرِيْدُ.

''اے اللہ میں تیرے علم سے بھلائی مانگتا ہوں، اور تیری قدرت سے طاقت چاہتا ہوں اور تیرا بڑا فضل تجھ سے مانگتا ہوں، بے شک تو قدرت رکھتا ہے اور میں قدرت نہیں رکھتا اور تو جانتا ہے میں نہیں جانتا اور تو چھپی چیزوں کو جاننے والا ہے، اے اللہ اگر تو جانتا کہ یہ کام میرے دین اور میری دنیا کی گذران اور میرے کام کے انجام میں، میرے اب کے کام میں اور آگے کو بہتر ہے تو اسے میرے لیے مقدر کر اور آسان کر اور پھر میرے لیے اس میں برکت دے اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ کام میرے دین میں میری دنیا میں میرے کام کے انجام میں، میرے اب کے کام میں اور آگے کو برا ہے تو اسے مجھ سے پھیر دے اور مجھے اس سے پھیر دے، اے مہربان، اے پروردگار! بے شک غیب کا علم تمہارے پاس ہے اور وہ مجھ سے چھپا ہوا ہے اور میں نہیں جانتا کہ میں اپنے نفس کے لیے کون سا راستہ اختیار کروں مگر تو میرے معاملات پر اختیار رکھتا ہے، پس میں نے اپنا معاملہ تیرے سپرد کر دیا، اور تم ہی میری عسرت اور ضرورت کے وقت واحد امید ہو، پس میری اس امر کی طرف رہنمائی فرما جو تم کو پسند ہے، اس لیے کہ تو وہی کچھ کرتا ہے جو چاہتا ہے اور اس کا حکم دیتا ہے جو ارادہ کرتا ہے۔''

نمازوں کا نظام الاوقات قطبی خطوں میں:

(581) جیسا کہ ''مسلمان کی روزمرہ کی زندگی'' کے عنوان کے تحت بتایا گیا ہے کہ ہر مسلمان پر دن رات میں پانچ نمازوں کی ادائیگی فرض ہے۔

(1) نماز فجر: صبح صادق یعنی سورج نکلنے سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے سے لیکر طلوع آفتاب تک کسی بھی وقت ادا کی جا سکتی ہے۔

(2) نماز ظہر: سورج جب (عرض بلد کے مطابق) ہمارے اوپر یا سامنے سے نصف النہار کا سفر طے کر لیتا ہے تو ظہر کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد تین گھنٹے تک نماز ظہر ادا کی جا سکتی ہے۔

(3) نمازعصر: نمازعصر کا وقت ظہر کے اختتام سے لے کر غروب آفتاب تک رہتا ہے۔

(4) مغرب: غروب آفتاب سے لے کر جھٹ پٹے کا وقت ختم ہونے تک یعنی غروب آفتاب سے ڈیڑھ گھنٹہ بعد تک مغرب کی نماز ادا کی جاسکتی ہے۔ (علماء کا عمومی اتفاق یہ ہے کہ نماز مغرب کا احسن وقت زیادہ سے زیادہ غروب سے آدھ گھنٹہ بعد تک ہے۔ مترجم)

(5) عشاء: یہ نماز جھٹ پٹے کا وقت ختم ہونے سے لیکر صبح تک یعنی فجر کی نماز کا وقت شروع ہونے سے قبل تک ادا کی جاسکتی ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ خط استوا سے کافی دور واقع ممالک میں اس نظام الاوقات کے مطابق نمازوں کی ادائیگی عملاً بہت مشکل ہے۔ اس لیے ان ممالک میں سورج کی گردش کی بجائے گھڑی کی سوئیوں کی گردش کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اور جیسا کہ پہلے وضاحت کردی گئی ہے کہ 45 درجے عرض البلد پر جو نظام الاوقات قرار پاتا ہے وہ عرض البلد (خط استواء سے فاصلہ) اسے اس مقام اور (شمالی یا جنوبی) قطب کے درمیان واقع تمام ممالک کے لیے معیار ہے۔ اس لحاظ سے یورپ میں باررد بخارسٹ اور شمالی امریکہ میں پورٹ لینڈ ھیلی فیکس معمول کے اوقات کے دائرے میں آتے ہیں۔ جبکہ ان مقامات سے شمال کی جانب واقع ممالک میں انہی مقامات کے نظام الاوقات پر عمل ہوگا۔ یہی اصول جنوبی امریکہ میں ارجنٹائن اور چلی کے دور جنوب تک واقع ممالک پر لاگو ہوگا یعنی ان ممالک میں نمازوں کے لیے ارجنٹائن اور چلی کے اوقات پر عمل ہوگا۔

(582) ذیل میں عرض بلد شمالی اور عرض بلد جنوبی میں واقع ممالک کے لیے مقامی اوقات کا ایک نقشہ دیا جارہا ہے۔ اس ضمن میں کچھ وضاحت سودمند ہوگی۔

(الف) ہم نے صرف طلوع اور غروب آفتاب کے اوقات دیئے ہیں۔ اس میں نماز ظہر کی ادائیگی کے لیے 12 بجے سے ذرا پہلے سے لیکر 12:30 تک ہوگا۔ (موسم کے مطابق یعنی سرما میں اس سے ذرا پہلے اور گرما میں ذرا بعد) دوسری دو نمازوں یعنی عصر اور عشاء قبل ازیں دیئے گئے فارمولے کے مطابق ادا کی جائیں گی۔

(ب) ہر شہر کے معیاری اور مقامی وقت میں فرق ہوتا ہے۔ درحقیقت خط استوا پر ہر 15 میل کے فاصلے کے بعد ایک منٹ کا فرق پڑ جاتا ہے۔ جوں جوں ہم قطبین کے قریب ہوتے جاتے ہیں تو فاصلے کے حساب سے اوقات میں فرق کم ہوتا جاتا ہے۔ اور امریکہ، کینیڈا اور روس جیسے بڑے ممالک میں ان کی مشرقی سرحد پر طلوع آفتاب ان کی مغربی سرحد سے آٹھ سے دس گھنٹے قبل

ہوتا ہے۔ ہمارے نقشے کی بنیاد مقامی (معیاری) وقت پر ہے اور صاحب فہم کے لیے اس مقام کا "مقامی" وقت متعین کرنا مشکل نہیں مثلاً فرانس میں گھڑیاں وہاں کے حقیقی معیاری وقت سے ایک گھنٹہ ایڈوانس رکھی جاتی ہیں یعنی اگر گھڑی 12 بجا رہی ہے تو دراصل وہاں 11 بجے ہوں گے۔ ان پیمانوں کو نہ صرف روزانہ نمازوں بلکہ رمضان میں سحر و افطار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

(ج) زمین کے بیضوی ہونے کے سبب ایک فرضی لائن کھینچنے کی ضرورت تھی تا کہ یہ تعین کیا جاسکے کہ دن کہاں سے شروع ہوگا۔ زیر استعمال ڈیٹ لائن ایشیا اور امریکہ کے درمیان سے گزرتی ہے تاہم سیاسی مفادات کے تحت بعض مقامات پر اس اصول سے انحراف بھی کیا گیا ہے۔ اس بات کی ان مسلمان مسافروں کے لیے اہمیت ہے جو ذریعہ سفر چاہے بحری ہو یا ہوائی، جاپان سے آسٹریلیا، انڈونیشیا اور امریکہ تک اور اسی روٹ پر واپسی کا سفر کرتے ہیں۔ امریکہ کی طرف جاتے ہوئے جونہی وہ فرضی لائن عبور کرتے ہیں تو وقت میں 24 گھنٹے کا فرق پڑ جاتا ہے۔ ہفتہ، جمعہ بن جاتا ہے اور گویا اسے "ہفتہ" کے دو دن گزارنا پڑتے ہیں اور اس کے بالکل برعکس صورتحال واپسی کے سفر میں پیش آتی ہے کہ امریکہ سے ایشیا آتے ہوئے جونہی وہ مقام آتا ہے تو ایک دن کا اضافہ کر دیا جاتا ہے اور جمعہ ایک لمحے میں ہفتہ کے دن میں تبدیل ہو جاتا ہے اور اگر سفر کا اختتام دوپہر سے پہلے ہو جائے تو نماز جمعہ کی ادائیگی منزل مقصود کے اوقات (دن) کے مطابق ہوگی نہ کہ اس کے مطابق جس روز سفر کا آغاز کیا تھا۔

(د) جوں جوں ہوائی سفر تیز رفتار ہوتا جائے گا۔ نئے نئے حل طلب مسائل پیدا ہوتے رہیں گے اور اب بعض اوقات ایسی صورتحال بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ اگر طلوع آفتاب کے فوری بعد مغرب کی طرف سفر شروع کر دیں تو کچھ دیر کے بعد ایک ایسے ملک میں جا اتریں جہاں ابھی تک سورج طلوع ہی نہ ہوا ہو۔ یا مشرق کی طرف سفر کریں تو کچھ دیر کے بعد غروب آفتاب کا منظر سامنے آ جائے۔ اور اگر غروب آفتاب کے بعد سفر شروع کیا جائے تو مغرب کی جانب سفر کے کچھ دیر بعد طلوع آفتاب کا نظارہ دیکھنے کو مل جائے (کون جانتا ہے کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس پیش گوئی کا ہی مظہر نہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے "پرانی دنیا" کے خاتمے کی علامت کے طور پر کی تھی؟) یہ تو معمول کی بات ہے کہ جس ملک سے روانگی شروع ہوئی اس وقت وہاں 6 بجے تھے مگر 3 گھنٹے کے سفر کے بعد جس ملک میں پہنچے وہاں 9 کی بجائے 12 بج رہے ہوں۔

(ڈ) تیز رفتار سفر کی بدولت جو مسائل دینی حوالے سے پیدا ہو رہے ہیں ان میں ایک افطار کے وقت کا بھی ہے۔ مثال کے طور پر مسافر نے صبح 4 بجے سحری کی اور صبح 6 بجے ٹوکیو سے براستہ تاشقند تیونس کے سفر پر روانہ ہو گیا۔ 8 گھنٹے کی پرواز کے بعد 900 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے جب مسافر اپنی منزل مقصود پر پہنچے گا تو مقامی وقت دوپہر کے 2 بجے کی بجائے صبح کے 6 بجے ہوں گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ممالک کے معیاری وقت میں 8 گھنٹے کا فرق ہے اور جہاز نے مغرب کی جانب اسی رفتار سے سفر کیا ہے جو سورج کی ہے اور یہی سورج کا راستہ بھی ہے۔ اس صورت میں اگر مسافر شام تک تیونس سے ٹوکیو کا سفر اختیار کرے تو وقت معمول سے دوگنا رفتار سے سفر کرے گا اور 6 بجے صبح سفر کا آغاز کر کے 6 گھنٹے بعد جب اس کی گھڑی 12 بجا رہی ہو گی تو تاشقند میں سورج غروب ہو رہا ہو گا اور مزید 2 گھنٹے بعد جب مسافر ٹوکیو پہنچے گا تو رات کے 10 بجے ہوں گے جب کہ تیونس میں اس وقت دوپہر کے 2 بجے ہوں گے۔ ایسی ہی صورت اس وقت درپیش ہو گی جب ہم شمال سے جنوب اور جنوب میں شمال کا سفر اختیار کریں گے بلکہ اس صورت میں تو موسم کی تبدیلی کا بھی سامنا ہو گا۔ ناروے اور کینیڈا میں ہڈیوں کا گودا جما دینے والی سردی ہو گی مگر اس وقت چلی اور کیپ ٹاؤن میں گرما اپنے عروج پر ہو گا۔ عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ایسے حالات میں مسافر اس ملک کے وقت کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کریں جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا اور جن ممالک سے گزر رہے ہوں یا جہاں پہنچا ہو ان کے مقامی اوقات کو نظر انداز کر دیں اور افطار اور نمازوں کے لیے یہی فارمولا اپنائیں۔[1]

(ذ) اگر کبھی ایسی صورتحال ہوئی کہ کوئی مسلمان خلانورد چاند پر اترا تو عملاً نماز کے لیے کعبہ قبلہ رخ ممکن نہ ہو گا اور نہ ہی سورج کی گردش کے مطابق نمازوں کے اوقات کا تعین کیا جا سکے گا۔ اس حوالے سے میری مسلمان فقہاء سے یہ عاجزانہ استدعا ہے کہ وہ چاند پر ایک کعبہ کی ''تعمیر''

1۔ چند سال قبل ایسی ہی صورتحال ہمیں بھی درپیش ہوئی کہ سفر عمرہ کے لیے کراچی سے روانگی تھی۔ افطار میں 15 منٹ باقی تھے کہ طیارے نے اڑان بھر لی۔ خیال تھا کہ ابھی سامان افطار تقسیم کیا جائے گا مگر جب تاخیر ہوئی مسافر بے چین ہونے لگے اور کپتان سے مطالبہ شروع کر دیا کہ افطار کرایا جائے مگر کپتان نے انکار کر دیا اور کہا کہ سورج غروب ہو گا تو افطار کرائیں گے اور پھر دھوپ مسافروں کو بھی نظر آنے لگی چنانچہ روزہ داروں کو مزید دو گھنٹے صبر آزمائی کے مرحلے سے گزرنا پڑا اور جب سورج بالآخر ''غروب'' ہوا تو مسافروں کو افطار کرایا گیا۔ مترجم

کریں، ایک ایسے مقام پر جوارض کعبہ کے عین بالمقابل ہو اور اس وقت جب دن اور رات برابر طوالت کے حامل ہوں (یعنی 21 مارچ، 23 ستمبر) چاند مکمل ہو اور جب ہمارا سیٹلائٹ عین کعبہ کے اوپر جائے یہ مقام چاند کے اس رخ کے مرکز سے جو ہمیں نظر آتا ہے قدرے شمال میں ہوگا اور مجھے یہ گمان ہے کہ یہ جگہ اس مقام پر کہیں قریب ہوگی جسے ''سکون کا سمندر'' کا نام دیا گیا ہے۔ میں ذاتی طور پر اس حل سے اس لیے زیادہ متفق ہوں کہ کعبہ اس دس گز بلند عمارت تک محدود نہیں بلکہ اس سے اوپر فضا اور جنت تک کعبہ ہی ہے۔

بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''ارضی کعبہ کے عین اوپر اللہ تعالیٰ کے عرش کے نیچے فرشتوں کا کعبہ ہے کہ اگر ایک پتھر وہاں سے گرایا جائے تو وہ سیدھا بیت اللہ کی چھت کے اوپر گرے گا۔''

یعنی ارضی کعبہ دراصل اللہ تعالیٰ کے عرش کی طرف کھلنے والی کھڑکی ہے۔ اس فارمولا کے تحت دیگر ستاروں اور سیاروں پر قبلہ رخ کا تعین ممکن ہو جائے گا، اگر انسانوں نے وہاں پہنچ کر بستیاں بسائیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ چاند پر دن اور رات 12، 12 گھنٹہ کی بجائے 14، 14 گھنٹے کے ہیں یعنی وہاں دن رات کا دورانیہ 24 کی بجائے 28 گھنٹے ہے۔ اس طرح مختلف اجرام فلکی پر اوقات مختلف ہیں۔

(ر) مصنوعی سیارہ میں زمین کے گرد چکر 90 منٹ میں مکمل ہوتا ہے اور شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال تک اور مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کی طرف پرواز کے مطابق سورج کے نظر آنے کی کیفیت مختلف ہوگی۔ غروب اور طلوع آفتاب بھی ہر 24 گھنٹے بعد نہیں بلکہ ہر ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہوں گے یا اس سے بھی کم وقت میں اور مسافروں پر زمین کے نظام الاوقات ہی لاگو ہوں گے نہ کہ مصنوعی سیارے کے۔

قطبی خطوں کے لیے نظام الاوقات

(583)

شمالی نصف کرہ ارض		تاریخ	جنوبی نصف کرہ ارض	
وقت طلوع	وقت غروب	تاریخ	وقت طلوع	وقت غروب
7-39	16-28	یکم جنوری	4-17	19-50
7-38	16-31	8 جنوری	4-23	19-49

19-46	4-31	15 جنوری	16-43	7-36
19-43	4-41	22 جنوری	16-52	7-31
19-31	4-52	یکم فروری	17-06	7-22
19-22	5-05	8 فروری	17-16	7-13
19-13	5-16	15 فروری	17-26	7-03
19-10	5-26	22 فروری	17-36	6-52
18-47	5-37	یکم مارچ	17-47	6-39
18-35	5-46	8 مارچ	17-56	6-26
18-22	5-55	15 مارچ	18-06	6-13
18-10	6-04	22 مارچ	18-54	5-04
17-50	6-18	یکم اپریل	18-27	5-42
17-36	6-26	8 اپریل	18-13	5-29
17-26	6-34	15 اپریل	18-45	5-16
17-13	6-44	22 اپریل	18-54	5-04
16-59	6-54	یکم مئی	19-05	4-50
16-49	7-02	8 مئی	19-14	4-40
16-42	7-10	15 مئی	19-22	4-31
16-35	7-18	22 مئی	19-29	4-24
16-28	7-28	یکم جون	19-39	4-17
16-24	7-32	8 جون	19-44	4-14
16-24	7-37	15 جون	19-48	4-12
16-25	7-39	22 جون	19-50	4-13
16-29	7-39	یکم جولائی	19-50	4-17
16-33	7-37	8 جولائی	19-48	4-21
19-39	7-33	15 جولائی	19-44	4-27

4-34	19-38	22 جولائی	7-28	16-45
4-46	19-27	یکم اگست	7-17	16-56
4-53	19-18	8 اگست	7-08	17-03
5-01	19-07	15 اگست	6-58	17-12
5-09	18-56	22 اگست	6-46	17-21
5-21	18-38	یکم ستمبر	6-39	17-31
5-30	18-25	8 ستمبر	6-16	17-40
5-38	18-12	15 ستمبر	6-03	17-49
5-46	17-58	22 ستمبر	5-46	17-58
5-57	17-41	یکم اکتوبر	5-34	18-07
6-06	17-28	8 اکتوبر	5-21	18-16
6-15	17-16	15 اکتوبر	5-06	18-26
6-24	17-04	22 اکتوبر	4-54	18-35
6-38	16-49	یکم نومبر	4-39	18-48
6-48	16-39	8 نومبر	4-30	18-58
6-57	16-32	15 نومبر	4-22	19-07
7-07	16-25	22 نومبر	4-15	19-18
7-18	16-20	یکم دسمبر	4-08	19-28
7-25	16-18	8 دسمبر	4-07	19-37
7-31	16-19	15 دسمبر	4-08	19-43
7-36	16-22	22 دسمبر	4-10	19-47

اس کتاب میں مذکور شخصیات

(584) گزشتہ اوراق میں جن راویان حدیث مصنفین اور محققین کی کاوشوں کے حوالے دیئے گئے ان کے مختصر سوانحی خاکوں کا تذکرہ بھی کیا جائے تو ایک الگ ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اس سلسلے میں عام طور پر ''انسائیکلو پیڈیا آف اسلام'' کا حوالہ دیا جاتا ہے گو کہ اس کے تمام موضوعات بہت سود مند نہیں ہیں۔ ذیل میں دی گئی تاریخیں سن عیسوی کے مطابق ہیں اور جو نہیں ہیں اس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ یہ تمام شخصیات مسلمان ہیں۔

☆ ابوداؤدؒ (السجستانی وفات 888)

اولین معتبر راویان حدیث میں شمار ہوتا ہے۔ ''السنن'' آپ کا مرتب کردہ مجموعہ احادیث ہے۔

☆ ابوحنیفہؒ (وفات 767)

حنفی مکتب فکر کے بانی، دنیا میں 80 فیصد سے زیادہ مسلمان حنفی ہیں۔

☆ ابوعبیدؒ (وفات 838)

معروف محدث، اسلام کے نظام مالیات پر نادر تحقیقی کتاب'' الاموال'' کے مصنف۔

☆ ابویعلیٰ الفرا (وفات 1056)

حنبلی مکتب فکر کے معروف فقیہہ، پولیٹیکل سائنس کے موضوع پر آپ کی کتاب ''الاحکام السلطانیہ'' کو سند کا درجہ حاصل ہے۔

☆ علقمہ النخعی (وفات 681)

عظیم فقیہہ اور جلیل القدر صحابی حضرت ابن مسعودؓ کے شاگرد رشید۔

☆ الاوزاعی (وفات 773)

فقہ کے جلیل القدر عالم جن کے والد کا تعلق سرزمین سندھ (اب پاکستان کا حصہ) سے تھا۔ ایک وقت میں آپ کی فقہ کے ماننے والوں کی بڑی تعداد اسلامی دنیا میں پائی جاتی تھی۔

☆ ابن سینا (وفات 1037)

عظیم ماہر طب اور فلسفی جن کی تصانیف آج بھی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

☆ البلاذری (وفات 892)

نامور مؤرخ اور سوانح نگار "فتوح البلدان" کے مصنف (جس کے انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں تراجم دستیاب ہیں) "انساب الاشراف" بھی آپ کی مشہور تصنیف ہے۔

☆ بیبرس (وفات 1277)

مصر کا حکمران رکن الدین بیبرس جس نے ہلاکو خان کو اس وقت شکست دی جب اس نے بغداد کو تاراج اور خلیفہ معتصم کو قتل کرنے کے بعد مصر پر لشکر کشی کے لیے ادھر کا رخ کیا۔

☆ البیرونی (وفات 1048)

متبحر عالم اور سائنسدان جن کی سائنس، تاریخ اور سماجیات پر لکھی گئی کتابیں آج بھی سند کا درجہ رکھتی ہیں۔

☆ بوسر یا بوزر (وفات 1551)

مسیحیوں میں پروٹسٹنٹ فرقہ کے بانی۔

☆ البخاری (محمد بن اسماعیل البخاری) (وفات 870)

احادیث کے سب سے مستند راوی، مشہور مجموعہ احادیث "الصحیح" کے علاوہ کئی دوسری کتابوں کے مصنف۔

☆ الدمیری (وفات 1405)

نامور ماہر حیوانات، حیات الحیوان کے مصنف

☆ الدارمی (وفات 864)

احادیث کے اولین مستند راویوں میں شمار۔ "السنن" کے مصنف۔

☆ الذہبی (وفات 1352)

معروف مؤرخ اور سوانح نگار

☆ الدھلوی، ولی اللہ احمد (شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) (وفات 1762)

علم حدیث کے نابغہ روزگار عالم، علوم روحانی کے ماہر اور برصغیر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے بانی۔

☆ الدینوری (وفات 895)

علم کا دریا، نامور ترین مسلمان ماہر نباتیات، کئی دوسرے علوم میں بھی آپ کو ملکہ حاصل تھا۔

☆ الفارابی (وفات 1111)

عظیم فلسفی

☆ الغزالی (وفات 950)

تصوف اور دین پر سند کا درجہ رکھنے والے محقق اور عالم۔ اسلامی اصولوں اور تعلیمات کو فلسفہ کے حوالے سے بنی نوع انسان کے لیے سودمند ثابت کرنے میں آپ نے قابل قدر کام کیا۔

☆ حماد (وفات 737)

عظیم فقیہ، امام ابوحنیفہؒ کے استاد

☆ ھمام بن مُنَبِّہ (وفات 719)

اولین راویان حدیث میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ صحابی رسولؐ حضرت ابوہریرہؓ کے شاگرد تھے۔

☆ ابن عبدالحاکم (وفات 871)

عظیم مؤرخ اور محدث فتوح المصر کے مصنف۔

☆ ابن فدلان۔آپ کو 921 میں شاہ بلغار (کازان) کو تبلیغ اسلام کے لیے روس بھیجا گیا۔سفر کے حالات پر آپ کی ڈائری موجود ہے۔

☆ ابن فرناس (وفات 921)

عظیم نابغہ جس نے نہ صرف ایک اڑن کھٹولا تیار کیا بلکہ ایک رصدگاہ بھی تعمیر کی جہاں نہ صرف ستاروں کی گردش بلکہ بارشوں اور بجلی کی پیش گوئی بھی کی جاتی تھی۔ وہ اعلیٰ پائے کا موسیقار بھی تھا۔

☆ ابن الہیثم (وفات 1039)

نامور سائنسدان تھے جن کی بصریات یعنی بینائی، آنکھ کی ساخت وغیرہ کے بارے میں تصانیف قابل قدر مقام رکھتی ہیں۔

☆ ابن الحجر العسقلانی (وفات 1449)

نامور محدث اور سوانح نگار تھے۔

☆ ابن حنبلؒ (احمد بن محمد ابن حنبل) (وفات 855)

حنبلی مکتب فکر کے بانی، امام شافعیؒ کے شاگرد۔آپ کا شمار اولین معتبر ترین راویان حدیث میں ہوتا ہے۔

☆ ابن ہوقل (وفات 977 کے لگ بھگ)

نامور جغرافیہ دان

☆ ابن ہشام (وفات 834)

مورخ اور سیرت نگار، آپ کی لکھی ہوئی سیرت النبیؐ کا ترجمہ انگریزی میں Guillau me نے کیا ہے۔

☆ ابن الکلبی (وفات 819)

مؤرخ قبل از اسلام کے آثار قدیمہ اور تاریخ کے ماہر

☆ ابن خلدون (وفات 1406)

مؤرخ اور ماہر سماجیات جنہوں نے فلسفہ تاریخ کے عنوان سے علم کی ایک نئی شاخ تخلیق کی۔

☆ ابن ماجہ (محمد بن ماجہ) (وفات 886)

آپ کا شمار معتبر ترین راویان حدیث میں ہوتا ہے۔ ("السنن" مجموعہ احادیث کے منصف)

☆ ابن ماجد ۔

15 ویں صدی کا مشہور جہاز ران جو واسکوڈی گاماں کے بیڑے کو افریقہ سے ہندوستان لے کر گیا۔

☆ ابن المقفاء (وفات 756ء)

معروف ملحد عالی دماغ ایڈمنسٹریٹر جس نے کلیلہ و دمنہ اور بہت سی دیگر فارسی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔

☆ ابن النفیس (وفات 1288)

دمشق میں علم طب پڑھاتے تھے۔ اور انہوں نے ابن سینا کی علم الابدان (اناٹومی) کا جو جائزہ لکھا اس میں خون کی گردش کے نظام کو ٹھیک ٹھیک بیان کر دیا۔ اور اس ضمن میں گلین (Galen) اور ابن سینا کے نظریات کو مسترد کر دیا۔

☆ ابن الرشد (وفات 1198)

عظیم فقیہہ، فلسفی اور سائنسدان۔

☆ ابن سعد (وفات 844)

دور اول کے مؤرخ اور سوانح نگار، سوانح کی ضخیم لغات مرتب کر کے زندہ، جاوید ہو گئے۔

☆ ابراہیم النخعی (وفات 713) نامور فقیہہ۔

☆ الادریسی (وفات1164)۔

جن کا مرتب کردہ دنیا کا نقشہ اور دیگر جغرافیائی نقشے اپنے دور کا عجوبہ ہیں۔

☆ العیاض (وفات1149)

معروف محدث اور مؤرخ

☆ جابر بن حیان (776 کے لگ بھگ)

دوراول کے سائنس دان اور فلسفہ دان۔

☆ جعفر الصادق (وفات765)

عظیم فقیہ اور عارف باللہ

☆ الجاحز (وفات868) بحرالعلوم، نابغہ ادب۔

☆ الکندی (900 کے لگ بھگ) سائنسدان اور عظیم فلسفی۔

☆ لوتھر (وفات1546)۔

پروٹسٹنٹ چرچ کے بانی جو عربی زبان سے بہت اچھی طرح آشنا تھے۔

☆ مالک (امام) (وفات794)۔

مالکی مکتب فکر کے بانی "اَلْمَوَطا" (مجموعہ احادیث) کے مصنف۔

☆ معمر ابن رشید (وفات770)

آپ کا شمار دوراول کے محدثین میں ہوتا ہے۔ الجامع کے مصنف۔

☆ المامون (وفات833)

خلیفہ بغداد، سائنس اور علم وادب کا سرپرست

☆ المسعودی (وفات956)۔

مؤرخ، متعدد کتابوں کے مصنف۔

☆ الماوردی (وفات 1058)

مدبر، فقیہہ اور علوم سیاسیات کے ماہر "الاحکام السلطانیہ" جیسی عظیم کتاب کے مصنف جس کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔ (ابو یعلیٰ الفرا نے بھی تو "الاحکام السلطانیہ" لکھی ایک ہی عنوان سے دو افراد نے کتاب لکھی جو ہم عصر بھی تھے۔ ابو یعلیٰ کا یوم وفات 1056 اور الماوردی کا 1058 ہے؟ مترجم)

☆ Melanchthon (وفات 1560)

پروٹسٹنٹ ازم کے بانیوں میں شمار ہوتا ہے۔ جرمن النسل تھے۔

☆ مسکویہ (وفات 1030) مؤرخ اور ماہر سماجیات

☆ مصعب الزبیری (وفات 850)

دور اول کے مؤرخ، نسب قریش کے مصنف۔

☆ مسلمؒ (وفات 875) (مسلم بن الحجاج القشیری)

آپ کا شمار معتبر ترین راویان حدیث میں ہوتا ہے۔ الصحیح کے مصنف۔

☆ النسائی (احمد بن شعیب النسائی) (وفات 915)

آپ کا شمار بھی مستند راویان حدیث میں ہوتا ہے۔ "السنن" (مجموعہ احادیث) کے مصنف (ابوداؤد، ابن ماجہ اور النسائی اور الدارمی چاروں کے مجموعہ ہائے احادیث "السنن" کے نام سے ہی ہیں۔ مترجم)

☆ القزوینی (وفات 1283) مشہور سائنس دان اور مؤرخ۔

☆ رشید الدین خان (وفات 1318)

دنیا کی تاریخ لکھنے والے مشہور مصنف

☆ الرازی (وفات 925) عظیم فلسفی اور نابغہ العصر طبیب

☆ سعید الاندلسی (وفات 1070) نامور ماہر سماجیات اور مؤرخ

☆ صلاح الدین (ایوبی) (وفات 1193)

مصر اور شام کے حاکم جنہوں نے صلیبی جنگوں میں متحدہ یورپ کی جنگی قوت کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ آپ ایک پرہیز گار حکمران تھے۔

☆ السرخسی (وفات 1090)

نامور فقیہہ، آپ کی مشہور کتاب المبسوط 30 جلدوں پر مشتمل ہے۔

☆ الشافعی (وفات 820)

شافعی مسلک کے بانی، آپ کی مشہور تصانیف الام اور الرسالہ ہیں۔ الرسالہ کا انگریزی میں ترجمہ ہو چکا ہے اور علم قانون پر یہ دنیا کی پہلی کتاب ہے۔

☆ الطبری (محمد بن جریر الطبری) (وفات 923)

بحر العلوم کے شناور، قرآن کی تفسیر، تاریخ اور قانون پر آپ کی تصانیف تبحر علمی کی معراج کا درجہ رکھتی ہیں۔

☆ تاج الشریعۃ/عمر ابن صدر الشریعہ الاول

انہوں نے 1295 میں اپنی کتاب نہایہ حاشیۃ الہدایہ تالیف کی جو آج بھی حنفیہ کے مدارس میں مسلم لاء کے تدریسی نصاب کا حصہ ہے۔

☆ الترمذی (محمد بن عیسیٰ الترمذی) (وفات 888)

آپ کا شمار بھی اولین راویان حدیث میں ہوتا ہے۔ الجامع کے مصنف۔

☆ عمرؓ (ابن الخطاب) (وفات 644)

صحابی رسولؐ خلیفہ ثانی، عظیم فاتح اور انتہائی پرہیز گار اور عادل حکمران۔

☆ عمرؒ ثانی (بن عبد العزیز) (وفات 720)

انتہائی متقی حکمران، اموی خلیفہ تھے۔

☆ عمر الخیام (وفات 1131)

متبحر عالم، ہیئت دان اور نابغہ عصر

☆ زید بن علی (وفات 738)

زیدی مسلک کے بانی، جن کی قانون، قرآن اور حدیث پر قابل قدر تصانیف آج بھی موجود ہیں۔

☆ زبیر بن بکر۔

مصعب الزبیری کے بھتیجے تھے، سلسلہ نسب کے بارے میں آپ کی کتب اعلیٰ مقام رکھتی ہے۔

انڈکس

نوٹ: حوالہ نمبر صفحات نہیں بلکہ پیراگراف کا دیا گیا ہے۔

(الف)

(ب)

(پ)

(ت)

(ٹ)

(ث)

(ج)

(چ۔ چھ)

(ح)

(خ)

(د)

(ڈ)

(ذ)

(ر)

(س)

(ش)

(ص)

(ض)

(ط)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(م)

(ن)

(و)

(ہ)

(ی)

ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ

اسلام کیا ہے؟	مترجم: سیّد خالد جاوید مشہدی
خطبات بہاولپور	مصنف: ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ
محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (سیرت پاک)	مترجم: پروفیسر خالد پرویز
پیغمبر اسلام	مترجم: پروفیسر خالد پرویز
دنیا کا قدیم ترین مجموعۂ حدیث (صحیفہ ہمام بن منبہ عن ابی ہریرۃؓ)	تحقیق: ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمرانی و جانشینی	مترجم: پروفیسر خالد پرویز
نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (اول)	گردآوردہ: محمد عالم مختار حق
نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (دوم)	گردآوردہ: محمد عالم مختار حق
نگارشات ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (سوم)	گردآوردہ: محمد عالم مختار حق
ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ کی بہترین تحریریں	مرتب: سید قاسم محمود

محقق، مفکر اور داعی اسلام

ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

1908ء — 2002ء

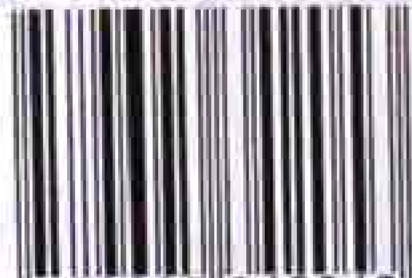
فرانسیسی زبان میں قرآن کریم کا ترجمہ کیا، تفسیر اور سیرت النبیؐ بھی لکھی۔
جن کے سبب فرانس میں ہزاروں لوگ مسلمان ہوئے اور درجنوں مساجد بنیں۔
1930ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے فقہ میں ایم۔اے اور ایل ایل بی کیا۔
1933ء میں بون یونیورسٹی جرمنی سے اسلام کے بین الاقوامی قانون میں ایم۔فل کیا۔
1934ء سوربون یونیورسٹی پیرس سے "عہد نبوی کی ڈپلومیسی" میں ڈاکٹریٹ کیا۔
سقوط حیدرآباد کے بعد 1948ء میں پیرس میں رہائش اختیار کر لی۔
8 زبانوں اردو، انگریزی، فارسی، عربی، فرانسیسی، جرمنی، ترکی اور اطالوی پر عبور حاصل تھا۔
سے زائد کتابیں لکھیں، 921 مقالات شائع ہوئے۔

اسلام کیا ہے؟

- ☆ اسلام کے نقطۂ آغاز سے لیکر بین الاقوامی نظام بننے تک کی مرحلہ وار تفصیل۔
- ☆ مسلم قومیت کا آغاز و ارتقاء اور علوم و فنون میں ترقی کا مستند احوال۔
- ☆ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں اسلام کی ممتاز تعلیمات کا سیر حاصل تعارف۔
- ☆ قرآن کریم، احادیث نبوی اور سیرت نبوی کی تاریخ، اہمیت اور تدوین۔
- ☆ سائنس و ٹیکنالوجی کے اس دور میں غیر مسلم اقوام کو دین اسلام کی دعوت دینے کی حکمت اور نومسلموں کیلئے اسلامی احکام و اعمال کا جامع نصاب۔

اسلام-تحقیق

ISBN 978-969-534-204-6





بیکن بُکس

- غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور فون 042-37320030
- گلگشت کالونی ملتان فون 061-6520790-6520791

Info@beaconbooks.com.pk
web: www.beaconbooks.com.pk